ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ!

نوائے درویش

اصلاحی خطبات

حضرت مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ
(مسترشد حضرت سید سلیمان ندویؒ)
(خلیفہ حضرت شاہ عبدالعزیز دعاجوؒ، حضرت مولانا فقیر محمدؒ)

ناشر: ادارہ اشرفیہ عزیزیہ پشاور

نام کتاب: **نوائے درویش**

تعدادِ اشاعت: ۱۱۰۰

سن اشاعت: ۱۴۲۷ھ بمطابق 2006ء

ناشر: ادارہ اشرفیہ عزیزیہ پشاور

زرتعاون:

ملنے کا پتہ: ۱) مکان نمبر: **P-12** یونیورسٹی کیمپس، پشاور

۲) مکتبہ فاروقیہ، ہزارہ روڈ حسن ابدال

ای میل: saqipak99@gmail.com

physiologist72@yahoo.com

ابتدائیہ

طرب آشنائے خروش ہوتو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا جو چھپا ہوا ہے سکوتِ پردۂ ساز میں

بندہ کے شیخ و مربّی کے اصلاحی بیانات ''نوائے درویش'' کے نام سے آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ آخری دو بیانات حضرت حاجی شیرحسن صاحب کی بیاض سے لئے گئے ہیں۔ اس بیاض میں حاجی شیرحسن صاحب نے حضرت کے بیانات دورانِ بیان لکھے ہیں۔ کچھ بیانات کیسٹوں سے لیے گئے ہیں جنہیں بہت زیادہ محنت کر کے ثاقب علی خان صاحب نے کیسٹوں سے سن کر لکھا ہے۔ بندہ چونکہ غیر معروف آدمی ہے، اس لئے تقریظ حضرت مفتی حمیداللہ جان صاحب صدر مفتی و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ سے لکھوائی، حضرت موصوف سلسلۂ نقشبندیہ کے کامل شیخ ہیں۔ اب حضرت مولانا اشرف صاحبؒ کی برکات اور مفتی صاحب کی توجہات یکجا کتاب کی ہم نوا ہوگئی ہیں۔ امید ہے پڑھنے والوں کو بہت فائدہ ہوگا۔

ڈاکٹر فدا محمد

(خلیفۂ ارشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ)

خیبر میڈیکل کالج پشاور

تقریظ جناب مفتی حمید اللہ جان مدظلہ، صدر مفتی و شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

ترجمہ: میرے دل میں ایسا درد ہے کہ اگر اسے بیان کروں تو زبان جلتی ہے، اور اگر سانس کھینچ لوں اور باہر نہ نکالوں تو ڈرتا ہوں کہ میری ہڈیوں کا گودہ جل جائے گا۔

اسلام کے خلاف جو کیپٹل ازم اور اشتراکیت کے عنوان سے زہریلے جراثیم پھیلائے جارہے ہیں اور اس کے لیے جو خطرناک اور پراسرار طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان سے مسلمان صرف غافل ہی نہیں بلکہ خود انہی کو استعمال کیا جارہا ہے، جو نہایت افسوسناک صورتحال ہے۔ اور اکثر مسلمانوں کو تو کوئی احساس تک بھی نہیں، اپنے عیش و عشرت کے حصول میں دن رات فکرمند اور سرگرداں ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس سلسلہ میں مشہور روحانی راہنما حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر کا مجموعہ ظاہری و باطنی امراض کے معالج جناب محترم ڈاکٹر فدا محمد صاحب نے حسین انداز میں ''نوائے درویش'' کے نام سے مرتب کر کے ایک اہم فریضہ ادا کر دیا ہے، جس کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ کے لیے اکسیر ہے۔ جدید انداز میں یہ کتاب اس سلسلہ میں تفہیم کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ اللہ کریم اسکو قبولیت عطا فرما کر امت مسلمہ کی مذکورہ خطرناک سازشوں سے نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

حمید اللہ عفی عنہ

خادم الحدیث والافتاء، جامعہ اشرفیہ لاہور۔

فہرست

نمبر شمار	بیان کا عنوان	صفحہ نمبر
(۱)	رحمۃ اللعالمین	۷
(۲)	اسلام اور سوشلزم	۳۱
(۳)	قومی تعمیر نو میں مذہب کی اہمیت	٦۲
(۴)	عبدیت کی جامعیت	۷۹
(۵)	اللہ کی رضا کا حصول اور عبدیت	۱۰۴
(٦)	اسباب اور توکل	۱۴۵
(۷)	اللہ کی معرفت اور عبدیت	۱۵۹
(۸)	یومِ نزولِ قرآن	۱۹۲
(۹)	مشیخت و ارادت	۲۱٦
(۱۰)	حج بیت اللہ شریف	۲۳۵
(۱۱)	اسلام کا نظریۂ تعلیم	۲۷۱
(۱۲)	اصلاحِ نفس	۳۰۲
(۱۳)	ہر پریشانی کا علاج	۳۰۸

رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم)

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ:

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اس عالم میں تشریف لائے نہ صرف اسی وقت سے بلکہ جس وقت کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانیت بلکہ کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایااس وقت بھی نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتہ اللعالمینی شان کا ظہور پوری کائنات میں مختلف رُخوں اور مختلف صورتوں سے ہوا۔ کائنات کا ہر ذرّہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رحمت کا ظہور ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہونے کی وجہ سے پوری کائنات ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی ، یہ زمین و آسمان نہ ہوتے ، یہ سورج ستارے نہ ہوتے ، انبیاء علیھم السلام کا وجود نہ ہوتا ، فرشتوں کا وجود نہ ہوتا اور جنت و دوزخ قائم نہ ہوتے۔ جو کچھ بھی بنا، جو کچھ بھی ہوا، جو کچھ بھی ہورہا ہے اور جو کچھ بھی ہوگا وہ سب کا سب حضور انور سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ گرامی کی برکت سے ہے۔ اس نوعیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کائنات کے وجود کا، کائنات کی آفرینش کا، کائنات کی پیدائش کا سبب ہے۔ اور یہ پوری کی پوری کائنات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث وجودِ کائنات ہونا اس عالم کے لیے اور تمام عالموں کے لیے رحمت کا سبب ہے۔ گویا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی رحمت کا جو اوّل ظہور ہوا وہ اس صورت سے ہوا کہ اللہ تبارک و

تعالیٰ نے اِرادہ فرمایا کہ کائنات کو وجود بخشے۔ روایات میں آتا ہے، طبرانی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، حدیث قدسی ہے:

لَوْ لَاهُ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک

ترجمہ: ''اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہ کیا جاتا۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مقصود نہ ہوتی تو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان وزمین کو اوراس کائنات کے خاکے کو قائم نہ فرماتے۔ گویا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو اللہ تعالیٰ نے سبب قرار دیا اس عالم کے وجود کا، اس عالم کی پیدائش کا اور تمام کائنات کے قائم ہونے کا۔ جب اِرادۂ ہستی ہوا کہ کائنات کو وجود بخشے، اس اِرادے کا سبب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، اس معنی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سبب آفرینش کائنات ہیں اور یہ آپ ﷺ کی رحمت کا پہلا ظہور ہے۔ اس کے بعد ہم یہ کہیں گے اور عرض کریں گے کہ ہمارے نزدیک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس وجہ سے بھی کائنات کے وجود کا سبب ہیں کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے، سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کو رکھنے والے اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والے ہیں۔

جس وقت حضرت آدم علیہ السّلام مٹی اور پانی کے درمیان میں تھے یعنی اُن کا کیچڑ بنا نہیں تھا اُس وقت اللہ ربّ العزت نے طے کر دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہوں گے۔ اب آپ ﷺ کی ختم نبوت حقیقت کے لحاظ سے آپ ﷺ کی رحمت اللعالمینی شان ہی کا دوسرا ظہور ہے۔ جو رحمت اللعالمین ہوگا وہ حقیقت میں

خاتم النبیین بھی ہوگا کیونکہ رحمت اللعالمین کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہو، تمام عالموں کے لیے رحمت ہو، ہر ملک اور ہر قوم کے لیے رحمت ہو، اِس عالم کے لیے، قبر کی زندگی کے لیے، برزخ کے لیے، حشر کے لیے اور ابد لآ باد تک کے لیے وہ رحمت ہو۔ اگر آپ ﷺ خاتم النبیین نہ ہوتے تو آپؐ کی رحمت ایک خاص زمانے کے ساتھ متعلق ہو کر رہ جاتی، آپ ﷺ کی رحمت صرف اُس زمانے کے لیے ہوتی اور اُن لوگوں کے لیے ہوتی جن لوگوں کے لیے آپؐ نبی بنا کر بھیجے جاتے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے یہ چاہا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ رحمۃ اللعالمین کو خاتم النبیین بنائے۔ خاتم النبیین بنانے کا مدعا یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورۂ نبوت اَبد تک باقی رہے، اور آپ ﷺ کا زمانۂ نبوت کسی خاص رُخ کے ساتھ متعلق نہ ہو۔ جیسے پہلے انبیاءِ کرام خاص خاص زمانے اور خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے، حضرت آدم علیہ السّلام ایک خاص وقت کے لیے آئے، حضرت نوح علیہ السّلام ایک خاص وقت کے لیے آئے، اسی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جمیع انبیاء علیہم السّلام سب کے سب خاص اوقات کے لیے آئے۔ لیکن ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو ہمیشہ کے لیے آئے، آپ ﷺ کا آنا آنے ہی کے لیے تھا، آپ ﷺ کا آنا جانے کے لیے نہیں تھا، آپؐ کی آمد دائمی ہے، باقی ہے۔ آپ ﷺ خاتم الرسل ہیں، ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے دنیا سے پردہ فرما لینے کے بعد بھی آپؐ کے انوارات، آپؐ کی تجلیات، آپ ﷺ کے احکام، آپ ﷺ کی سنتیں، اور آپؐ والے طریقے اور آپ ﷺ والا دورِ نبوت ختم نہیں ہو

گا، قیامت تک بھی ختم نہیں ہوگا۔ جس زمانے میں آج ہم چل رہے ہیں یہ وہ زمانہ نہیں جس میں کوئی نبی نہ ہو، یہ زمانہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورۂ نبوت ہے۔ اس وقت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چل رہی ہے، آپ ﷺ کی نبوت کا سکہ اس وقت بھی قائم ہے، آپ ﷺ ہی کے لائے ہوئے احکام کا رواج اس وقت بھی ہے۔ خدا کے نزدیک نجات کا دارو مدار، کامیابی کا طریقہ اور فلاح پانے کا راستہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے میں ہے۔ آپ ﷺ ہی کے واسطے سے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے، آپؐ ہی کے واسطے سے خدا کو لیا جا سکتا ہے، آپؐ ہی کے ذریعے سے خدا کی رحمت متوجہ ہوسکتی ہے، آپؐ ہی کے ذریعے سے باطن بن سکتے ہیں، آپ ﷺ ہی کے ذریعے سے ظاہر بن سکتے ہیں اور آپؐ ہی کے ذریعے سے کُل عالم کے لیے خیروں کے فیصلے ہو سکتے ہیں۔ نبوت کی جتنی بھی خیریں ہیں اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ عالیہ میں منحصر کر دی گئی اور جوڑ دی گئی ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے بغیر، آپ ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر نہ خیر مل سکتی ہے، نہ جنت مل سکتی ہے، نہ خدا کا تعلق مل سکتا ہے، نہ خدا کی محبت مل سکتی ہے بلکہ میں آگے بڑھ کر یوں کہوں گا کہ جو طریقۂ محمدیہ سے نکلا اور جس نے حضور ﷺ کے طریقے کو چھوڑا اور جس نے دائرۂ نبوتِ محمدیہ سے نکلنے کی کوشش کی وہ خدا کے نزدیک مردُود، اس کی پوری کائنات کے نزدیک مردُود، ہمیشہ کے لیے ملعون اور ہمیشہ کے لیے اللہ کے راستے سے بھٹک کر رہ گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے جو نجات کا راستہ ہے، جو کامیابی کا راستہ ہے، جو خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ پس میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ نہیں ہے کہ خاتم النبیین کے آنے سے نبوت کے اوصاف ختم

ہو گئے بلکہ نبی پاک سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اللہ کی طرف سے رحمتوں کے کمال کے آنے کا ذریعہ تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں کو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے انعامات کو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی برکات کو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی خیروں کو انتہائے کمال کے ساتھ لے کر آئی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانیت کو وہ دیا جو کبھی نہیں دیا گیا تھا، جو نہ ملا نہ مل سکتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ لے کر آئی جو کوئی بھی لے کر نہیں آیا۔ جتنے انبیاء کرام اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو، اللہ تعالیٰ کی خیروں کو لے کر آئے تھے، میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اکیلی ذات میں ان تمام کمالات کو ان تمام خوبیوں کو، ان تمام رحمتوں کو اور ان تمام خیروں کو لے کر آئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر لائے۔ فرمایا جو کچھ پہلے انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں وہ سب کچھ مجھے دیا گیا بلکہ اس سے زیادہ مزید عطاء فرمایا گیا۔ ایک روایت میں آتا ہے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء بھیجے اور جتنے بھی رسول آئے ان سب کو اللہ کی طرف سے کچھ نشانیاں اور معجزات دیئے گئے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا یعنی قرآن کریم وہ دائمی ہے، اس کی برکات دائمی ہیں، اس کی خیر دائمی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس دائمی معجزے کی برکت سے میری اُمت کو تمام اُمتوں سے زیادہ کرے گا۔ قرآن کریم اپنی ھدایت کے لحاظ سے دائمی ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ختمِ نبوت کے لحاظ سے دائمی ہیں۔ بلکہ ہم یوں کہیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ مقدس قرآن کریم کے نزول کا ذریعہ وسبب

ہے۔ ہر ایک کا کلیجہ نہیں تھا کہ وہ قرآن کے نزول کو سنبھال لیتا، یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ پاک تھا جس پر قرآن کریم جیسی کتاب اُتری اور اس صورت پر اُتری کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنبھالا، اسے اپنایا، اور اسے اس صورت سے لیا کہ قرآن کریم کے ایک ایک جز کو، اس کے ایک ایک حرف اور شوشے کو اپنے اندر سمیٹا، اپنے اندر سمویا۔ قرآن کریم کا ایک ایک ذرّہ نور بن کر، ھدایت والے احکام بن کر، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے پورے طور پر وجود میں آیا۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو ہم دیکھیں تو جس طور پر قرآن میں ہم الفاظ کو دیکھیں گے، قرآن کے الفاظ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہم اعمال کے طور پر دیکھیں گے۔ قرآن میں الفاظ ملیں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں وہی قرآن مجسم ہو کر عمل کی صورت میں ظہور میں آئے گا۔ اگر قرآن کریم اپنے انوارات کے لحاظ سے، اپنی شفا و برکت کے لحاظ سے، اس کی ایک ایک آیت، اس کا ایک ایک حرف اور شوشہ برکت ہے تو ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے عمل کا ایک ایک حصہ ایک ایک جز اور ایک ایک کُل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برکت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خیر ہے۔ جیسے قرآن لکھا ہوا قرآن ہے اسی طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قرآنِ ناطق ہے اور بولنے والا قرآن ہے۔ آپ ﷺ کا دیکھنا قرآن، آپ ﷺ کے ہاتھ کا عمل قرآن، آپ ﷺ کی زبان کا عمل قرآن غرضیکہ آپ ﷺ کے جسم کا ایک ایک عمل قرآن ہے۔ سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا گیا کہ

حضور ﷺ کا خُلق کیا تھا؟ جواب دیا **کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ** (مسند احمد) آپ ﷺ کا خلق سراپا قرآن تھا۔ قرآن جو کہ اپنے انوارات میں، اپنی تجلیات میں اور اپنی برکات میں اس کیفیت کا حامل ہے کہ قرآن خود کہتا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ O (الحشر:۲۱)

ترجمہ: ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دَب جاتا اور پھٹ جاتا۔''

اگر یہ قرآن پہاڑوں پر اُترتا تو وہ ذرّہ ذرّہ ہو جاتے، وہ پارہ پارہ ہو جاتے۔ یہ سینۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھا جس میں اتنی قوت تھی، جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنایا ہی اس لیے تھا، جسے تشکیل ہی اس لیے دیا گیا تھا، وجود ہی اس لیے بخشا گیا تھا کہ قرآنِ کریم کے پورے کے پورے انوارات کو اور اس کی تجلیات کو اپنے اندر لے لے، اور سینے کے اندر لینے کے بعد یہ نوعیت نہ ہو کہ یہ نور صرف سینۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں رہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بلاتشبیہ میں یوں عرض کروں کہ جیسے یوں کہیے کہ ایک کارخانہ ہو، کارخانے میں سونے کے برتن بنتے ہیں اور اس سونے کے برتنوں کے کارخانے میں سونا کسی ایک بڑے برتن میں ڈالا جائے اور سونا وہاں پگھلے اور پگھل کر مختلف سانچوں میں آگے بڑھتا چلا جائے، مختلف لائنوں سے، نالیوں کے ذریعے سے ہر نالی میں پہنچ کر ایک خاص سانچے میں پہنچے اور اس سانچے سے نکلتے ہوئے ایک خاص شکل کا برتن بنتا چلا جائے، اسی طور پر قرآن کے انوارات اور قرآن کی حقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں پگھلے ہوئے سونے

کی طرح اُتری اور وہ نورِ ھدایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں پہنچا، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کا عمل قرآن کا حکم ہے، وہ قرآنِ مجسم ہے، وہ قرآن حقیقی ہے، جو نبی کی آنکھ نے دیکھا وہ قرآن ہے، جو نبیؐ کی زبان نے کہا وہ قرآن ہے، جو نبیؐ کے ہاتھ نے کیا وہ عملِ قرآنی ہے، جو قدم نبیؐ نے اُٹھائے وہ قرآن ہی کی حقیقت ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے جس حصے سے جو بھی عمل وجود میں آیا ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ وہ نرا قرآن ہے، وہ عین قرآن ہے، وہ حقیقتِ قرآن ہے، وہ قرآن مجسد اور قرآن مجسم ہے۔خداوندِ قدوس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان اعمال کو وجود میں لاکر پورے عالم کے لیے خاکہ دے دیا کہ دیکھو! قرآن کے پڑھنے والو، قرآن کے سننے والو، میرے قرآن کو اگر عملی صورت میں دیکھنا چاہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دیکھو۔اگر قرآن کو لینا چاہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو چھوڑ کر قرآن نہیں ملے گا، قرآن ملے گا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔جس طور پر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہمیں قرآن کے الفاظ دیے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں قرآن کا عمل دیا۔اب اگر کوئی قرآن پر عمل کرنا چاہے، خدا سے لینا چاہے اور خدا تک پہنچنا چاہے تو جیسے اس کے لیے **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه** لازمی ہے اسی طور سے اس کے لیے **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه** لازمی ہے۔قرآن کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات لازم وملزوم ہے۔اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کو ہم نے شفاء و رحمت بنا کے نازل کیا، یہ شفاء، یہ رحمت اور یہ ھدایت قرآن کی اپنی ذات میں ہے لیکن اس کی حقیقت اور اس کا وجود، اس کی تشکیل اور اس کا مُشکّل ہونا صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ

گرامی سے تھا۔ اب اگر کوئی رحمتِ الٰہیہ کو لینا چاہے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دَر تک پہنچے اور آپ ﷺ کے در تک پہنچنے کا مدعا یہ ہے کہ جیسے کسی نے کہا ؎

وہی سمجھا جائے گا شیدا جمالِ مصطفیٰ

قال قالِ مصطفیٰ ہو، حال حالِ مصطفیٰ

دِل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل کی مشابہت لینی ہوگی اور جسم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال سے رنگین کرنا ہوگا۔ جب تک دِل محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے خاکے پر نہیں آتا خدا کا وہی یقین جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں تھا، خدا کی وہی محبت جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں تھی، خدا کی وہی خشیت جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں تھی، خدا کا وہی ڈر، خدا کا وہی خوف، خدا کی وہی لگن جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کا نور تھا، وہی لوگوں کے لیے کڑھنا، وہی لوگوں کے لیے غم کھانا اور مخلوق پہ ترس کھانا جس سینے میں نہیں آتا اس نے سینۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نہیں لیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اس عالم میں بلکہ میں کہوں گا کہ تمام جہانوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا سب سے بڑا خزینہ اور خزانہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کو خزانہ بنایا ہے، خزینہ بنایا ہے۔ ھدایت کا خزانہ ہے، نور کا خزانہ ہے، برکات کا خزانہ ہے، رحمت کا خزانہ ہے اور خدا نے اپنی بہشت کی تقسیم کا خزانہ بنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِىْ (بخاری)

ترجمہ: ’’میں تقسیم کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں۔‘‘

یعنی خداوندِ قدوس نے ھدایت کی تقسیم کا ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بنایا، رحمۃ اللعالمینی کی رحمتوں کے نزول کا ذریعہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بنایا اور اسی طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ سے برکات کے لینے کا ذریعہ عملاً سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بنایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس عالم کو اسباب کا عالم بنایا ہے، جس طور پر کہ بادل آتے ہیں اور بادل آنے کے بعد ان سے بارش کے قطرے گرتے ہیں اور اُجڑی ہوئی بستیاں اور زمینیں آباد ہو جاتی ہیں، اسی طور پر نبی کا سینہ ھدایت کا بادل ہوتا ہے، وہ نور کا بادل ہوتا ہے، وہ رحمتوں کا بادل ہوتا ہے، وہ برکتوں کا بادل ہوتا ہے جو ہر وقت چھایا رہتا ہے اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے ہیں تو اس سے ھدایت کی موسلا دھار بارش اُن قلوب پر ہوتی ہے جنھیں اللہ تبارک وتعالیٰ ھدایت دینا چاہتے ہیں۔ جسے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمتوں سے نوازنا چاہتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے اُس کے تعلق کو قائم کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات سے اسے مالا مال کر دیتے ہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ اقدس اللہ تبارک وتعالیٰ کی ھدایتوں کا ایک خزینہ ہے، ایک نور کا مرقع ہے اور ایک ھدایت کی کنجی ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ اپنے اندر مؤمن کی صفات پیدا کی جائیں تا کہ نبی ﷺ کی رحمتوں کو اور نبی ﷺ کے فیض کو حاصل کیا جا سکے۔

دوستو! نبی جو آتا ہے وہ صرف اپنے لیے نہیں آتا، وہ نبی کیا جو اپنے لیے آئے۔ نبی تو ہوتا ہی خدا کا ہے، وہ تو ہوتا ہی بھرپور ہے، وہ تو سر سے لے کر پاؤں تک، ظاہر سے لیکر باطن تک رحمت ہی رحمت، نور ہی نور، ھدایت ہی ھدایت،

برکت ہی برکت ہوتا ہے ،لیکن وہ صرف اپنے لیے برکت نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے برکت ہوتا ہے، وہ صرف اپنے لیے نور نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت کے لیے نور ہوتا ہے، وہ صرف اپنے لیے خیر نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت اور پوری مخلوق کے لیے خیر ہوتا ہے۔اب خیر ہونے کی مختلف صورتیں ہیں۔دیکھیں میں عرض کررہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں آپ ﷺ کا وجودِ اقدس اس پورے عالم کے لیے رحمت ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط (الانفال:۳۳)

ترجمہ: ''اللہ تبارک وتعالیٰ انسانوں کو عذاب نہیں دے گا جب تک کہ آپ ﷺ اُن کے درمیان ہوں گے۔''

ہمارے نزدیک حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ پاک کا اس عالم میں آنا اس عالم کی بقا کا ذریعہ ہے۔زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر لگا ہوا ہے عرش وکرسی سے زیادہ افضل ہے۔کیونکہ عرش وکرسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ لامکانی ہیں، وہ مکان کے ساتھ جڑ نہیں جاتے۔خدا کے بعد سب سے اونچی ذات اگر کوئی ہے تو موٹی سی بات ہے۔

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ ﷺ کی ثناء کون کرسکتا ہے۔مختصر سی بات یہ ہے کہ خدا کے بعد سب سے اونچی ذات آپ ﷺ کی ہے۔بقول شخصے

ع کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

خدا کے بعد سب سے اُونچی ذات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔جب

حضرت محمد صلی اللہ کی ذات سب سے اُونچی ذات ہے تو آپ ﷺ کا جسدِ پاک سب سے اُونچا جسد ہے۔ مکان کی قیمت مکین سے ہوا کرتی ہے لہٰذا زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ آپ ﷺ کا جسدِ اطہر لگا ہوا ہے وہ عرش وکرسی سے زیادہ قیمتی ہے اوراس عالم کی بقا کا ذریعہ ہے۔ جس طور پر اس عالم کی ظاہری بقا کا ذریعہ جسد مطہرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اُسی طور پر اس عالم کی روحانی بقا کا ذریعہ وہ اعمال ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کی روحِ پاک سے وجود پایا۔ آپ ﷺ کے اعمال سے اس عالم کی روحانی بقا ہے، جس وقت تک اس عالم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے نکلے ہوئے اعمال وجود میں ہوں گے، یہ عالم امن وچین میں رہے گا، خیر میں رہے گا اور جس قدر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اس عالم سے مٹتے جائیں گے اس عالم کو توڑا جائے گا، یہاں تک کہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی سے نکلنے والا ایک عمل بھی باقی نہیں رہے گا تو اس عالم کو توڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ نے:

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰی اَحَدٍ یَقُوْلُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ (مسلم)

ترجمہ: قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک روئے زمین پر اللہ اللہ کہنا موقوف نہ ہو جائے۔

جب تک اللہ اللہ کہنے والا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت والا ایک شخص بھی باقی ہے یہ دُنیا باقی رہے گی۔ یہ زمین وآسمان ویسے ہی قائم نہیں کیے گئے تھے، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے لیے قائم کیے گئے تھے، یہ انبیاء علیہم السلام کے طریقوں کے لیے قائم کیے گئے تھے، جب انبیاء کے طریقے نہیں ہوں گے سورج توڑ

دیا جائے گا، چاند کا نور ختم کر دیا جائے گا، آسمان کو توڑ دیا جائے گا، زمین کو شق کر دیا جائے گا، کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اعمالِ محمدیہ کو اپنی رحمت کا سبب قرار دیا۔ میں یوں کہوں گا کہ استفادۂ نبوت کا ذریعہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے نور کو لینے کا ذریعہ، آپ ﷺ کی برکات کے لینے کا ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہیں۔ جس قدر اعمالِ محمدیہ تم میں آئیں گے اس قدر تمہارے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے انوارات آئیں گے، آپ ﷺ والی برکتیں آئیں گی اور آپ ﷺ والی نسبت آئے گی۔ جتنے بھی آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوتے جائیں گے خدا کے قریب ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ آپ ﷺ سید المحبوبین ہیں اور آپ ﷺ کا ہر عمل محبوبیت کے رنگ کو لیے ہوئے ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

قہر ہو یا مہر ہو یا کچھ بھی ہو　　　ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

؎ تو ہمہ خوبی و محبوبی و سراپائے جمال　　　کونسی تیری ادا دل کی طلبگار نہیں

آپ ﷺ کی ہر ادا دِل کی طلبگار، ہر ادا محبوبیت ربّ کو کھینچنے والی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر عمل پر خدا کی رحمت اس طور پر کھنچ کر آتی ہے جیسے کہ لوہے کا ایک ذرّہ مقناطیس کے ٹکڑے کی طرف کھنچ کر آتا ہے بلکہ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اللہ کی رحمت، اللہ کی قربت اور اللہ کی محبت اُن لوگوں کی طرف آتی ہے جن کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہوتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ ﷺ سے نکلنے والے اعمال جس کی ذات میں ہوں گے اس کی طرف اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی اور وہ اللہ کا محبوب ہو جائے گا۔ آپ ﷺ صرف سید المحبوبین نہیں

ہیں بلکہ آپ ﷺ سید المحبوبین بھی ہیں اور آپ ﷺ محبوب گر بھی ہیں۔ جس کی ذات میں آپ ﷺ والا عمل آیا وہ اللہ کا محبوب بن گیا۔ قرآن خود کہتا ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (ال عمران:۳۱)

ترجمہ: ’’آپ ﷺ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم میرا اِتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔‘‘

اے ایمان والو! اے خدا کا نام لینے والو! اے خدا کی محبت کا دعویٰ کرنے والو! اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تمھیں خدا سے محبت ہے تو سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو اپنا لو، اُن کا اتباع اختیار کرو تو اللہ تمھیں بھی اپنا محبوب بنا لے گا۔ اب محبوبیت رب کا آسان نسخہ، آسان طریقہ یہ ہے کہ دِل میں ان اعمال کو لے لو جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہیں اور جسم میں اُن اعمال کو لے لو جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک تم میں وہی جھلک دکھائی دے کہ دیکھنے والے کہہ دیں کہ یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہے، یہ تو وہ ہے جس کی نگاہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کو پا چکی، یہ تو وہ ہے جس کے عمل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض کو پا چکے، یہ تو وہ ہے جو اس دُنیا میں رہتے ہوئے فرشتوں سے اُونچا ہے، یہ تو اس دنیا میں رہتے ہوئے خدا کا محبوب ہے کیونکہ اس میں سید المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی جھلک پائی جاتی ہے، یہ اپنی نفس چاہی زندگی نہیں گزارتا، یہ یہود و نصاریٰ کی زندگی نہیں گزارتا بلکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی گزارتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سب سے پیارے نبی، اللہ کی سب سے بڑی رحمت، اللہ کی سب سے بڑی خیر ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال جسم میں جس

قدر آئیں گے وہ خدا کی محبوبیت کو اسی قدر لینے والا ہوگا۔ تو دوستو! اُسوۂ کاملۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیں سب سے بڑی دعوت یہ ہے کہ ہم صرف زبان سے یوں نہ کہیں کہ آپ ﷺ سب سے اُونچے، سب سے پیارے ہیں کیونکہ ہم مانیں یا نہ مانیں، ہم آپ ﷺ کی تعریف کریں یا نہ کریں، حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری تعریفوں سے بالا ہیں۔ ہم کیا آپ ﷺ کی تعریف کریں گے، خدا خود آپ ﷺ کی تعریف کرنے والا ہے، خدا آپ ﷺ کا خود ثناء خوان ہے، خدا ہی آپ ﷺ کو پہچانتا ہے۔ ایک مشہور بات ہے کہ ولی را ولی می شناسد (ولی اللہ کو دوسرا ولی اللہ ہی پہچانتا ہے)۔ ہمارے ایک بزرگ کہنے لگے کہ اگر یہ بات ہے کہ ولی را ولی می شناسد، تو اسی طرح ہم یوں کہیں گے نبی را نبی می شناسد اور خاتم الانبیاء را خدا می شناسد۔ نبی کو نبی پہچانے گا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کما حقہ خدا ہی پہچانے گا۔ خداوندِ قدوس کہیں قرآن کریم میں:

وَ رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ O

ترجمہ: ''اور ہم نے آپؐ کی خاطر آپؐ کا آوازہ بلند کیا''

کے لفظوں سے یاد فرما رہے ہیں اور کہیں وہ کہہ رہے ہیں:

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ O

ترجمہ: ''بیشک ہم نے آپ ﷺ کو کوثر (ہر خیرِ کثیر) عطاء فرمائی۔''

اور کہیں آپ ﷺ کی ذات کی قسمیں کھا کر یوں کہا جا رہا ہے:

لَعَمۡرُکَ اِنَّھُمۡ لَفِیۡ سَکۡرَتِھِمۡ یَعۡمَھُوۡنَ O (الحجر:۷۲)

ترجمہ: ''آپ ؐ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔''

آپ ﷺ کی عمر کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں اور کبھی آپ ﷺ کے ارشادِ مبارک کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں اور یوں کہا جا رہا ہے:

وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الزخرف:۸۸)

ترجمہ: ''اور اس کو رسول کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔''

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کی قسمیں خدا تعالیٰ کھاتا ہے، آپ ﷺ کی عمر کی قسمیں خدا کھاتا ہے، ہم کیا اُن کی تعریف کریں گے؟ میں کیا آپ ؐ کی تعریف کما حقہ کر سکوں آپ ﷺ کی تعریف تو خدا خود کرنے والا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانِ پاک کو اور اپنے جسدِ اطہر کو ہمارے لیے کہیں حنین میں اور کہیں اُحد میں، کہیں مکہ کی گھاٹیوں میں اور کبھی شعب ابی طالب میں اور کہیں طائف میں مختلف علاقوں میں اُمت تک دِین کو پہنچانے کے لیے، ھدایت کو پہنچانے کے لیے، خیر کو پہنچانے کے لیے لہولہان کیا۔ وہ خون جس کا ایک قطرہ خدا کی قسم لوح وقلم سے زیادہ قیمتی ہے، خدا کی قسم عرش وکرسی سے زیادہ قیمتی ہے، وہ خون کئی مرتبہ گلیوں اور میدانوں میں بہایا گیا، اس لیے کہ ہم اور تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے والے بن جائیں، اور کہیں وہ خون اُحد کے میدان میں اس طور سے بہایا گیا کہ صرف خون ہی نہیں بہتا بلکہ دندانِ مبارک شہید ہو کر گرتے ہیں، کہیں چہرہ اقدس پر خاکیں تک اُڑائی جا رہی ہیں، کہیں پاؤں کے نیچے کانٹے بچھائے جا رہے ہیں، یہ سب صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ ھدایت و نور، وہ برکت و

خیر، وہ علوم اور معرفت اور وہ اعمال جو کہ تمھاری نجات کا ذریعہ ہیں جو تمھیں خدا تک پہنچا سکتے ہیں تم ان اعمال کو لے لو اور تم خدا والے بن جاؤ۔ محمد ﷺ تو سید العارفین ہیں ہی، وہ تو خدا کے چہیتے ہیں ہی، وہ تو پیارے ہیں ہی، اُنھیں کس مقام کی ضرورت تھی! وہ تو سب مقامات کو چھوڑ کر آئے تھے، وہ تو خاتم النبیین اُس وقت تھے جب کہ مخلوق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مشقتیں تمہارے لیے اُٹھائیں، اُنھوں نے اپنا خون تمہارے لیے بہایا، اُنھوں نے راتوں کی نیند تمہارے لیے چھوڑی، اُنھوں نے اپنے آنسو تمہارے لیے بہائے۔ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا تقاضا، اور آپ ﷺ کی قربانیوں کا تقاضا یہ نہیں کہ ہم صرف سال میں ایک دفعہ یا دو دفعہ آپ ﷺ کی یاد میں کوئی محفل منا لیں۔ آپ ﷺ کی حقیقی یاد یہ ہے کہ ہر آن، ہر لحظہ اور ہر وقت وہ جمالِ جہاں آرائے عالم، وہ سید الانبیاء، وہ خاتم النبیین، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہو۔ ہر آن وہی چہرۂ اقدس ہماری نگاہوں میں ہو، وہی نور کا پیکر ہماری نگاہوں میں ہو، ہم چلتے ہوں تو اسے دیکھ کر چلتے ہوں، اٹھتے ہوں تو اسے دیکھ کر اٹھتے ہوں۔ ہمارا ظاہر و باطن اگر اس طرح استعمال نہیں ہوتا تو ہمارا ایمان کامل نہیں۔ آپ ﷺ کی محبت جب تک ہمارے رگ و پے میں سرایت نہیں کرتی، آپ ﷺ والے اعمال جب تک ہمارے اندر نہیں اُترتے ہمارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ فرمایا:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوٰہُ تَبْعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ اَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ

ترجمہ: ”تم میں سے اس وقت تک کوئی کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ

اس کی چاہتِ نفس اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جو کہ میں لے کر آیا ہوں۔''

اپنی خواہش کو مٹا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش میں رنگین کر دینا ہے۔

جب تک ہم اپنی چاہتوں پر چلتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان نہیں کرتے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا ایمان کامل نہیں ہوتا۔آپ ﷺ کی محبت جب تک تمام محبتوں پر غالب نہیں آجاتی ہمارا ایمان کامل نہیں ہوتا۔اس لیے دوستو! سب سے بڑا اسبق آج کے دن کا کیا ہے اور آپ ﷺ کی پیدائش کا مقصود کیا ہے؟...... کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے بن جائیں۔ یہ بات نہ ہو کہ کل آپ ﷺ یوں کہہ دیں ؎

تم میرے ہو کے بھی میرے نہ ہوئے　　　تم کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

حدیث کے الفاظ ہیں، بخاری کی روایت ہے کہ قیامت کے دن ایک گروہ ہوگا جس کے سب لوگ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آواز دیں گے اَخِیْ ھٰذَا اَخِیْ ھٰذَا یہ میرے لوگ ہیں یہ میرے لوگ ہیں۔کہا جائے گا یہ تیرے نہیں بلکہ تیرے بعد انھوں نے تیرے اعمال کو چھوڑ کر غیروں کے اعمال کو اپنا لیا تھا۔کسی نے کہا ہے جو خداوندِ قدوس کا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان لانے کے بعد اور کلمہ پڑھ لینے کے بعد تابع نہ ہوا تو حقیقت میں اس نے نہ خدا کی قدر کی نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر کی۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر یہ ہے کہ اُن کے رنگ میں رنگ جاؤ، خدا کی قدر یہ ہے کہ اُس کے رنگ میں ڈوب جاؤ۔جب تک خدا کا رنگ تم پر نہیں چھا جاتا، جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاکہ تم میں نہیں آجاتا اور اُن کے طریقوں کو نہیں اپناتے، نہ خدا کا یقین کامل اور نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل

ہوا۔ ہمارے حضرت شاہ عبدالعزیز دعا جو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے دِین کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ ...... مختصر سی بات ہے، اپنے نفس والی زندگی دی جاتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم والی پیاری زندگی لی جاتی ہے۔ سودا ہے، ایک ہاتھ دو، دوسرے ہاتھ لو، خاک دو اور سونا لو۔ کسی نے کہا اور خوب کہا۔

جمادے چند دادم و جان خریدم

بِحَمْدِ اللّٰہ بَسے ارزاں خریدم

ترجمہ: ''چند سکے دیئے اور جان خرید لی، اللہ کا شکر کہ بہت ہی ارزاں خرید لی۔''

ہماری زندگی خاک سے بدتر ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، جانِ پاک ہے، اُونچی ذات ہے، فرشتوں سے اُونچی، خدا کے بعد سب سے اُونچی ذات، ہم اور آپ میں حضور ﷺ کا ایک عمل زندہ ہو جائے تو خدا کی قسم انتہائی اُونچا سودا ہے۔ جان نکل جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ادا ہم میں آجائے تو خدا کی قسم انتہائی سستا سودا ہے۔ خدا ہم میں ان اعمال کو پیدا فرمائے جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہیں۔ ہم اگر عمل نہیں کرنا چاہتے تو محبت کا نرا دعویٰ ہے اور دعوے کے زور سے کچھ نہیں ہوا کرتا۔ آپ عدالت میں دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز میری ہے، حکومت کہے گی دلیل لاؤ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے دعویٰ کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال لاؤ ...... اگر وہ طریقہ تمہارے اندر ہو تو تم کامیاب ہو گئے، اس عالم میں بھی کامیاب ہو گئے اور آخرت میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہم میں نہیں آتے تو دوستو! یہاں کی بھی ناکامی اور آخرت کی بھی ناکامی ہے، اللہ ہمیں ان دونوں

عالموں کی ناکامیوں سے بچالے۔

دیکھو! انسان انتہائی عجیل، جلد باز اور انتہائی ادنیٰ منافع پر جان دینے والا ہے۔ اگر یہ تھوڑا سا سوچ لے اور تھوڑی سی فکر کرلے تو اس تھوڑی سی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال کو اپنا کر اس کی ابدالآباد کی زندگی بن جائے گی، دُنیا کی زندگی بنے گی، موت کے وقت کی زندگی بنے گی۔ حقیقت میں موت کا ایک لمحہ اپنی سختی اور اپنی مشکلات کی بنا پر اتنا دردناک لمحہ ہے کہ اگر ہمیں تھوڑی سی بھی فکر ہو تو ہم پوری زندگی صرف اپنی موت کو بنانے کے لیے لگا دیں۔ موت کا ایک لمحہ یا تو ہمیں جہنم تک پہنچا دے گا یا ہمیں خدا کی ذات تک پہنچا دے گا۔ کسی نے کہا ہے

اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُّوصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ

ترجمہ: ''موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب تک پہنچا دیتا ہے۔''

اگر محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال ہیں، خدا کی محبت اور یقین تمہارے اندر ہے تو موت تمہارے لیے راحت کا سبب ہوگی اور تم جس وقت اس دُنیا سے جاؤ گے تو خوشی سے جاؤ گے، اور یوں کہتے ہوئے جاؤ گے ؎

بلا سے نزع میں تکلیف کیا ہے سکونِ خاطر بھی کم نہیں ہے
کسی سے ملنے کی ہیں اُمیدیں کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

خدا سے ملنے کی جو خوشی ہوگی وہ تمام غموں کو دور کر دے گی، اور قبر میں میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو دیدار پہلے ہی ہوگا وہ اتنی قیمتی مایہ ہے کہ اس کے لیے جینے والے چاہیں کہ مر جائیں لیکن دیدار ہو جائے۔ اس کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ اسی طور پر قبر کا پورا کا پورا زمانہ، حشر کا پورا کا پورا زمانہ،

ابدالآباد کا پورا زمانہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے لپٹ کر ہی رحمت کا سبب بن سکتا ہے، نجات کا سبب بن سکتا ہے، خدا سے لینے کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو جھٹک دیا، آپ ﷺ کے دامن سے ہٹ گئے، آپ ﷺ کے اعمال کو چھوڑ دیا تو خدا کی قسم یہاں بھی دھتکار دیے جاؤ گیا وروہاں بھی ذلیلوں سے ذلیل کرائے جاؤ گے، یہاں بھی مردُودوں سے لاتیں پڑوائی جائیں گی اور وہاں بھی وہ مار پڑے گی جس کا اندازہ کوئی کرنہیں سکتا، موت کے بعد بھی وہ حال ہوگا جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔

تو دوستو! آج کی رات کا پیغام اور وہ رات اور دن جس میں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا میں تشریف لائے حقیقت میں اتنی بڑی خوشی کا دن ہے اور اتنی بڑی خوشی کی رات ہے کہ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس ذات کو بھیجا جس کو سببِ آفرینشِ کائنات بنایا۔ آج کا پیغام اگر ایک دولفظوں میں دے سکتا ہوں تو وہی پیغام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیتے رہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط دل کو خدا کے یقین سے بھرلو اور غیر سے خالی کرلو، اپنے اندر اور باہر کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں سے نورانی بنالو۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے طریقے اور اعمال تمہاری ذات میں آگئے تو تم کامیاب ہوگئے اور اگر یہ چیزیں نکل گئیں تو ناکام ہوگئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بات بھی عرض کروں گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ ﷺ کے ختم نبوت کا تقاضا یہ ہے کہ دورۂ نبوتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے دِین کی حرکت ہر آن ہوتی رہے، ہر لحظہ ہوتی رہے، ہر وقت ہوتی رہے اور دِین کی حرکت کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ میرے اندر

بھی اعمالِ محمدیہ پیدا ہوں اور جہاں تک میری آواز پہنچتی ہے، جہاں تک میرا عمل پہنچتا ہے، میں دوسروں میں بھی دینِ ھدایت کو لانے کی کوشش کروں، اُن میں خیر کو پہنچاؤں، ایمان کو پہنچاؤں، ھدایت کو پہنچاؤں، جان لگے تب ھدایت کی بات دوسروں تک پہنچا دوں، مال لگے تو دوسروں تک خیر کے کلمات کو پہنچا دوں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں دِین دے کر گئے، دِین کے پھیلانے کا طریقہ دے کر گئے، قرآن دے کر گئے، قرآن والے اعمال دے کر گئے، اور اُن تمام ھدایتوں کو تمہارے حوالے کر کے گئے کہ تم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح جانشینوں کی حیثیت سے، اور صحیح اُمتیوں کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو خود اپناؤ اور پورے عالم میں جاری کر دو اور پھیلا دو۔ دوستو! تمہاری محنت سے تمہاری ذاتوں کے اندر اعمالِ محمدیہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتیں آئیں گی، تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کی حیثیت سے اللہ کی رحمت والے بن جاؤ گے، جدھر سے گزرو گے رحمت پھیلے گی، جہاں جاؤ گے وہاں خیریں ہوں گی۔ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے، ارشاد فرمایا میرے صحابہ میں سے کوئی شخص جس سرزمین میں جا کر وفات پا گیا اور اس سرزمین میں دفنا دیا گیا قیامت کے دِن جب اُٹھے گا تو اس سرزمین کے لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ جیسے شفاعتِ کبریٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے اسی طور پر آپ ﷺ کے اعمال والے بھی آپ ﷺ کے ساتھ شفاعت کرنے والے ہوں گے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

اِنَّ حَوْضِی اَبْعَدُ مِنْ اَيْلَةَ مِنْ عَدَنٍ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: میرے حوض (یعنی حوض کوثر) کے دونوں سروں کے درمیان کا فاصلہ ''ایلہ''

اور ''عدن'' کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہے۔

اگر حوضِ کوثر سے کوئی ایک دفعہ پانی پی لے گا تو حدیث کے الفاظ ہیں

حَوْضِیْ مَسِیْرَۃُ شَھْرٍ وَزَوَایَاہُ سَوَاءٌ وَمَاؤُہُ اَبْیَضُ مِنَ الْوَرِقِ وَرِیْحُہُ اَطْیَبُ مِنَ الْمِسْکِ وَکِیْزَانُہُ کَنُجُوْمِ السَّمَاءِ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَا یَظْمَأُ بَعْدَہٗ اَبَدًا (مسلم۔کتاب الفضائل)

ترجمہ: میرا حوض (یعنی حوض کوثر) ایک ماہ کی مسافت کے بقدر دراز ہے اور اس کے چاروں کنارے برابر ہیں (یعنی لمبائی چوڑائی میں وہ مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، اور اس کی بو مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور اس کے پیالے (اپنی چمک دمک اور کثرت وزیادتی کے اعتبار سے) آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں اور جو شخص اس کا پانی پی لے گا اس کو پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔

وہاں پلانے والے کون ہوں گے؟...... ساقیٔ کوثر خیر البشر سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہوگی، وہ اپنوں کو جو اُن کے ہو چکے، اپنے دستِ خاص سے جامِ کوثر پلائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے جسے جام مل گیا، جان دے کر بھی اور پوری زندگی لگا کر بھی ایک گھونٹ مل جائے، خدا کی قسم انتہائی سستا ہے، جان قربان ہو جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ پاک سے ایک گھونٹ مل جائے، ایک جام مل جائے تو دوستو معمولی چیز نہیں ہے۔ میں یوں کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ خاص سے اپنوں کو پلائیں گے اور اپنوں کو پلانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ جاؤ بھائی تم اپنا کام کرو، نہیں.... بلکہ تم میرے ہو، آؤ میرا ہاتھ بٹاؤ اور باقی لوگوں کو تم پلانے والے بنو۔ جو جہاں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دِین کا کام

کرتے ہیں اور ھدایت کو پھیلاتے ہیں وہ نائبینِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے جامِ کوثر لے کر حوضِ کوثر میں سے لوگوں کو آبِ کوثر پلائیں گے۔ اُن کے اُوپر جو پچاس ہزار سال کا مشکل دن ہو گا ایسے گزر جائے گا جیسے کہ صبح کی دو رکعتیں یا عصر کی چار رکعتیں

ع شب ہمہ گشت و ما محو تماشا بودیم

ترجمہ: ''پوری رات گزر گئی اور ہم جمالِ یار میں اس طرح مست تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا۔''

تو دوستو! آسانیوں کو لینے کے لیے، برکتوں کو لینے کے لیے، میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اللعالمینی کی چادر کے نیچے آ جاؤ، آپ ﷺ کے دامن میں آ جاؤ۔ آپ ﷺ کا دامن حقیقت میں آپ ﷺ کے اعمال کا دامن ہے، آپ ﷺ کی ھدایات کا دامن ہے، آپ ﷺ کی تعلیمات کا دامن ہے، اس کو اپنے اُوپر اوڑھ لو، آپ ﷺ کے اعمال کو اپنا لو، دُنیا میں بھی کامیاب ہو جاؤ گے، آخرت میں بھی کامیاب ہو جاؤ گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمھیں بھی عمل کی توفیق دے اور ہمیں بھی عمل کی توفیق دے، ہماری زندگی قرآن والی بنے ،محمد صلی اللہ علیہ وسلم والی بنے، آپ ﷺ کے صحابہؓ والی بنے اور کل ہم حشر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والے ہوں اور کل قیامت کے بعد اللہ تعالیٰ جنت میں ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب جنت کا داخلہ نصیب فرمائے تو آپ ﷺ کے قدموں میں ہمیں جنت عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اسلام اور سوشلزم

نَحمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیمِ ط

اسلام کامل ضابطۂ حیات ہے:

عزیزو اور دوستو! سب سے پہلے تو ہمیں اسلام کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام صرف چند عقائد کا نام نہیں بلکہ اسلام زندگی کی وہ حقیقت انسان کے سامنے کھولتا ہے اور وہ طریقۂ حیات انسان کو دیتا ہے جس میں انسان کی زندگی کے جملہ شعبے آجاتے ہیں۔ انسان کی عبادات، انسان کی گھریلو زندگی، انسان کی سیاسی زندگی، انسان کی معاشرتی زندگی، انسان کی اقتصادی زندگی، مختصر لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ جملہ شعبے یا زندگی کے پہلو جن سے انسان انفرادی یا اجتماعی زندگی میں دو چار ہوتا ہے اسلام اُن سب کے متعلق ہمیں جامع اور مانع ہدایات دیتا ہے، اور اسلام اپنی ہدایات اس کمال کے ساتھ دیتا ہے کہ ان ہدایات کے ہوتے ہوئے انسان کو کسی دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسلام کا اپنے متعلق دعویٰ ہے اور ہمارے نزدیک درست دعویٰ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ میں کامل دین ہوں۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ۔۳)

ترجمہ: ''آج کے دن ہم نے تمہارے لیے دِین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو پورا کر دیا ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دِین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔''

تو اب یہ جو تکمیلِ دِین ہے یہ صرف عبادت کے رُخ سے نہیں ہے، یہ تکمیلِ دِین صرف زندگی کے اُن احکام کے رُخ پر نہیں ہے جنھیں موجودہ لیگل (Legal) اصطلاح میں پرسنل لاء کہتے ہیں۔ صرف یہ نوعیت نہیں ہے کہ ہمارے پرسنل لاء کو اسلام بیان کریگا اور اسلام اس کے متعلق احکام دے گا بلکہ اسلام جو زندگی کی راہیں انسان پر کشادہ کرتا ہے اس میں انسانی زندگی کا جز وکل آجاتا ہے اور زندگی کا کوئی بھی ایسا حصہ باقی نہیں رہتا جس میں انسان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حبیبِ خدا سیدالانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہدایات نہ دے دی ہوں۔

دین اللہ کی طرف سے آتا ھے:

یہ تمہیدی جملے میں نے اس لیے کہے کہ آج مثال کے طور پر سوشل ازم ہو یا کوئی اور اِزم ہو، جو بھی نظام ہو، ہم جب اس نظام کا پیوند اسلام کے ساتھ لگاتے ہیں تو تحتُ الشعور میں یہ بات کام کر رہی ہوتی ہے کہ اسلام اس بارے میں ناقص تھا، اور اس مقام کو نہیں پہنچا تھا جہاں یہ اِزم پہنچ گیا، اور اس اِزم نے ہم انسانوں کے لیے جو راہ کشادہ کی ہے اسلام نے وہ راہ انسانوں کے لیے کشادہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں ایک اور نکتہ اگر آپ اپنے ذہن میں رکھیں تو غالباً مفید رہے گا اور بر وقت آپ اُس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے، وہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اور جملہ ادیانِ سماویہ یعنی جو آسمان سے آنے والے دِین ہیں ان کے نزدیک، دِین جو آتا ہے خدا سے آتا ہے، دِین نام ہوتا ہے اُن ہدایات کا جو کہ خداوندِ قدوس اپنی ذات سے بھیجتے ہیں اور نبیوں کے ذریعے سے بھیجتے ہیں اور وہ احکام اپنے جز وکل میں خدا کی طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں، انسان کا ذاتی دخل ان کے بنانے میں کچھ نہیں ہوتا۔

انسان کے ذہن کا، انسان کے تخیل کا اور انسان کی معلومات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر ہم انسانی دخل کو دِین کی بناوٹ میں شریک سمجھنے لگیں تو گویا ہم یوں کہنے لگ جائیں گے کہ بھئی پھر وحی کی ضرورت کیا ہے؟ حالانکہ وحی تو آتی ہی اس لیے ہے کہ انسان اپنی زندگی کو صحیح رُخ پر نہیں چلا سکتا اور وحیٔ الٰہی اس کی دستگیری کرتی ہے اور اسے وہ راہ بتاتی ہے جس میں انسان کا فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔ اگر وحیٔ الٰہی کو آپ خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں اور دِین کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ فوری طور پر یوں کہہ اُٹھیں گے کہ وہ دِین جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور وہ دِین جسے کہ اُس کے نبی نے بتایا وہ اپنے اندر کسی انسانی پیوند کو قبول نہیں کرے گا۔ کیوں؟ اس لیے قبول نہیں کرے گا کہ وہ خدا کا دیا ہوا دِین ہے۔

انسان سب مل جائیں، اوّل سے لے کر اس وقت تک کے، اور اس وقت سے لے کر قیامت تک کے آنے والے عقلاء، دانشور، حکیم اور فلاسفر سب اکٹھے ہو جائیں، لیکن ہم اپنے ایمان کی بصیرت کے ساتھ یہ کہیں گے کہ سب کی عقلیں مل کر بھی اس دِین کا جو کہ خداوندِ قدوس کی طرف سے آیا ہے ایک جز اور ایک قطرہ بھی نہیں دے سکتیں کیونکہ انسان کا علم کامل نہیں ہوتا بلکہ کوتاہ ہوتا ہے۔ انسان کو قطعی اس چیز کا علم نہیں کہ کل کیا ہوگا؟ کوئی بڑے سے بڑا دانشور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کل کے حالات کو جانتا ہے۔ اسی طور پر انسان کی جملہ ضروریات اگر کوئی ذات جانتی ہے تو اللہ کی ذات جانتی ہے، خدا کے سوا انسانوں کی جملہ ضروریات کو کوئی دوسری ذات سمجھ نہیں سکتی۔ ایک یہ نکتہ ذہن میں رکھیۓ اور دوسری طرف ایک اور چیز کو سوچیۓ کہ انسان جو نظام بناتے ہیں اگر کسی فردِ واحد نے کسی نظام کو یا کسی نظریۂ حیات کو آپ

کے سامنے پیش کیا تو دو حال سے خالی نہیں ، یا تو سب اس کا ذاتی نظریہ ہوگا یا یہ ہوگا کہ وہ کسی خاص سوسائٹی یا کسی خاص مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتا ہوگا۔ اب انسان کوئی بھی ہو، اگر مزدُور ہے تو مزدُور کے سامنے مزدُور کا مفاد زیادہ ہوگا بنسبت سرمایہ دار کے مفاد کے، اگر حاکم ہے تو حاکم انسان کے جامے میں رہتے ہوئے کلیتاً اپنے مفاد کو نظر انداز نہیں کرسکتا، اسی طور پر محکوم اپنے مفاد کو نظر انداز نہیں کرسکتا، گورا اپنے مفاد کو دیکھے گا، کالا اپنے مفاد کو دیکھے گا، یورپین اپنے مفاد کو دیکھے گا، افریقن اپنے مفاد کو دیکھے گا۔ یہ صرف مفروضات نہیں ہیں بلکہ حقیقتیں ہیں جو کہ آج کی دُنیا میں آپ پورے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ جو معاملہ آپکے ساتھ کرے گا وہ امریکن سے نہیں کرے گا۔

اس وقت امریکہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق تو ہم یوں کہتے ہیں کہ وہاں گوری نسل کالوں کے ساتھ برا سلوک کر رہی ہے لیکن اگر آپ ''جدّہ یشیا'' میں چلے جائیں تو وہی کالے ہندوستان اور پاکستان کے کالوں کو باہر نکال رہے ہیں۔ انسان حیران ہوتا ہے کہ کل تک تو وہ اتحاد کے داعی تھے، اب ان میں پھوٹ کیسے پڑ گئی۔تو ہر شخص اپنے مفاد کو دیکھتا ہے، ہر طبقہ اپنے مفاد کو دیکھتا ہے، ہر شخصیت اپنے مفاد کے مطابق سوچا کرتی ہے۔

اس تمہید پر اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ تمام انسان چاہے فرد کی حیثیت سے ہوں یا جماعت کی حیثیت سے ہوں، انسان کو کوئی ایسا نظریۂ حیات نہیں دے سکتے جو کہ تمام انسانوں کے جملہ طبقات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے عادلانہ نظام ہو، ایک ایسا عادلانہ نظام جس میں کہ جمہور اور تمام انسانوں کے

مفادات کی رعایت کی گئی ہو۔

انسان روح اور بدن کا مجموعہ ہے:

انسان کو دیکھئے تو انسان صرف پیٹ نہیں ہے، اگر انسان صرف پیٹ ہوتا تو یہی تھا کہ مجھ میں اور بھینسے میں کچھ فرق نہیں تھا بلکہ بھینسا مجھ سے اچھا تھا وہ زیادہ کھالیتا ہے، میں بھینسے سے یقیناً کم کھاتا ہوں گا، اسی طور پر اگر ہماری صرف جسمانی ہی ضروریات ہوتیں اور انسان کا صرف پیٹ ہی ہوتا تو ہم یوں کہہ لیتے کہ چلو بھئی نفس کے رُخ سے ایک بات چل رہی ہے لیکن انسان کے اندر جہاں پیٹ ہے، وہاں انسان کے اندرِ دل ہے، دماغ ہے اور انسان بہت ساری اُن اعلیٰ اقدار (High Values) کی حفاظت کرنے والا ہے جو دِیگر حیوانات کے اندر نہیں ہیں۔تو اب جملہ انسانوں کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے کوئی ایسا نظام دینا جس میں کہ سب کی نفسیات کی رعایت ہو جائے، یہ کسی انسان کا کام نہیں یہ اسی اللہ تعالیٰ کا کام ہوسکتا ہے جس نے کہ انسان کے اندر نفسیات کو رکھا ہے۔

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ O (الملک:۱۴)

ترجمہ: ”(اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے،اور وہ باریک بین اور پورا خبردار ہے۔“

اللہ تبارک وتعالیٰ سے زیادہ انسانوں کا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔تو ان چند بنیادی نکتوں کو اگر ہم سامنے رکھیں تو یہ بات آپ پر اور ہم پر واضح ہو جائے گی کہ اسلام جو کہ خدا کا آخری اور کامل دِین ہے اور جسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائے کمال کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ باہر کے کسی نظریے کے

پیوند کو اپنے اندر قبول نہیں کرے گا۔ جو نظام باہر سے آئے گا وہ انسانی نظام ہوگا، اچھا ہو یا برا ہو بہر حال وہ انسانی نظام ہوگا، اور ہر وہ نظام جو کہ انسان کا ساختہ و پرداختہ ہے خدا کے نظام کے ساتھ میل نہیں کھائے گا، اس کا پیوند نہیں بنے گا۔ اگر آپ اس کا پیوند اس کے ساتھ لگاتے ہیں تو گویا آپ کے تحتُ الشعور میں یہ بات ہے کہ خدا کا نظام جو آیا ہے وہ کامل نہیں ہے۔ اس بنا پر ہم یوں کہتے ہیں کہ اگر آپ یوں کہیں اسلامک سوشل ازم تو گویا یہ مطلب ہوا کہ سوشل ازم نے جن قدروں کو انسانوں کے حوالے کیا ہے اور جن مفادات کی رعایت سوشل ازم کرتا ہے اسلام نے انکی رعایت نہیں کی اور اسلام اس بارے میں ناقص تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے کبھی ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ اسلام اس بارے میں ناقص ہے۔

اسلام میں کسی ازم کا پیوند نہیں لگ سکتا:

اب دیکھئے دوسری بات سوشل ازم کے بارے میں، اسلام کے تقریباً تیرہ سو سال بعد ایک شخص پیدا ہوتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا داعی یعنی اس کو پیش کرنے والا ''کارل مارکس'' تھا، جو نسل کے لحاظ سے یہودی تھا اور عقیدے کے لحاظ سے دہریہ تھا، خدا کا منکر اور خدا کا نہ ماننے والا تھا۔ اب ایک وہ دِین (اسلام) جو یہ کہے کہ میں ابتداء سے لے کر انتہا تک خدا کا بھیجا ہوا ہوں، ہم یوں کہیں کہ بھئی خدا کے بھیجے ہوئے دِین میں وہ کمال نہیں جو کہ ایک دہریہ اپنے ذہن کی کاوشوں سے انسانوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے تو گویا یہ اتحاد ہوا، کس کا؟ آبِ حیات کا اور زہر کا، یا یوں کہہ لیجئے کہ شراب کا اور آبِ زَم زَم کا۔ زَم زَم اور شراب جیسے اکٹھے نہیں ہو سکتے اسی طور پر ہم یوں کہتے ہیں کہ اسلام اور سوشلزم اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم یوں

کہتے ہیں کہ اسلامک سوشل ازم ...تو کل ہم یوں بھی کہہ دینگے کہ اسلامی یہودیت، اسلامی عیسائیت اوراس سے بڑھ کر میں یوں کہہ دوں کہ اسلامی دہریت۔

مشکل یہ ہوگئی ہے کہ ہم نے اسلام کو کماحقہٗ دیکھا نہیں، جب اسلام کو دیکھا نہیں تو جو شخص کسی نئے نظریے کو اسلام کا لیبل لگا کر پیش کر دیتا ہے تو ہم اسے کہہ دیتے ہیں کہ ہاں بھئی یہی اسلام ہے۔ لطیفے کے طور پر ایک بات کہہ دوں، آپ کہیں گے کہ مذاق کرتا ہے۔ میں نے ایک لطیفہ بنایا ہے وہ لطیفہ یہ ہے کہ ہمارے ایک ساتھی بشیر صاحب حج پر چلے گئے، دوسرے ایک ساتھی ہیں انجنیئرنگ کالج میں شاہ ولی صاحب، شاہ ولی صاحب نے نہ تو تمام عمر اُلّو دیکھا اور نہ ہی تمام عمر کبوتر دیکھا۔ انھوں نے بس یہ سن رکھا تھا کہ حرم شریف یعنی کعبۃ اللہ میں کبوتر بہت ہیں، تو مسلمان تو ہیں، بشیر صاحب ان کے دوست حج پر جانے لگے تو انھوں نے ان سے کہہ دیا کہ بھائی میں تو وہاں پہنچ نہیں سکا تم جارہے ہو تو وہاں سے میرے لیے ایک کبوتر لے آنا، میں اسی کو چوم کر اپنی دل کی حسرت نکال لوں گا۔ بشیر صاحب بھی بڑے ہوشیار تھے، وہاں سے کبوتر تو لائے نہیں کراچی سے اُلّو لے آئے۔ اب جو کراچی سے اُلّو آیا تو شاہ ولی صاحب نے اُسی کو چومنا شروع کر دیا کہ یہ حرم کا کبوتر ہے۔ تو آج کا مسلمان جو کہ دِین کے حقائق سے واقف نہیں جو اُلّو بھی اس کے سامنے کر دیا جاتا ہے وہ اس کو منہ سے لگا کر کہتا ہے کہ یہ اسلام ہے۔ حالانکہ اسلام صرف وہی ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا اور وہ اسلام جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہیں کیا وہ اسلام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو بنیادی درجے کی بات ہے اوراس میں آپ اپنے ذہنوں میں اچھے طور پر رکھ لیں کہ نہ تو اسلامی سوشلزم ہوسکتا ہے، نہ

اسلامی کیپٹلزم ہوسکتا ہے اور نہ اسی طور پر اور کسی اِزم کا پیوند اسلام کے ساتھ لگ سکتا ہے۔ اب یہ ایک بات بنیاد کے درجے میں ہوگئی کہ اسلام جامع و مانع دِین ہے وہ کسی خارج کی چیز کو قبول نہیں کرتا۔

اسلام کے متعلق تو آپ جانتے ہیں کہ یہ خدا کا دِین ہے۔ اسلام کی بنیاد کس پر ہے؟ سب سے پہلی بنیاد جو ادیانِ سماویہ کی ہوتی ہے اور وہ اسلام کی بھی ہے وہ خدا کے اقرار پر اور خدا کی صفات کے اقرار پر، اور خدا کی کتابوں کے اقرار پر اور خداوندِ قدوس نے جن نبیوں کو بھیجا ہے اُن کی زندگی کو اپنانے کے اقرار پر اور موت کے بعد کی زندگی کے اقرار پر ہوتی ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اللہ پر ایمان اور جو کچھ رسول لے کر آیا ہے اس پر کامل یقین کہ اس میں دُنیا کی اور آخرت کی کامیابی ہے اور اسکے ساتھ آخرت کا یقین۔ یہ تو ہوگئی ایک بنیاد، اور پھر اس کے ساتھ دوسری بنیاد یہ کہ جتنے بھی دِین ہیں وہ صرف جسم کی زندگی کے سدھارنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ دِین نام ہے دِل کے سنوارنے کا بھی اور جسم کے سنوارنے کا بھی، وہ دِل کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں اور پیٹ کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں، وہ اس دنیا کی زندگی کو بھی بناتے ہیں اور موت کے بعد کی زندگی کو بھی بناتے ہیں۔ یہ بات کھل گئی تو پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ دِین خدا کی طرف سے کیوں آتا ہے؟ اس لیے کہ خدا کی نگاہ میں ہر طبقۂ انسانی کا مفاد پورے طور پر ہوتا ہے، اقبال کے لفظوں میں ۔

وحی حق بینندۂ سودِ ہمہ

در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی وحی سب کی خیر اور بھلائی کو دیکھنے والی ہے وہ ہر شخص کی خیر اور بھلائی کا خیال رکھتے ہوئے اس کو لے کر چلتی ہے۔''

یہ تو خدا کی وحی کا حال ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہیے کہ دِین کی بنیاد ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، کتاب اللہ اور نبی کے طریقے پر اور اس کے ساتھ ساتھ رُوحانیت یا دِل کہہ لیجئے اس پر ہے۔ چار چیزیں ہوگئیں، اختصار کے ساتھ کہہ لیجئے اقرارِ خدا، اقرارِ رسالت، اقرارِ آخرت اور دِل کا بنانا یا رُوحانیت، یہ چار بنیادیں ہوگئیں۔

سوشل ازم ایک ردِ عمل ہے:

اب اس کے مقابلے میں دیکھئے سوشلزم اصل میں اُس فکر اور اس نظریہ کا نام ہے جو کہ ہمیشہ قوموں میں ردِعمل کے طور پر پیدا ہوا ہے، بنیادی طور پر یہ نظریہ پیدا نہیں ہوا اس لیے اس کا رُجحان منفی ہے مثبت نہیں ہے۔ یہ ایک ردِعمل والا نظریہ ہے، یہ اپنی ذات میں بنیاد کے درجے میں خود بخود نہیں تھا۔ اس لیے اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج سے چار ہزار سال پہلے جب فراعنۂ مصر میں دولت بہت زیادہ آ گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر انھوں نے عام لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنا شروع کر دی تو ایک طبقہ اُٹھا جس نے اس نظریے کو آگے بڑھایا اور کچھ لوگ اس زمانے میں اس چیز کے حامی بن گئے کہ دولت غریب کا حق ہے امیر کا حق نہیں اور یہ سب میں مساوی تقسیم ہونی چاہئے۔ اس کے بعد آپ آگے آیئے تو یونان کا دور آتا ہے گو کہ ارسطو (Aristotal) نے اپنے مضامین (Essays) میں اس بات کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن ارسطو کے زمانے میں اُس کی اپنی ایتھنز کی ریاست (City

(states of Athens میں یہ نظام لاگو نہیں ہو سکا تھا۔ اسی زمانے میں یونانیوں کی ایک دوسری ریاست تھی سپارٹا، سپارٹا میں سب سے پہلے یہ نظریہ کچھ عرصہ کے لیے چلتا رہا۔

اس کے بعد دوسری دفعہ یہ چیز ایران میں پیدا ہوئی۔ ایران میں سوشلزم کو اس وقت مزدکیت کہتے تھے، مزدکیت اس لیے کہتے تھے کہ اس کا بانی اس زمانے میں مزدک تھا۔ ایران اس وقت کیپٹل اِزم اور سرمایہ داری کے اس رُخ پر آ چکا تھا کہ انسان حیران ہوتا ہے، ساسانیوں کے زمانے کے ایران کے تذکروں کو پڑھیں تو آپ حیران ہونگے کہ کس قدر دولت مند تھے، ، رومن امپائر کے متعلق گبن Gibbon نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور اسی طور پر کیسپائن Kaspine نے ''ایران بہ اہلِ سافران'' ایک کتاب ہے جو کہ اصل میں فرنچ (فرانسیسی زبان) میں ہے اور اس کا اُردو میں ترجمہ ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے، اس میں یہ لکھتا ہے کہ سونا ایک طرف ڈالا جاتا تھا اور ریشم دوسری طرف ڈالا جاتا تھا اور یہ لوگ ریشم کو خرید کر اس کے کپڑے پہنتے تھے۔ اندازہ کیجیئے آپ تعیش کا۔ اس رُخ سے ایک محدود طبقہ تھا کیونکہ دولت جب آتی ہے تو سکڑ کر چند محدود طبقات میں آیا کرتی ہے سب میں نہیں آتی۔ اب جب تعیش کا یہ حال ہوا تو اس کے مقابلے میں پبلک میں اس کا ردِ عمل ہوا۔ اس پبلک کے ردِ عمل کو جس شخص نے اپنی ذات میں نمایاں کر کے پیش کیا وہ مزدک تھا۔ مزدک نے جو سوشلزم کا نظریہ پیش کیا اس میں یہ تھا کہ دُنیا میں فساد کی جڑ تین چیزیں ہیں، ''زن، زر اور زمین''۔ یہ صرف بڑوں کے کاشانوں میں کیوں ہوں؟ عام لوگوں کے پاس کیوں نہ ہوں؟ اس لیے اسے عام کر دینا چاہیے۔ جب عام کر دیں تو

دولت بھی عام، زن بھی عام، زمین بھی عام۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت کچھ عرصہ کے لیے یہ چیز چلی تو یہ حال ہوا کہ نوشیرؔوان جو عادل کہلایا جاتا ہے، اس کے باپ کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جب وہ مزدک کے دِین پر آیا تو یہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اپنی بیٹیوں تک سے ملوث ہوا۔ جب عورت عام ہے تو باپ کے لیے بیٹی بھی عام ہے، بہن بھی عام ہے، سب کے لیے عام ہے۔اس تعیش کے خاکے میں اس ایران کو جس نے کورشِ اعظم (Cyrus) کے زمانے میں اور ''دارا'' کے زمانے میں یونان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، تاریخ نے دیکھا کہ نوشیروان کے چالیس سال کے بعد اس سلطنت کا ایسا نام ونشان مٹا کہ آج تک کوئی نام ہی نہیں لیتا۔میرے کہنے کا مطلب یہ کہ سوشل ازم ہمیشہ ردِعمل کے طور پر پیدا ہوا ہے۔

جدید سوشل ازم کے اسباب:

اب آپ آجائیں اِس زمانے کے سوشلزم کے بارے میں، اس زمانے میں اس کا سب سے بڑا داعی اور ظاہر کرنے والا کارل مارکس ہے۔کارل مارکس یہودی النسل ہے اور عقیدے کے لحاظ سے دہریہ ہے، وہ جس سوسائٹی کی نمائندگی کرتا ہے اس سوسائٹی میں ایک ردِعمل پیدا ہوا اور اس ردِعمل کے پیچھے تین بڑے بڑے عوامل کام کررہے تھے اور بھی عوامل ہیں لیکن تین بڑے بڑے عوامل تھے۔اگر آپ نے قرونِ وسطیٰ (Middle ages) کے یورپ کی تاریخ کو پڑھا ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یورپ مِڈل ایجز میں ایسی نوعیت تک پہنچ چکا تھا کہ وہاں تین طبقات خاص طور پر اپنے اثرات لیے ہوئے تھے، ایک طبقے کو ہم اُن کی اصطلاح میں فیوڈلز کہتے ہیں یعنی نظامِ زمینداری، زمین داری کا جو نظام تھا اس میں جو امیر زمیندار یعنی

مالکِ زمین تھے وہ سب کچھ لے لیتے تھے اور جو عام طبقہ تھا اس کو بمشکل کھانے پینے کو دیتے تھے۔ یہی حال آخر وقت تک زارِ روس کا رہا اور زارِ روس کی حکومت کے زوال کا سبب بھی یہی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہ تھی وہاں جو یوکرائن کا علاقہ ہے وہ یورپ کے لیے غلّے کی منڈی کہلاتا ہے لیکن یوکرائن کی غلّے کی منڈی صرف چند لوگوں کے قبضہ میں تھی اور اس کی جتنی بھی آمدن تھی وہ لے لیتے تھے اور جو عام زمیندار یعنی کاشتکار تھا وہ بھوکا مرتا تھا، نہ تو تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور نہ کچھ کھانے پینے کے لیے، بالکل غلاموں کی سی حالت تھی، یورپ کے غلاموں کی سی، ......اسلام کے غلاموں کی طرح نہیں۔ تو اب اس کے لیے ردِ عمل کے طور پر ایک بات پیدا ہونی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ وہاں ایک دوسرا طبقہ تھا جسے ہم سرمایہ دار طبقہ کہہ سکتے ہیں یعنی مال والا، اور اس طبقے کی رگِ گردن یہودی سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی۔

یہ آج کا بینکنگ سسٹم جو کہ تمام دُنیا میں پھیل چکا ہے اس کی ابتداء آپ جانتے ہیں کہ کس طور پر ہوئی؟ بینکاری نظام یہودی سٹہ بازوں اور یہودی ساہوکاروں کی ایجاد ہے۔ ساہوکارانہ نظام نے جب منظّم صورت اختیار کی تو پہلے ساہوکار اکیلے کھاتا تھا اب بڑے اور چھوٹے ساہوکار بننے لگے اور سُود کے نظام کو انھوں نے عام کر دیا۔ بہر حال اگر آپ دیکھیں تو ساہوکاری کے نظام میں یہودی ساہوکار ظلم کے ساتھ لوگوں سے مال بٹورتا تھا۔ آپ نے شیکسپیئر کا ڈرامہ پڑھا ہوگا (Merchant Of Venice)، اس میں آپ کو یہ یاد ہوگا کہ شیکسپیئر ایک جگہ پر لکھتا ہے (One Pound Of Shylock) یعنی کہ یہودی گوشت خور ہے اور انسانی گوشت مانگتا ہے، وہ دوسروں کا گوشت کھانے کے لیے تیار ہے لیکن اپنی ایک پائی

چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔اب بھی دُنیا میں یہودی سرمایہ دارانہ یا ساہوکارانہ ذہنیت چل رہی ہے جسے اسلام نے قارونی ذہنیت کہا ہے۔

اب ایک رُخ پر یہ بات تھی اور عام طبقہ بالکل کچلا چلا جا رہا تھا، اسی دوران صنعتی انقلاب آ گیا۔صنعتی انقلاب میں پہلے تو یہ نوعیت تھی کہ چند مزدور چند آدمیوں کے نیچے کام کرتے تھے۔اب جو صنعت کاری ہوئی تو مِلیں آنے لگیں اب جب مِلیں آنے لگیں تو مِلیں انہی لوگوں کے پاس تھیں جیسے ہمارے ہاں ہوا ایک مِل لگاؤ، اس مِل کو بینک کے پاس گروی رکھواور دوسری مِل لگالو، اس مِل کو دوسرے بینک کے پاس گروی رکھواور تیسری مِل لگالو یہاں تک کہ ہوتے ہوتے بیس بائیس خاندانوں میں تمام ملک کا سرمایہ اکٹھا ہوگیا۔قرآن نے اس کی مثال دی ہے، قرآن نے کسی چیز کو چھوڑا نہیں لیکن افسوس کہ ہم قرآن پاک کو پڑھتے نہیں۔ قرآن پاک نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ایک قصہ نقل کیا ہے کہ اُن کے پاس ایک مقدمہ پیش ہوا، ایک صاحب آ کر کہتے ہیں کہ میرے پاس ایک دُنبی ہے اوراس دوسرے کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں، یہ ننانوے دنبیوں والا کہتا ہے کہ ارے پگلے تو اِس ایک دُنبی کا کیا کرے گا یہ بھی مجھے دے دے تو میری سو دُنبیاں ہو جائیں۔تو یہ ہے سرمایہ دارانہ نظام (کیپٹل اِزم) کا ذہن کہ تیرے پاس ایک بکری بھی نہیں چھوڑتا، میرے پاس اگر ننانوے مِلیں ہیں اورکسی کے پاس ایک مِل ہے......تو وہ بھی میں لوں گا۔اسی طور پر یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا تو اس دولت کو جو کہ مختلف یہودی ساہوکاروں میں بٹی ہوئی تھی چند بڑے ساہوکاروں نے سرمایہ داروں میں منتقل کرنا شروع کردیا اور ان کے ماتحت میں کون لوگ

آ گئے ؟.... مزدُور۔ اب اس کا ردِعمل ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس (French Revolution) کی صورت میں ہوا اور اس انقلاب کے پس پشت جو چیزیں کام کر رہی تھیں وہ (Voltaire) والٹئیر اور رُوسو کا حلقہ کام کر رہا تھا۔ والٹئیر اور رُوسو کے بعد جب یہ انقلاب شروع ہوا تو مزدوروں میں کچھ تو جان آ گئی لیکن اس کے بعد نپولین آیا اور نپولین نے اپنے ذاتی کردار اور اپنی ذاتی شخصیت کی بنا پر فرانس کے اس رُخ کو جو کہ مزدوروں کا رُخ تھا جس میں کہ آپ کو یاد ہو گا انھوں نے پیرس میں بیسٹل (Bastille) کے قید خانے کو توڑ دیا تھا اور پھر بڑا انقلاب برپا ہوا تھا۔ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کو نپولین نے چینلائز کر دیا فرینچ نیشنلٹی میں اور وہ فرینچ نیشن کا نمائندہ بن کر یورپ پر چھا گیا اور جب تک وہ زندہ رہا فرنچ ریولوشن دوسرے رُخ پر آ گیا۔ اب جو اندر جراثیم تھے وہ تو پکتے رہے لیکن ان کے نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی، اور اس طرف نوعیت یہ تھی کہ پچھلے عوامل جو بیان ہوئے سرمایہ داری، ساہوکارانہ نظام اور زمیندارانہ نظام کے خلاف کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری بات آپ نظر میں رکھیے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جب دُنیا اس کو رنج دیتی ہے تو خدا کی یاد آتی ہے۔

ع رنج دیا جب بتوں نے تو خدا یاد آیا

جب بت رنج دیتے ہیں تو انسان خدا کی طرف جاتا ہے، کہتا ہے چلو ممکن ہے یہاں سے خوشخبری مل جائے۔ یورپ والے جب پریشان ہوئے تو چرچ کے پاس گئے، لیکن چرچ خود ان چیزوں میں مبتلا تھا اور ہر بڑا پادری خود ایک سرمایہ دار تھا۔ جو بڑا پنڈت تھا جس کے پاس تمام چڑھاوے چڑھتے تھے اور اخلاق کے لحاظ

سے آپ لیکی (Lecky) کی کتاب ہے ''اخلاقِ یورپ'' (History of European Morals) اسے پڑھ کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ ؎

زاہداں چوں جلوہ در محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

ان کے تہہ خانے کے جو حالات ہیں ان کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ یہ ننیں (Nuns) اور پاکیزہ حضرات جو تھے حقیقت میں کتنے پاکباز تھے۔

ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ظاہری دعوؤں کے برخلاف وہ گندگی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور جب مسلمانوں نے ان ممالک کو فتح کیا تو ان کے گرجوں کے تہہ خانوں کے فرشوں کی کھدائی میں نئے پیدا شدہ بچوں کی ہڈیوں کے ڈھیر ملے۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا، بہرحال تو اس طرف جو گئے تو ان کے پاس وہ دِین تو نہیں تھا جو کہ خدا والا دِین ہو اور جامع دِین ہو کیونکہ عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک نسل بعد بدل چکی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے دور میں ''سالؔ'' جسے سینٹ پال (Saint Paul) کہتے ہیں ایک یہودی تھا، اس یہودی نے دِینِ عیسائیت کو بدلنے کے لیے پالؔ کا نام رکھا اور اس نے پوری کی پوری عیسائیت کے ڈھانچے کو بدل کر اس میں کفارہ اور اس قسم کی چیزوں کو لے آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا، اور اس قسم کی چیزیں اس نے پیش کر دیں جس کے نتیجے کے طور پر عیسائیت ایک عملی دِین ہونے سے ہی قاصر ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوانین کے لحاظ سے عہدِ عتیق (Old Testament) کے پابند تھے،

سینٹ پال نے اس سے بھی آزاد کردیا اوران کے پاس قانون بھی نہیں رہا۔اس نے کہا کہ قیصر کو دے دو جو قیصر کا ہے اور خدا کو دے دو جو خدا کا ہے یعنی دِین و دنیا کی تفریق کردی۔اب جو دِین و دنیا کی تفریق ہوگئی تو دُنیا کے مسائل کے لیے عیسائیت کے پاس کوئی حل نہیں تھا،اب جب دُنیا کے مسائل کا موجودہ عیسائی مذہب کے پاس کوئی حل نہیں تھا تو وہ چرچ سے بھی درماندہ واپس آگئے۔

اس ردِعمل کے بعد آپ کارل مارکس کی تعلیمات کو دیکھئے۔کارل مارکس نے جب دیکھا کہ دولت چند طبقات میں ہے اور صرف اُوپر کا طبقہ ہے جو کھا رہا ہے عام لوگوں کے حالات کسمپرسی کے ہیں۔ایک بات ذرا اس میں یہ بھی سوچ لیں کہ اگر مزدُور کو آپ دولت کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ دولت کی قدر آپکے ذہن میں موجود ہے۔ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن پاک میں اللہ میاں نے فرمایا ہے:

وَاُشْرِبُوْ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ط (البقرہ:۹۳)

ترجمہ:''ان کے قلوب میں وہی گوسالہ پیوست ہوگیا تھا ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے''

یہود کے دِلوں کے اندر سونے کے بچھڑے کی محبت پگھلا کر ڈال دی گئی ہے۔کارل مارکس چونکہ یہودی النسل تھا اس لیے اس کا ذہن حرص کی لعنت کے گرداگرد گھومتا رہتا تھا۔اس کی کتاب کا نام ہے(Das Kapital) یعنی کیا مطلب؟ ...... کہ سرمایہ۔یعنی سرمایہ اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔اس نے یہ سمجھا کہ تمام مسائل کا حل مال میں ہے اور انسان بس مال سے متعلق ہے، انسان مال کے بغیر کوئی چیز نہیں رکھتا۔کارل مارکس کے نزدیک پوری زندگی کیا ہے؟ ...... مال کی طلب اور مال کا

صَرف۔ جب مال کی طلب اور مال کا خرچ زندگی کے دو محرکات ٹھرادیئے تو وہ پوری تاریخ کو صِرف ایک مالیاتی نظام کے رُخ پر لے آتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ انسان کے معاملات کو حل کرنے والی اصل چیز سرمایہ ہے، سرمایہ ہوتا ہے تو معاملات بنتے چلے جاتے ہیں سرمایہ نہیں ہوتا تو معاملہ بگڑتا چلا جاتا ہے اور کہنے لگا کہ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ مزید کہنے لگا کہ شروع میں جب انسانیت بچپن میں تھی، اس وقت چند اُن لوگوں نے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اُصول کے مطابق جو قوت والے تھے انھوں نے غریبوں کے حقوق کو چھینا اور چھین کر دولت کے اور زمین کے مالک بن گئے اور کیونکہ عام طبقات غریب اور مزدُور ہوتے ہیں تو اب ان غریبوں اور مزدُوروں کی ڈھارس بندھانے کے لیے انھوں نے کچھ ڈھکوسلے تراشے، اور ان میں سے بڑا ڈھکوسلہ (نعوذ باللہ) دِین ہے اور خدا کو (نعوذ باللہ) ڈھکوسلہ کہا کہ خدا (نعوذ باللہ) سرمایہ داروں کا سب سے بڑا ڈھکوسلہ ہے، کوئی اور لوری نہیں دے سکتے تو ایمان کی اور دِین کی افیون کھلا دیتے ہیں۔ اس افیون سے غریب اور مزدُور سوتا رہے اور مالدار اس کے خون کی کمائی چوستا رہے اور اپنی زندگی کو بناتا رہے، اور جب کوئی بات ہو تو کہے کہ بھئی دِین نے یوں کہا ہے، مسلک نے یوں کہا ہے۔ اب جب اس نظریے پر آئے تو کیا ہوا؟ ...... انکارِ خدا، انکارِ دِین، انکارِ رسالت اور انکارِ آخرت کر بیٹھے۔ وہاں دُنیا مقصود اور دُنیا میں زندگی کا سب سے بڑا محرک مال ہے جو زندگی بناتا ہے یا بگاڑتا ہے۔ مال مالداروں کے قبضہ میں آجاتا ہے اس لیے کہ اولاً وہ قوت سے قبضہ کر لیتے ہیں پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے وہ مختلف نظریات تراشتے رہتے ہیں، ان نظریات میں کیا چیز ہے؟ ...... ایک مذہب بھی ہے۔ اب اس

کے ساتھ ساتھ اس نے یوں کہا کہ دیکھو جب مذہب کی نوعیت یہ ہے تو جس طور پر اہلِ مذہب نے عوام کو لوٹا اور کھسوٹا ہے، اسی طور پر عام لوگوں کی سادگی سے فائدہ حاصل کر کے (Survival Of The Fittest) کے نظریے کے ماتحت کہ جس کی لاٹھی اسی کی بھینس، جو طاقتور تھا اس نے انسانوں کی امان و اختیار کو اپنے قابو میں کر لیا، اس طرح حکومت اور سلطنت وجود میں آئی اور بادشاہ وجود میں آیا۔ اس لیے اس وقت تک صحیح سوشلزم کا نظام یا صحیح کمیونزم کا نظام قائم نہیں ہوسکتا جب تک نہ تو بادشاہ ہو، نہ مذہب ہو اور نہ مالدار رہو۔ جب تک بادشاہ کا وجود ہے، جب تک دِین کا وجود ہے، مالدار طبقے کا وجود ہے اس وقت تک کمیونزم صحیح معنوں میں آ نہیں سکتا۔ اس کے لیے پہلی چیز یہ ہوگی کہ مذہب کو ختم کرو اور اس کے ساتھ دوسری چیز یہ کہ بادشاہت کو ختم کرو، کلیسا کو ختم کرو اور مالداروں کو ختم کرو۔ اب ان کے خاتمے کے لیے اس نے دو طریقے بتائے ہیں، (Engels) ان کا خاص مفکر ہے، (Engels) کے بعد لینن (Lenin) آتا ہے، لینن کے زمانے میں روس میں یہ چیز کچھ عملی طور پر وجود میں آئی، (Engels) کی تعلیمات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس ردِ عمل کے لانے کے دو طریقے ہیں، ایک تو ارتقائی (Evolutionary) ہے ارتقائی کا معنی یہ ہے کہ پوری کی پوری انسانی تاریخ طبقاتی جنگ کا نام ہے چونکہ غریب طبقات زیادہ ہوتے ہیں لہٰذا نچلا طبقہ زیادہ قوت والا ہوتا ہے وہ اپنے مفادات کے لیے امیر طبقے سے ٹکرائے گا اور آخر کار اس کا ہاتھ اُونچا ہوگا لیکن یہ ارتقاء کی بات بڑی ہی لمبی ہے ہزاروں صدیاں گزر گئیں، اس لیے کیونکہ تم حق پر ہو تمہارا مال بڑوں نے لے لیا ہے تو حق کو وجود میں لانے کے لیے ہر جائز و ناجائز جو طریقہ تم اختیار کر سکتے ہو اختیار کرو،

انقلابی (Revolutionary) طریقہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس نظام کو ختم کر دو تو یہ تمہاری کامیابی ہے۔ تو اب اس رُخ سے یعنی خدا کو ختم کرنا، اور دِین کو ختم کرنا اور اس کے علاوہ بادشاہی کو ختم کرنا اور سرمایہ داری کو ختم کرنا، یہ ردِعمل ہوا۔ یہ بات میں نے اس لیے کی کہ سوشلزم ردِّعمل ہے اُن تین عوامل کا جو کہ یورپ میں جاری تھے۔ اب جس وقت یہ صورت ہوئی تو اقبال نے اس مقام پر کہا ہے ۔

کردہ ایم اندر مقاماتش نگاہ

لا سلاطیں ، لا کلیسا ، لا الہ

اقبال کہتا ہے کہ میں نے کارل مارکس کے کمیونسٹوں کے حالات پر نگاہ ڈالی ہے غور کیا ہے مجھے تین چیزیں موٹی موٹی دِکھائی دی ہیں کہ ان کے نظریۂ حیات میں لا سلاطین یعنی حکومت نہیں بلکہ نری انارکی، دوسری چیز لا کلیسا کوئی دِین نہیں، اور لا الہ کوئی خدا نہیں۔ اسی لیے لینن نے ۱۹۱۷ء میں جب روس کی حکومت پر قبضہ کیا تو اس نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ آج میں نے روس کی سرزمین سے (نعوذ باللہ) خدا کو نکال باہر کر دیا ہے۔

اسلام اور سوشل ازم کی بنیادیں جداگانہ ھیں:

میں یوں کہا کروں کہ سوشلزم کی بنیاد ہے انکارِ خدا، انکارِ آخرت و دِین اور رسالت ......اور اقرارِ پیٹ پر۔ تو اب آپ دیکھئے ادھر ہمارا اسلام اقرارِ خدا، اقرارِ آخرت اور روحانیت، اُدھر سوشلزم میں انکارِ خدا، انکارِ آخرت و دِین اور اقرارِ پیٹ اور مادیت۔ اب یہ دونوں متوازی (Parallel Lines) چلیں گے، نہ ملے ہیں نہ مل سکیں گے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ سوشلزم اسلام ہے تو وہ نہ سوشلزم کو سمجھا ہے

نہ وہ اسلام کو سمجھا ہے، وہ ہے کلمۂ خبیثہ اور یہ ہے کلمۂ طیبہ، اِس کی بنیاد خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رکھی ہوئی ہے اور اُس کی دہریہ اور ملحد کارل مارکس کی رکھی ہوئی ہے۔ میں یوں کہا کروں کہ جس کے پاس قرآن ہے وہ (Das Kapital) کو کیا کرے گا؟ جس کے پاس محمد رسول اللہ ہے وہ لینن اور سٹالن کو کیا کرے گا، وہ ماؤ کو کیا کرے گا؟ میں یہ کہا کروں ''موذی ڈَنگ'' ماؤزے تنگ، ہمارے لیے تو وہ موذی ڈَنگ ہی ہے جو ہمیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹائے۔ آپ نے دیکھا کہ پچھلے دنوں میں کیسا ننگا ناچ ناچے ہیں یہ، ملک کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی صورتیں ہوگئی تھیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کونسا نظام اچھا تھا یا نہیں تھا لیکن جہاں تک کہ اُن کا طریقہ کار تھا اُن کے نمائندے کس رُخ سے آگے بڑھے۔

سوشل ازم میں سارا مال حکومت کی ملکیت ہوتا ھے:

بہرحال اس بات کو جانے دیجئے، ہم علمی رُخ میں بات کر رہے ہیں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سوشلزم کی بنیادیں اسلام سے کلیتًا جداگانہ ہیں۔ اب آیئے وہ کونسے پہلو ہیں جن پہلوؤں کو دیکھ کر لوگ سوشلزم کے فدائی ہو جاتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ دُنیا کی اکثریت غریب ہوتی ہے اور وجہ وہی ہے کہ جب تک کہ اسلام کا نظام چالو نہیں ہوتا، صحیح نظام چالو نہیں ہوتا، سرمایہ دار مالدار سے مالدار تر بنتا چلا جاتا ہے اور غریب، غریب سے غریب تر بنتا چلا جاتا ہے۔ اب حرصِ مال تو ہر شخص میں ہوتی ہے ہم دیکھیں کہ کاروالے گڑگڑاتے ہوئے چلے جارہے ہیں اور ہم بیچارے نیچے پیدل پھر رہے ہیں۔ آخر نفسیاتی طور پر بھی تو اثرات ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں بھئی ہم ایسی حالت میں کیوں ہیں؟ ان کے پاس کیوں ہے ہمارے پاس

کیوں نہیں؟ یہ ایک اصطلاح ہے(Haves And Have Nots) ''نادار اور مالدار'' اب نادار اور مالدار کی چپقلش آئے گی، جب نادار کی مالدار سے چپقلش آئی، تو نادار نے کہا کہ بھئی یہ جو آگ ہے ان کے پاس ہی کیوں رہے میں بھی لے لوں۔ میں یوں کہا کروں کہ اگر مال بُری چیز ہے تو صرف مالدار کے لیے بُرا نہیں ہے، غریب کی جیب میں آ کر اچھا نہیں ہو جائے گا، اگر اچھا ہے تو وہاں بھی اچھا یہاں بھی اچھا۔ اب عمومی مال و دولت کی حرص کی جو آگ انسانوں کے سینوں کے اندر ہے، اسے سوشلزم بھڑکا دیتا ہے، اس لیے مزدُور اٹھتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ غالبًا سوشلزم آ جائیگا تو جنت ارضی بن جائے گی، سب کی زمین ہم میں تقسیم ہو جائے گی۔

یہاں میں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں کہ سوشلزم جتنا ظالمانہ اور جتنا ڈکٹیٹرانہ نظام ہے کوئی دوسرا نظام نہیں ہوگا، ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ شاید تقسیمِ دولت ہو جائیگی، تقسیمِ زمین ہو جائیگی، کمیونسٹ نظام میں جو پارٹی اقتدار میں ہوتی ہے اور وہاں صرف ایک پارٹی ہوتی ہے مزدُور والی پارٹی، اس کو کمیونسٹ پارٹی کہتے ہیں اور اس کے ممبر بھی بڑی مشکلوں کے بعد بنتے ہیں، دُنیا میں سب سے مشکل اگر کسی پارٹی کا ممبر بننا ہے تو وہ کمیونسٹ پارٹی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچھلے دنوں ایسی کوئی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی کوئی ابتدا کی جا رہی تھی کہ بچوں کے ہاتھ کو آگ سے لگا دیا جائے اگر وہ برداشت کر سکیں تو پھر ممبر بنیں ورنہ نہیں بنیں گے۔ جن لوگوں کے سامنے سوشلزم کی اور کمیونسٹ نظام کی تاریخ نہیں ہے وہ تو کہہ دیں گے کہ یہ کوئی بات ہے اور جس نے دیکھا ہے وہ کیسے کہہ سکتا ہے؟ میں خود گیا ہوں یوگوسلاویہ میں، تبلیغی سلسلے میں میرا جانا ہوا تھا، میں دیکھ چکا ہوں وہاں کے اندر کے حالات کیا ہیں، خدا کی قسم اگر کوئی مجھے

آٹھ ہزار کتابیں سوشلزم کے خلاف پڑھنے کو دیتا تو میں اتنا مخالف نہ ہوتا جتنا کہ وہاں کے بیس پچیس دن کے قیام نے مجھے مخالف کر دیا، قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بات یہ ہے دُور کے ڈھول سُہانے، ہمیں اچھا کر کے بتایا جاتا ہے، وہاں کمیونسٹ پارٹی جو ہے اس کا ممبر بننا انتہائی مشکل ہے، کئی ایک کو نکالا جاتا ہے، پھر اس کمیونسٹ پارٹی کی مثال ایک مخروطی نظام کی مثال سمجھ لیجئے، نیچے سے چڑھتے چڑھتے یعنی جیسے کہ آپ کے ملک میں (ایوب خان کا) پانچ زینہ (BD) نظام بنا تھا، پہلے بی ڈی ہونگے یعنی یونین کونسلوں کے Basic Democracy کے ممبر ہونگے اور پھر وہ سب صدر کا انتخاب کریں گے، اسی طرح وہاں تمام اختیارات سیکرٹری جنرل آف کمیونسٹ پارٹی کے پاس آجاتے ہیں، اس کے چند حواری ہوتے ہیں اور سیکرٹری جنرل کی رائے کے خلاف اگر کوئی دوسرا ہو، تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے چھوڑا نہیں جاتا۔ اب جتنا بھی مال و دولت ہوتا ہے وہ یوں نہیں ہوتا کہ برابر تقسیم کر دیا جائے، وہاں تمام دولت مملکت کی ملکیت ہے، تمام زمین مملکت کی ملکیت ہے، تمام سرمایہ مملکت کی ملکیت ہے، اس کو چلانے کی چابی کس کے پاس ہے؟ ...... کمیونسٹ پارٹی کے پاس۔ کمیونسٹ پارٹی کا کرتا دھرتا کون ہے؟ ...... سیکرٹری جنرل۔ اب سیکرٹری جنرل یا تو خود بن جاتا ہے جیسے کہ خروشیف اور اس سے پہلے سٹالن رہ چکا تھا۔ سٹالن (All In All) یعنی خود مختار تھا یا خروشیف کچھ عرصہ خود مختار رہا اور اتنا مست تھا کہ وہ جب (UNO) میں گیا ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ لوگ تالیاں پیٹتے تھے اور یہ جوتا نکال کر ڈیسک کو پیٹتا تھا، یہ ایک نشۂ اقتدار ہوتا ہے۔ تو تمام دولت کھنچ کر اس کے پاس آجاتی ہے اور جب کھنچ کر آجاتی ہے تو پھر تقسیمِ دولت کا یہ رُخ ہے کہ جو کمیونسٹ پارٹی کے حامی ہونگے ان

میں تقسیم ہو گی۔

یہاں اپنے ملک میں دیکھ لیجئے کہ جو پارٹی برسرِاقتدار آ جاتی ہے، میں کسی پر حملہ نہیں کرتا لیکن حقیقت چھپائی نہیں جا سکتی، جتنے اس کو ملیں گے جو پارٹی سے متعلق ہے دوسرے کو نہیں ملیں گے۔ اسی طور پر وہاں یہ نوعیت ہے کہ میں یوگوسلاویہ گیا وہاں تیس لاکھ مسلمان تھے، دس لاکھ کے قریب تو ہجرت کر چکے ہیں، وجہ یہ کہ وہاں زمینداریاں تھیں۔ اور یہ علاقہ ۱۵۰۹ء یا ۱۵۰۳ء سے ترکوں کے زیرِاقتدار تھا، ترکوں نے وہاں بہت زیادہ زمینداریاں لے رکھی تھیں، کیمونسٹوں نے آ کر زمینداریاں ختم کر دیں، مسلمان جو زمیندار تھے اس طرح ختم ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے مسلمان ملازم تھے تو ملازمت اسے ملے جو یہ کہے کہ میں اشترا کی ہوں، کیمونسٹ ہوں۔ کمیونسٹ ہونے کا معنی یہ ہے کہ میں خدا کا منکر ہوں۔ اب خدا کا منکر ہونا جو دِل والا مسلمان ہے وہ کہاں قبول کر سکتا ہے، لہٰذا کچھ مسلمان مارے گئے، کچھ ہجرت کر گئے اور کچھ باقی رہ گئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا دِکھائی دیتا تھا، شکو تلے شہر کی بات کہہ رہا ہوں، شکو تلے میں اور سارائیگو (شہر) وغیرہ میں بھی یہی حالات ہیں، وہاں سارائیگو میں زیادہ مسلمان ہیں، شکو تلے کی یہ نوعیت ہے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں کہ کسی نے شیشے میں خون کھینچ لیا ہو، یہ نوعیت تھی مسلمانوں کی۔ ملازمت نہیں، ملازمت اسے ملے جو کہ کمیونسٹ ہو۔ اب اس کے علاوہ دوسری چیز تھی دُکانیں اور تجارت، دُکانیں ہو گئیں (Collective shops)، اب کولیکٹیو شاپس کسے ملیں؟...... جو کہ کمیونسٹ ہو۔...... اب جو کولیکٹیو شاپس بھی نہیں تو مسلمان کیا کرے؟...... تو بُرے حالات۔ میرے عرض کرنے کا مدعا

یہ ہے کہ کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ میں تمام اقتدارِ اعلیٰ مالی ہو یا سیاسی چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ جِسے بھی چاہتے ہیں نوازتے رہتے ہیں۔ چونکہ وہ آہنی پردے (Iron Curtain) کے پیچھے ہوتا ہے اس لیے باہر والوں پر اس کی حقیقت نہیں کھلتی اور ہم سوشلزم زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

اگر ہم پر کھل جائے کہ سوشلزم کی حقیقت کیا ہے! وہاں مال عام تقسیم نہیں ہوتا، یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ چند سرمایہ دار ہوتے ہیں، اور وہاں ایک بڑا سرمایہ دار (حکومت) ہوتا ہے۔ پھر اس کے نتیجے کے طور پر اخلاق باختگی آتی ہے، دِین جاتا ہے اور چیزیں بھی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں مثل ہے کہ بارش سے بھاگے تو پرنالے کے نیچے، میں کیپٹل ازم کا حامی نہیں ہوں لیکن کیپٹل ازم کے نیچے سے نکل کر اس پرنالے کے نیچے چلے جاتے ہیں جہاں اور مسائل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں کبھی کمیونزم پیدا نہیں ہوا:

اس کے مقابلے میں اسلام میں آیئے، جن چیزوں کے مفاد کو لے کر کمیونزم اُٹھتا ہے اسلام ان کا انتہائی منصفانہ اور انتہائی عادلانہ حل پیش کرتا ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دیکھیں، ہم ایسے نہیں تھے جیسے کہ آج ہیں، کبھی ہم ہی ہم تھے، دُنیا میں ہماری ہی زندگی تھی۔ یہ یورپ جو اُٹھا ہے ۱۷۰۰ء کے بعد اُٹھا ہے۔ ۱۷۰۰ء سے پہلے کہاں تھا؟ بہرکیف ہم تھے تمام دُنیا میں، اور ہمارا ایک ہزار یا گیارہ سو سال تک جو نظام جاری رہا، اور میں نے آپ کو مثالیں دیں کہ کئی نظام آئے جن کے ردِعمل کے طور پر کمیونزم پیدا ہوا لیکن اسلام میں آپ بتایئے کہیں کمیونزم پیدا ہوا؟ کسی جگہ پر، کسی ملک میں؟ جب تک اسلام کی قدریں باقی تھیں کوئی شخص کمیونزم کی آواز پر لبیک کہنے

کے لیے نہ اُٹھا، نہ کوئی کمیونزم کا داعی بنا اور نہ سوشلزم کا داعی بنا۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارا نظام ایسا عادلانہ تھا کہ غریب... غریب تر نہیں ہوتا تھا۔ میں چند چیزیں آپ کی خدمت میں عرض کر دوں جو کہ اسلامی نظام میں آجاتی ہیں، مساواتِ مالی، مساواتِ قانونی اور مساواتِ رُتبی۔ اب دیکھئے انسانوں کے اندر عمومی طور پر جاہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، کہ رُتبے میں، سٹیٹس میں فلاں اُونچا ہوگیا ہے، اسلام نے سٹیٹس کو مال پر رکھا ہی نہیں، اسلام نے کہا:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط (الحجرات:۱۳)

<u>ترجمہ</u>: ''اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔''

اسلام میں جو حضرت بلالؓ کی عزت ہے وہ ابوسفیانؓ کی عزت ہے۔ آج بھی اور اس وقت بھی، میں یوں کہوں گا کہ اسلام میں غلامی کا کہہ کر پراپگنڈہ کرتے ہیں، وقت ہوتا تو میں عرض کرتا کہ اسلام میں غلامی (Islamic Slavery) کیا ہے؟ کیا نعمت تھی! آپ کہیں گے دیوانہ ہے، غلامی کو نعمت کہہ رہا ہے۔ کیا کسی دوسری قوم میں، کسی ملک میں آپ نے دیکھا خاندانِ غلاماں، آپ کے ملک میں خاندانِ غلاماں کی حکومت رہی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

سلاطیں ہیں غلامانِ محمدؐ
غلامانِ محمدؐ ہیں سلاطیں

اسلام میں تو غلام، میں نے ''غلام'' کا لفظ اس لیے کہا کہ جاہ اور درجے کے لحاظ سے عملی طور پر کچلا ہوا عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

میرے آقا سید الانبیاء حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت کعبۃ اللہ کو فتح کیا، اِس وقت کعبہ کی چھت کی طرف دیکھنا بھی ادب کے خلاف ہے، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کہا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ جاؤ اور وہاں جا کر نعرۂ توحید یعنی اذان کہو۔ سردارانِ قریش کہنے لگے کہ کاش! آج کے دن سے پہلے ہم مرجاتے کہ قریشیوں کے ہوتے ہوئے یہ کالا کوّا کعبے کی چھت پر کھڑا ہو کر اللہ کا نام پکارتا ہے۔ درجہ دیکھئے کہ کس مقام پر غلاموں کو پہنچایا، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں کہتے تھے سَیِّدُنَا اَبُوْبَکْرٍؓ عَاتِقُ سَیِّدَنَا بِلَالؓ ﴿ابو بکرؓ ہمارے سردار نے ہمارے سردار بلالؓ کو آزاد کیا﴾ یہ مقام ہے اس طبقے کا جسے آپ انگریزوں کی اصطلاح میں (The Most Down Produt) کہتے ہیں۔ ایسے ایسے موٹے لفظوں سے ہمارے دلوں کو نیچا کرتے ہیں۔ اسلام نے جو سب سے نیچے دبی ہوئی انسانیت تھی اسے رُتبے کے لحاظ سے اتنا بلند کر دیا۔

اب قانون کے لحاظ سے دیکھئے۔ اسلام میں قانون کے لحاظ سے شاہ ہو یا گدا ہو سب برابر ہیں۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو مقام ہے آپ سب جانتے ہیں، دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جس مقام پر وہ تھے وہ مقام کون بیان کر سکتا ہے۔ ایک جج کے پاس آتے ہیں وہ جج صحابی بھی نہیں ہے ایک تابعی ہیں قاضی شریح ؒ نام ہے، ایک یہودی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس جو زرہ ہے وہ میری ہے۔ حضرت علیؓ آتے ہیں تو قاضی شریح یہ نہیں کہتے کہ امیر المؤمنین آگئے اور ان کے لیے کوئی خاص آداب برتے جائیں بلکہ قاضی جیسے یہودی کو کھڑا کرتا ہے ویسے ہی امیر المؤمنین کو بھی کھڑا کرتا ہے، اور حضرت سیدنا علیؓ فرماتے ہیں

کہ اے شریح! اگر تُو نے میری رعایت کی ہوتی تو آج کے دن کے بعد تُو اس کرسی پر نہ ہوتا۔ قاضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شہادتیں طلب کیں حضرت علیؓ نے اپنے ایک صاحبزادے اور اپنے غلام کو پیش کیا۔ قاضی صاحب نے ازروئے شریعت باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں کی اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ یہودی کے حق میں جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو یہودی باہر نکلتا ہے اور کہتا ہے کہ امیر المؤمنین آپ حق پر تھے، لہٰذا میں ایمان لاتا ہوں **اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ** ۔ اللہ اکبر، تو اسلامی عدل کا یہ حال ہے۔

قانون کے بارے میں اگر ہم یورپ کے امتیازی سلوک (Discri mination) کو دیکھیں تو کالے اور گورے کی تفریق ہے، اگر ملکۂ برطانیہ وہاں کے وزیراعظم وِلسن کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے تو برطانیہ کی بڑی سے بڑی عدالت اسے مجرم قرار نہیں دے سکتی، کیونکہ ان کے قانون میں ملکہ قانون سے بالاتر (Immune) ہے، (Law Of Immunity) کے ماتحت آتی ہے۔ جبکہ اسلام میں اگر امیر المؤمنین بھی کسی کے ساتھ ایسا ویسا معاملہ کرتے تو ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوتا ہے جیسا عام آدمی کے ساتھ۔

اسلام کا نظریۂ معاشیات:

اسلام کے نظریۂ معاشیات کے کچھ واضح ستون ہیں جنھیں ہم ذہن میں رکھ سکتے ہیں، اسلام نے مال، زمین، تمام جائدادیں، جو کچھ بھی ہے کسی انسان کی اصلاً ملکیت قرار نہیں دیا بلکہ کہا **اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ** (زمین سب اللہ کی ہے) مال سب اللہ کا ہے، یہ تمھارے پاس ایک امانت ہے، جب اللہ کی امانت ہے تو جس طور پر اللہ تمھیں

استعمال کرنے کا کہے گا ویسے کرو گے اس کے خلاف نہیں کرو گے۔ اب جب اللہ کا مال ہے تو اللہ نے اس میں غریب کا حق رکھ دیا ہے اور اس لیے قرآن کہتا ہے وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ (الانعام:۱۴۲) ﴿غریبوں کو ان کا حق دے دو، غلے کے کٹنے کے دن﴾۔ ہمارے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ شکر کرو کہ یہ فقراء تھے ورنہ تم تو ایک فریضے کی ادائیگی سے محروم رہ جاتے۔ نماز تو آپ بغیر دوسرے آدمی کے بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن کیا زکوٰۃ بغیر دوسرے آدمی کے دے سکتے ہیں؟ تو حق مقرر کر دیا غرباء کا۔ اب حق آپ کو تقسیم کرنا پڑے گا، گویا غریب کا مفاد مالدار کا دِین بنا دیا۔ یہ نکتہ یاد رکھئے گا کہ ''غریب کا مفاد مالدار کا دِین بنا دیا'' اور ایسا دِین بنا دیا کہ قرآن پاک میں جو سخت سے سخت وعیدیں آئی ہیں وہ اُن لوگوں کے لیے ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ اب زکوٰۃ ہے کیا چیز؟...... زکوٰۃ وہ چیز ہے جو کہ مال کے ارتکاز کو روکتی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ فرض کریں کہ ایک عورت کے پاس ایک کروڑ ٹن سونا ہے...... صرف تولے نہیں بلکہ ٹن ...... اور وہ اسے گردش (Circulation) میں نہیں لاتی، شاہی سرمایہ ہے۔ اب اسے رکھے رکھتی ہے تو اس پر سالانہ ڈھائی فیصد زکوٰۃ آئے گی۔ تو چالیس پچاس سال بعد بیگم صاحبہ کے پاس کیا رہ جائے گا؟...... اللہ ہی اللہ۔ تو تقسیمِ مال کی نوعیت یہ ہے کہ چالیسواں حصہ آپ کے مال کا، اور آپ کی زمین سے نکلنے والے ہر غلے کا دسواں دانہ غریب کا حق ہے، آپ کی کپاس کا ہر دسواں ریشہ غریب کا حق ہے، آپ کا جہاں کہیں بھی کوئی غلہ اُگتا ہے اس میں دسواں حصہ غریب کا ہے۔ اگر دسواں حصہ نکالو تو کیا تمہارے ملک میں کوئی غریب رہ سکتا ہے؟ آگے بڑھئے، فارن ایکسچینج جو آپ کی کپاس کماتی ہے دسواں

حصہ سب کا سب غریب کا حق ہے، آپ کے ملک میں سے جو معدنیات (Mines) سونے کی ہوں، زمرد کی ہوں، چاندی کی ہوں جس چیز کی بھی ہوں، آپ کی سوئی گیس ہے یا اور کوئی دھاتیں نکلیں ان کی آمدن کا پانچواں حصہ غریب کا حق ہے۔حکومت کا بھی حق نہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کوئی غریب رہ سکتا ہے......؟ اسی طرح خیرات ہے، صدقات ہیں، صدقۂ فطر ہے، یہ تو قانونی چیزیں ہیں۔اس کے علاوہ انفاق کے بارے میں تو یہ ہے کہ سب کچھ دے دو اور یہ سمجھو کہ میاں جو دیا ہے مقام تک پہنچ گیا۔ایک اور چیز میراث کا قانون ہے، جسے ہم چلاتے نہیں، آپ کے پاس پانچ ہزار جریب زمین ہے، اسلام میں الحمدللہ فیملی پلاننگ نہیں ہے، حق بات حق ہی ہوتی ہے چاہے کوئی خفا ہو یا خوش ہو، آپ کے پانچ بیٹے ہوئے تو آپ کی نسل میں کیا ہوا؟ ...... کہ پانچ ہزار سے ایک ہزار پر پہنچ گئے ...... پھر آگے پانچ پانچ لیجئے تو دوسو پر آگئی اور اسی طور پر کچھ دن اِدھر اُدھر اور تمام چیز ختم ہوگئی۔ اگر آپ کہیں گے کہ بھئی یہ زمانہ تو مکینکل ایگریکلچر کا ہے تو ہم کہیں گے کہ آپ تعاون کے طور پر اسے اکٹھا کر سکتے ہیں لیکن ملکیت کے لحاظ سے نہیں۔

ایک اور بات، سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد کا سب سے پہلا ستون جس پر سرمایہ داری نظام قائم ہوتا ہے سود ہے، دوسری بنیاد گیم آف دی چانسز (قمار، سٹہ بازی وغیرہ) اور تیسری چیز (Hoarding) جسے ''احتکار'' کہتے ہیں اور چوتھی چیز ناجائز منافعے وغیرہ ناجائز آمدنی کے ذرائع ہیں۔ اسلام نے سود کو حرام کردیا، سرمایہ داری کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔آج سود کو ختم کرو تو کوئی سرمایہ دار باقی رہ سکتا ہے؟ سود ختم کردیا، قمار ختم کردیا، رشوت ختم کردی، ناجائز چیزیں ختم

کر دیں، ذخیرہ اندوزی (Hoarding) کو ختم کر دیا تو آمد کے وہ ذرائع ختم ہو گئے جو سرمایہ داری کو وجود میں لاتے ہیں۔ تو اس طرح دولت، جائدادیں اور وسائل کس خوبصورتی سے تقسیم ہو گئے۔ تو اب بتائیے سوشلزم اچھا رہا یا اسلام جس میں خدا بھی ہے، آخرت بھی ہے، سب کچھ ہے۔ اسلام کو اسلام کے رُخ سے دیکھو اور یہ یقین کرو کہ یہ خدا کا دِین ہے اور خدا ہم پر رؤف ورحیم ہے، اس نے ہماری دُنیا کے بنانے کے لیے ہمیں جو اقتصادی نظام دیا ہے وہ جتنا جامع و مانع، غریب و امیر، آقا اور مولا، اور حاکم و محکوم، جملہ طبقاتِ انسانیت کے لیے اس میں جتنا فائدہ ہے وہ کسی دوسرے نظام میں نہیں ہوسکتا۔

اسلامی سوشل ازم کی اصطلاح غلط ھے:

غالباً اب آپ کے سامنے چند چیزیں آگئی ہوں گی۔ اسلام کی بنیاد، اقرارِ خدا، اقرارِ رسالت، اقرارِ آخرت اور رُوحانیت کے بنانے پر ہے اور ضمنی طور پر وہ دُنیا کے لیے ایک ایسا عادلانہ اور منصفانہ نظامِ معاش دیتا ہے جس میں نہ تو مالدار زیادہ مالدار بنتا ہے، نہ غریب زیادہ غریب ہوتا ہے بلکہ سب تقریباً قریب قریب رہتے ہیں، اور عزت کا مدار مال کو نہیں بنایا گیا اس بناء پر دولت والوں کو دیکھ کر غریب ذہنی طور پر پریشان نہیں ہوتا، آج بھی فقراء کی جو عزت آپ کی نگاہوں میں ہے میرا خیال ہے کہ بادشاہوں کی وہ عزت نہیں ہے۔ لاہور میں اگر گئے ہوں تو وہاں حضرت علی ہجویریؒ بھی دفن ہیں اور وہاں قطب الدّین ایبک بھی دفن ہے جو یہاں ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا رکن رکین اور بنیاد تھا، ایک دوسرے بادشاہ جہانگیر بھی ہیں، میں بُرا نہیں کہتا وہ بھی سلاطین تھے، غازی تھے، سب کچھ تھے

لیکن ان کے مزاروں پر کتنا جمگھٹا ہوتا ہے اور حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر کتنا ہوتا ہے! ہمارے ہاں تو فقر میں جو عزت ہے اس کے متعلق اقبال کہتا ہے ؎

حیف کہ کھو یا گیا تجھ سے فقیری کا راز

ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم وشام

ہمارے ہاں ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں ارشاد فرمایا '' المال فخری'' بلکہ یوں کہا'' الفقر فخری''۔ یہ تو ہوئی ہماری بنیاد۔ اس کے مقابلے میں اشتراکیت کی بنیاد انکارِ خدا، انکارِ آخرت، اور واحد مقصد پیٹ اور اخلاقی اقدار کے انکار پر ہے۔ سوشل ازم میں تو مزدورں کو دینے کے نام پر لوٹا کھسوٹا جاتا ہے، آپ کسی مالدار کا مال کمیونزم میں یا سوشلزم میں آکر اس کی دل کی رضا مندی سے نہیں لیں گے۔ اسلام میں امیر عبادت سمجھ کر غریب کو دے گا۔ سوشل ازم میں امیر سے زبردستی چھین لیا جائے گا اور وہ بھی پھر ایک ایسے (Central Pool) میں آجائے گا جس کا حاکم خودمختار ہوگا، وہ جسے چاہے گا دے گا جسے چاہے گا نہیں دے گا۔ اقبال کہتا ہے ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

دل اسلام، یا شکم سوشلزم اِسے لیتے ہیں یا اُسے لیتے ہیں۔ مختصر معنی یہ ہوئے کہ اسلام کے ساتھ کسی دوسرے اِزم کا پیوند نہیں لگ سکتا، اسلامی سوشلزم کی اصطلاح معناً بھی غلط ہے، حقیقتاً بھی غلط ہے اور لفظاً بھی غلط ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

قومی تعمیرِ نو میں مذہب کی اہمیت

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ جس کی بنیاد اِسلام کے اِس جامع اور عالمگیر نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ دینِ اِسلام ہی انسانوں کے دینی و دُنیاوی، تمام مسائل کے حل اور ضرورتوں کا کفیل ہے۔ بانیانِ پاکستان قائدِ اعظم مرحوم، لیاقت علی خان مرحوم اور دیگر زعماءِ مسلم لیگ پاکستان کی جدوجہد میں اسی نظریہ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور اِسی کی بُنیاد پر اسلامیانِ ہندو پاک نے اپنی اُمنگیں اور اُمیدیں اِس خطہء زمین کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں، جس کا نام پاکستان تھا اور جس میں بقول شہید مِلت لیاقت علی خان مرحوم اِسلامی نظریۂ حیات کو عملی طور پر رائج کرنا اور اسے اِسلامی نظامِ حیات کی تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا۔ قائدِ اعظم نے اپنے کئی بیانوں میں اِس بات کو واضح فرما دیا تھا کہ قُرآن ہی مسلمانوں کا واحد ضابطہء حیات ہے، جس میں ان کی آئینی، قانونی مجلسی، معاشی، معاشرتی غرض زندگی کے ہر ایک پہلو کا کامیاب حل موجود ہے۔ یاددہانی کے طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

قائدِ اعظم نے نومبر ۱۹۳۹ء عید الفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ”مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآنِ پاک کو غور سے پڑھیں اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔“

گاندھی کو اگست ۱۹۴٤ء میں لکھتے ہیں :

''قرآن مسلمانوں کا ضابطہ ءحیات ہے اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رُسوم سے لے کر روزانہ اُمورِ حیات تک، رُوح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لے کر انسدادِ جرائم تک، زندگی میں جزا اور سزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک ہر ایک فعل، قول اور حرکت پر احکام کا مکمل مجموعہ ہے لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں تو حیات و ما بعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔''

ستمبر ۱۹۴۵ء کے پیغامِ عید میں فرمایا:

''ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادت اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں بلکہ قرآنِ کریم سب مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانونِ حیات ہے یعنی مذہبی، معاشرتی، تمدنی، تجارتی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔''

۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:

''رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کی عظیم الشان شریعت موجود ہے... اسلام ہر شخص سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجا لائے۔''

آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۱۹۴۳ء کی صدارتی تقریر میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

''مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ میں پاکستان کا طرزِ حکومت تعین کرنے والا کون! یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے

اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآنِ حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے۔''

تقسیم سے پیشتر شہید ملّت لیاقت علی خان مرحوم نے جلسۂ تقسیمِ اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے سامنے ایک نہایت اہم سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ تم کس نظام کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی آئندہ زندگی اسلامی طور وطریق اور آئین وقوانین کے بموجب بسر کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو ایک آزاد اور خودمختار سلطنت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام زندگی کیا ہے اور کِن اُصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان کے پیشِ نظر اس مقصدِ حیات کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو برس قبل دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغامِ الٰہی لے کر تشریف لائے تھے اب وہ ہمارے پاس ہے۔ اور وہ دُنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف میں اب بھی بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ہر مسلمان کا دین وایمان ہے کہ اُسکی موت وحیات سب اللہ ہی کے لئے وقف ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے اور وہ ہی ہمارا حُکمران ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی بھی حکومت کرتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے حکومت کرتا ہے کیونکہ تمام حاکمیت اور طاقت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ اسلامی نظام زندگی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعی طور پر وہ اس دُنیا میں عمل

پذیر رہ چکا ہے اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔‘‘

ان زعماءِ ملت کے یہ واضح اعلانات حقیقتاً اس سچائی پر مبنی تھے کہ اُمتِ محمدیہ مرحومہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے اور یہ لافانی اور بے مثال اُمت ہے، اپنے قوام و تشکیل مِلّی میں صرف اس اندرونی یقین واعتقاد و جذبۂ وحدت کی محتاج ہے جسے ’’ایمان‘‘ کہتے ہیں۔ اُمتِ محمدیہ کا مزاج سراسر دین پر قائم ہے، اگر اس کے دینی مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی تو یہ ملّت من حیث الامت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قومیں رنگ ونسل، وطن وزبان کی بُنیادوں پر تشکیل پاتی ہیں لیکن اسلام ان میں سے کسی بُنیاد کو اصل قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سب کی تخریب کے بعد اس مابعدالطبیعاتی جذبۂ ملّی پر’’اُمت‘‘ کی تشکیل کرتا ہے جسے’’دین‘‘ کہتے ہیں۔ اسلام وہ قوی رشتہ ہے جو مختلف قوموں، رنگوں اور نسلوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ صہیبؓ رومی ہوں یا بلالؓ حبشی، سلمانؓ فارسی ہوں یا ابو بکرؓ قرشی سب ایک ہی ملّتِ واحدہ کے محترم افراد ہیں۔ ان کی’’اسلامیت‘‘ نے رنگ ونسل کے تمام بندھنوں کو توڑ دیا۔ پولیٹکل سائنٹسٹ موسیو رینان فرنساوی نے کہا ہے:’’قومیت وہ جذبۂ اشتراک ہے جو مختلف افراد کو ایک لڑی میں پرو کر اُنہیں مقاصدِ حیات کی یکجہتی عطا کرتا ہے۔‘‘

اسلام مسلمانوں میں عشقِ الٰہی ومحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا والہانہ جذبہ پیدا کر کے اس داعیۂ اشتراک کو جنم دیتا ہے جو عقائد و مقاصد کی یکجہتی میں مختلف ملکوں اور مختلف نسلوں اور مختلف رنگوں اور مختلف طبقات کے انسانوں کو اکھٹا کر دیتا ہے۔ یہ رشتۂ روحانی، نسلی رشتہ سے برتر وقوی تر ہے۔ چُنانچہ مفسرین امام رازی وامام بغوی

وغیرہ نے شواہد سے اس حقیقت کو واضح و مبرہن کیا ہے۔ بقول جامیؔ:

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ترجمہ: جامی تو عشق کا بندہ بنا اس لیے نسب پر فخر ترک کر کیونکہ اس راہ میں کسی کا بیٹا ہونا کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی جذبۂ ملی کے ایک سرشار حضرت سلمان فارسیؓ نے ''اسلامی قومیت'' کی بُنیاد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ابی الاسلام لا اب سواہ

اذا فتخرو ابقیس و تمیم

''میرے باپ کا نام اسلام ہے، اسلام کے سوا میرا کوئی باپ نہیں، لوگ قیس و تمیم کے قبیلوں پر فخر کرتے ہیں (اور میں ''مسلم'' ہونے پر فخر کرتا ہوں)''

اسلام ملّتِ مسلمہ کا اجتماعی نفسِ ناطقہ ہے۔ اگر اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ ملت کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوگا تو یہ اُمت پھلتی پھُولتی رہے گی اور جس قدر یہ جذبہ کم ہوتا چلا جائے گا، اس پر اضمحلال و زوال کے آثار طاری ہوتے جائیں گے۔ حکیم شاعر اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے

جب سر میں ہوائے طاعت تھی، سرسبز شجر اُمید کا تھا

جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

غرض اُمتِ محمدیہ ﷺ اپنے قوام و مزاج میں جُملہ امم و مللِ انسانیہ سے جُداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ دین و مذہب کے بغیر اس کا ملی تشخص قطعًا ختم ہو جاتا

ہے۔اقبال نے سچ کہا ہے۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمیعت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے محکم ہے جمیعت تری
دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمیعت کہاں
اور جمیعت ہوئی رُخصت تو ملت بھی گئی

بہر حال اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد مذہب یعنی اسلام کی اہمیت پاکستان کی تعمیر نو میں ظاہر و باہر ہو جاتی ہے۔ ہر وہ نظامِ زندگی یا طریقۂ کار جو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نہیں ہوگا، پاکستانی ملّت کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکے گا۔ اِس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

ا) پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کا وجود اسلامی نظریۂ حیات کا مرہونِ منت ہے۔ جسے تحریکِ پاکستان کا ہر واقف کار جانتا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی نظریاتی مملکت اپنے بُنیادی نظریہ کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ جیسے کوئی سوشلسٹ مملکت سوشلزم کے نظریہ کو پسِ پُشت ڈال کر اپنی نظریاتی حقیقت کو گُم کر دیتی ہے، اسی طرح مملکتِ پاکستان اگر اپنے آپ کو اسلامی نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی، تو وہ نہ صرف اپنے نظریاتی وجود کو کھو دے گی بلکہ اُسکا اپنا وجود وتشخص اور'' نام'' بھی (خاکم بدہن) مِٹ کر رہ جائے گا۔ وہ ممالک اور قومیں جو وطنیت، رنگ اور نسل پر قائم ہیں وہ اگر کسی نظریہ کو قبول یا ترک کر

دیں تو اُنکی وطنی، لونی اور نسلی انفرادیت باقی رہ سکتی ہے۔لیکن اگر پاکستان اسلامی نظریۂ حیات سے دست کش ہو جائے تو اس کے ہاتھ سے وہ رشتہ ہی نکل جائے گا جس نے باشندگانِ پاکستان کو'' پاکستانی'' بنایا ہے، اور بنگالی، بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور مہاجر کو ایک اُمت کا فرد بنایا ہے۔غرض پاکستانی قومیت و وطنیت بلکہ اس کا نام اسلامی نظریۂ حیات سے باقی و قائم ہے۔اس لئے پاکستان کی تعمیرِ نو کا تصّور بھی مذہب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ قدم جو پاکستان میں اسلام کے خلاف اُٹھے گا مُلک کو مشکلات سے دوچار کر دے گا۔

۲) دوسری وجہ: ہر قوم کا خاص مزاج ہوتا ہے۔جس کی بُنیاد وہ بُنیادی عقائد و نظریات اور رسُوم و رواج ہوتے ہیں جس میں وہ قوم دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے، اُمتِ محمد یہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بہر حال'' مذہبی'' واقع ہوئی ہے۔ جو اسلام کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کر سکتی اور اس کا اجتماعی مزاج کسی ایسی چیز کو ہضم نہیں کر سکتا جو اسلام کے مخالف ہو۔

ملّتِ پاکستانیہ کا ملی شعور دائمی طور پر کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کر سکتا جو مذہب کے خلاف ہو۔اس وجہ سے قوم کے مذہبی مزاج کو نظر انداز کر کے کوئی چیز ملّت کو تعمیر کی راہ پر نہیں ڈال سکتی۔

اِن دو اہم بُنیادوں کے بیان کے بعد چند حقائق کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

حضرات! اسلام نِرا نظریہ ہی نہیں بلکہ بقول قائدِ اعظم'' ایک مکمل اور عملی ضابطۂ حیات ہے۔'' دوسرے مذاہب عملی زندگی میں آکر شکست کھا سکتے ہیں لیکن

اسلام کا آئین وقانون، نظامِ حیات و دستورِ مملکت چودہ سو سال تک عملی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے۔ اس میں ہر زمانے کے چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام کا خُدائی و عادلانہ نظامِ حیات دُکھی انسانیت کے لئے واحد پیامِ نجات ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل بھی صرف اسلام ہے۔ جس کے بغیر ہمارا ہر مسئلہ مزید اُلجھتا جائے گا۔ آج پاکستان کی ''وحدت کا راز'' مختلف لسانی و علاقائی وحدتوں کو ایک ''ملت'' کی حیثیت سے مضبوط کرنے میں ہے۔ یہ بات واشگاف لفظوں میں کہی جا سکتی ہے کہ تعمیرِ نو میں اگر اسلام کے ''جذبۂ ملی'' کو زندہ و باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور ''مذہبی وحدت وحمیت'' کی آبیاری نہ کی گئی تو خُدانخواستہ اس پھُول کی مختلف پتیاں بکھر کر رہ جائیں گی جس کا سب سے بڑا ثبوت سقُوطِ مشرقی پاکستان کا دردناک سانحہ ہے۔ اگر ہم نے اپنے دینی مزاج اور مذہبی یک جہتی کو پروان چڑھایا ہوتا تو آج یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان کے مختلف خطّوں اور لسانی و ثقافتی وحدتوں کے جوڑنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس نمایاں حقیقت کے بعد تعمیرِ نو میں مذہب کی اہمیت بلکہ سبقت و فوقیت اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ناہمواریوں سے معاشرہ میں زلزلہ آ گیا ہے اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کا ایسا طوفان برپا ہے جس سے مُلک کی چُولیں تک ہل گئی ہیں۔ ہمیں یہ بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پاکستانی بلکہ انسانی معاشی مسائل کا حل صرف اسلام کی لافانی تعلیمات میں ہے۔ اسلام کا نظام معاش، سرمایہ داری کی قارونیت (Capitalism) اور مزدکیت واشتراکیت واشتمالیت (Socialism) کی طبقاتی چپقلش کو بیک وقت ختم کر دیتا ہے۔ اسلام نے معاشی ناہمواریوں کا علاج

جس عدل و انصاف سے کیا ہے انسانی خود ساختہ نظام اس کا پر کاہ بھی نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک طرف نجی ملکیت اور انفرادی عملِ پیدائش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو دوسری طرف تقسیمِ دولت کی اُن راہوں کو وجود بخشتا ہے جن سے دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں نہیں رہتی بلکہ ہر شخص کی ضروریاتِ اربعہ (مکان، خوراک، پوشاک اور تعلیم) کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی اور مواسات، بھُوک و افلاس کو معاشرہ سے ختم کر دیتی ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں، ورنہ بتایا جاتا کہ ناجائز پیداوارِ دولت کے ذرائع سُود، قمار، احتکار، حرام آمدنیوں کو، جن کی کوکھ سے منحوس سرمایہ داری نے جنم لیا ہے، اسلام نے کس طرح حرام قرار دیا ہے، اور آمدنی کے وہ ذرائع جو دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں پہنچا دیتے ہیں، انہیں کیسے ختم کیا ہے۔ جو دولت کسی کے پاس جمع ہے اُسے معاشرہ میں منتقل کرنے کے لئے زکوٰۃ و عشر، خمس و صدقات، میراث کے لازمی احکام صادر فرمائے۔ مزید برآں خیرات، صلہ رحمی، غریبوں کی غمگساری و مدد وغیرہ کی مُستقل خیراتی مدیں قائم کیں۔ امیروں کے مال میں ناداروں کا ''حصّہ وحق'' شرعی حدود کے اندر مقرر کیا۔

ناداروں کے مفاد کو مالداروں کا دِین قرار دیا اور مالداروں کے حقوق کا پُورا کرنا ناداروں کی دِینی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اسلامی معاشی نظریہ کی جان ہر طبقہ کی ضروریات کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی و مواسات، مواخاۃ و محبت پر ہے۔ اسلامی معاشی نظریہ انسانوں میں طبقاتی تفریق و منافرت نہیں پیدا کرتا بلکہ ہر طبقہ کو اپنے دائرہ عمل میں افزائشِ دولت کے اسباب مہیا کرنے کے ساتھ اُن میں ایسی باہمی ہم آہنگی اور جوڑ پیدا کرتا ہے جہاں حسد و رقابت کی بجائے محبت و تعاون

کی فضا قائم ہوتی ہے۔ اسلام میں گو مساوات مالی نہیں لیکن مساوات رُتبی اور مساوات قانونی موجود ہے۔مجلسی رُتبہ میں مال و جائداد کی اضافی قدروں کونہیں دیکھا جاتا بلکہ اخلاق واعمال کی بُلندی ''سرفرازی'' کا واحد معیار ہے۔اسلام میں ملک و جائداد وجاہ معیار فضیلت نہیں، بلکہ علم وتقویٰ اوراخلاق واعمال معیار ہیں۔ ایک غیور دین دار صاحبِ صلاح وتقویٰ مزدُور ایک کروڑ پتی بداعمال سیٹھ سے اسلامؒ کی نگاہ میں اُونچا ہے۔اسی طرح قانون کی نگاہ میں آقا و غلام، شاہ وگدا سب برابر ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اگر دیانتداری سے نافذ کر دیا جائے تو ایک ایسا ہموار معاشرہ پیدا ہو جائیگا جہاں تمام طبقات، باہمی محبت وسلوک وحقوق کی ادائیگی، خدمت اورموانست کی زندگی گذار سکیں گے۔ جہاں آقا و غلام کی تمیز نہیں ہوگی اور جہاں ہر شخص خوشحالی، فارغ البالی اورفراوانی کی زندگی گذار رہا ہوگا۔حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلام کی وسیع سلطنت میں کوئی زکوٰۃ قبول کرنے کے لائق محتاج نہیں رہا تھا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سلطنت میں جو موجودہ پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لے کر بحرِ اٹلانٹک تک اور دیوارِ چین سے لیکر وسطِ افریقہ اور اُندلس تک پھیلی ہوئی تھی کوئی نادار ایسا نہ ملتا تھا جسے زکوٰۃ وخیرات دی جا سکے۔ یہ اسلامی معاشی نظام کی برکت تھی کہ جب تک مسلمانوں میں اسلامی اقدار کا پاس رہا طبقاتی منافرت اور مالی حرص وآز کا جہنم وجود میں نہ آسکا۔اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشی مسائل کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ ہم اپنی معاشی تعمیر نو صرف مذہب کے بتائے ہوئے خالص الٰہی اُصولوں اوراحکام کے مطابق کر

سکتے ہیں، ورنہ ہر قدم مزید اُلجھنوں کا سبب بنتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بابائے ملّت قائدِ اعظم کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو اُنہوں نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی بُنیاد رکھتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری پبلک تقریر میں فرمائے تھے۔

''مغرب کے اقتصادی اُصول ہمارے لئے عبرت آموز ہیں، جن کی وجہ سے آج دُنیا بُحران کا شکار ہے۔ آپ کے تحقیقی ادارے کو چاہئے کہ وہ اسلامی نظریات پر سماجی اور اقتصادی زندگی کی بُنیاد رکھے ۔ ایک خوشحال اور مطمئن معاشرے کے لئے مغربی اُصول کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو ایک نئے طریقِ کار کو اپنانا چاہیے۔ جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اُصولوں پر مبنی ہو۔''

ملک میں جرائم کا جو رُجحان اور لاقانونیت کا میلان پیدا ہو رہا ہے، اس کا علاج مذہبی قوانین اور اسلامی شریعت کا نفاذ و اجراء ہے۔ اسلامی قانون و شریعت کے منافع اور اسلامی نظریۂ عدل پر اس مختصر وقت میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم یہ بات ببانگِ دہل عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانی خود ساختہ قوانین کبھی عادلانہ نہیں ہوسکتے، نہ انصاف کے تقاضوں کو کماحقہ پورا کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی جمعیت و طبقہ کے مخصوص رُجحانات و میلانات، تقاضے و مفادات ہوتے ہیں، جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیۃً کبھی مبرّا نہیں ہوسکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالسِ مقنّنہ کی روزانہ کی کاروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ رسی پر شاہدِ عدل ہیں۔ ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے اور وہ

طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے، قانون سازی میں اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر انصاف اُنکی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اُسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آمریت اور فاشزم میں شخص واحد کی انانیت، قانون قومی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر سرمایہ دار سرمایہ دار کی بے جا حمایت کرتا ہے تو کمیونسٹ ''مزدور وکسان'' کی حدود سے بڑھکر رعایت کرتے ہیں۔ قانون تو وہی عادلانہ ہوگا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو، ملکی رُحجان نہ ہو، نسلی میلان نہ ہو، لوئی (رنگ کا) پاس نہ ہو، علاقائی لحاظ نہ ہو، وطنی مفاد نہ ہو، طبقاتی عصبیت نہ ہو، غیر سے مخاصمت نہ ہو، اپنے کی حمایت نہ ہو، کُنبہ پروری نہ ہو، دوست نوازی نہ ہو، ''مفاداتِ خاصہ'' کی ناجائز نگرانی نہ ہو، قانون سازی میں مال وجاہ کی طلب نہ ہو اور مدح وذم کی پرواہ نہ ہو۔

غرض تمام مفادات سے بالا ہوکر اور ہر ''رُحجان'' سے ''تہی خاطر'' وخالی دماغ ہوکر محض عدل وانصاف کی بقا کے لئے قانون بنائے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ تو اُس ذات کا کام ہے جو سب تعلقات سے بَری نہ کسی کا بیٹا، نہ کسی کا باپ، نہ کسی کا رشتہ دار ہو، ہر انفعال سے پاک ہو، خوف ورعایت سے مبّرا ہو، نسلی ولونی (رنگ)، ملکی وطنی بندشوں سے پاک ہو۔ اور وہ ذات انسان کے غوامض و اندروں (Deep Insight) اور اس کی جملہ ضروریاتِ انفرادی واجتماعی سے کلیۃً واقف ہو۔ عالم السرائر اور مستقبل کے جملہ کوائف وواقعات، حوادث وضروریات کے جاننے والی ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ جو قانون دے گا، وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و

احوال کو جان کر دے گا۔جس میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی، نہ کسی کا ''خوف'' عدل میں مانع آیا ہوگا۔ وہ ہر ذاتی مفاد سے خالی محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لئے دیا جائے گا، اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا، اس میں استحصال و جبر کے چور دروازے نہیں ہونگے۔اقبال نے بھی قانونِ الٰہی اور'' قانونِ غیر'' کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

وحی حق بینندۂ سودِ ہمه
در نگاہش سود و بہبودِ ہمه
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لا یراعیٰ لا یخاف
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نه بیند سودِ غیر
غیرِ حق چو ناہی و آمر شود
زورور بر ناتواں قاهر شود
حاصلِ آئین و دستور ملوك
ده خدایاں فربه و دہقاں چوں دوك

ترجمہ: ا۔ ''وحی حق (یعنی قرآن) سب کے فائدے اور مفاد کو دیکھتی ہے۔وحی حق پر مبنی نظام الٰہی میں تمام مخلوقات کے مفادات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔''

۲۔ ''وحی حق صلح اور جنگ دونوں حالتوں میں عدل کے دامن کو تھامے رکھتی ہے۔نہ تو دوستی میں ناجائز رعایت کی روادار ہوتی ہے اور نہ دشمنی میں کسی غیر اللہ سے خوفزدہ ہوتا ہے۔''

۳۔ ''خود بین عقل اپنے علاوہ کسی دوسرے کے مفاد کا خیال نہیں رکھتی، وہ صرف اپنے

فائدے کو پیش نظر رکھتی ہے نہ کہ کسی دوسرے کا۔"

۴۔ "جب غیر حق نظام کا علمبردار، حکمران بن جاتا ہے (تو اس کی حکمرانی میں) طاقتور کمزور پر غالب رہتا ہے۔"

۵۔ "نظام ملوکیت کے آئین کا خلاصہ یہ ہے کہ سرمایہ دار، جاگیردار موٹا اور طاقتور ہوتا ہے جبکہ دہقان، کسان، مزدور تکلے (باریک لوہے کی تار) کی طرح کمزور، نحیف اور ناتواں ہوتا ہے۔"

غرض ملک میں عدل وانصاف کا چلن صرف اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہو سکتا ہے۔ تعمیر نو میں مذہبی قانون کے نفاذ کی اس وجہ سے بھی ضرورت ہے کہ "قانون" کی بالادستی کا تصور احترامِ قانون پر مبنی ہے، اور وہ قانون صرف "خدائی قانون" ہی ہے، جسے پاکستان کے مسلمان غیر شعوری طور پر بھی مقدس مانتے ہیں۔ قانونِ اسلامی کے جملہ فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں، تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ دو باتیں بھی تعمیر نو کے علم برداروں کی نگاہوں کے لئے کافی ہونگی۔

طوفانِ اشک لانے سے اے چشم فائدہ!
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اس ضمن میں ایک اور بُنیادی مسئلہ "قومی اخلاق" کی بقا و تعمیر کا ہے۔ آج ملک میں بد دیانتی، رشوت، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، بے حیائی، ظلم وزیادتی کے جو بیشمار واقعات ہو رہے ہیں، ان کا علاج بھی اسلامی قانون کا اجراء اور اخلاق کو مذہب کی گرفت میں دینا ہے۔

چوتھا بڑا مسئلہ نژادِ نو کو اسلامی مزاج پر قائم رکھنا ہے۔ جیسے کہ عرض کر چکا

ہوں ،مسلمان اور اہلِ پاکستان کوئی نسلی اور وطنی قومیت و ملک نہیں بلکہ ان کا وجود و بقا صرف اسلام سے وابستہ ہے ۔نئی پود جس طرح اسلامی عقائد و اعمال سے عاری اور مذہبی اقدار سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے وہ ایک نامعلوم عالمگیر ارتداد سے کم نہیں ۔ اس ہمہ گیر غفلت کا نتیجہ پاکستان اور نظریۂ پاکستان کی تباہی پر منتج ہوسکتا ہے ۔اسلئے وقت کی سب سے بڑی پکار ہے کہ ہم ہر پاکستانی کو عموماً اور نئی پود کو خصوصاً اسلام کے لافانی اور بے مثال دین واقدار سے آگاہ اور اس پر عمل پیرا کرنے کی کوشش کریں ۔ اسکے لئے ہمیں اپنے پورے تعلیمی و تربیتی نظام کو ہر سطح پر اسلامی تعلیمات و مزاج کے مطابق بنانا ہوگا ۔آج تک ہم نے اپنے تعلیمی نظام میں کوئی اہم اور بُنیادی تبدیلی نہیں کی ۔انگریز نے اپنے استعماری مفادات کے لئے جس نظامِ تعلیم کو رائج کیا تھا، اسی تقویم پارینہ کو ہم آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں اور اسی صد چاک قبا پر پیوند در پیوند لگاتے جاتے ہیں ۔ جب تک نظامِ تعلیم میں بُنیادی اُصولی اور اجتہادی تبدیلیاں (جو اسے ہر سطح پر اسلامی مزاج سے ہم آہنگ کر دیں) نہیں کی جائیں گی ملّتِ پاکستانیہ کا بحیثیتِ مسلمان کے باقی رہنا خام خیالی اور فریبِ نفس ہے ۔اس سلسلے میں سرکاری ملازمین اور عام اہل کاروں کی دینی تربیت کا مسئلہ ہے ۔کسی ملک کی تعمیر میں سرکاری ملازمین کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔آج تک ہمارے ہاں یہ طبقہ الاّ ماشاءاللہ انگریز کے بتائے ہوئے پیش پا افتادہ راستے پر گامزن ہے ۔شخصی مفاد قومی مفاد پر غالب آجاتا ہے اور '' دیانت و امانت '' کے مقدس قلعہ میں '' خوف و لالچ '' سے رَخنے پڑ جاتے ہیں ،جس کا نتیجہ وہ ہمہ گیر خرابیاں ہیں جن سے ہر شخص نالاں ہے ۔ضرورت ہے کہ سرکاری ملازمین کی تربیت میں اسلامی اقدار کو اس طرح سمو دیا

جائے کہ خوفِ خدا اور تقوی اُنہیں ہر غلط جنبشِ قلم اور لغزشِ قدم سے روک دے۔ خشیتِ الٰہی ''رشوت و ناجائز آمدنی'' کے بارے میں ان کے ہاتھوں کو شل کر دے اور کسی کا خوف و دہشت ،حق گوئی اور جائز دادرسی میں مانع نہ آئے۔اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی اور مخلوق کے سامنے شرمندگی کا تصور ان پر اسطرح مستولی ہو کہ وہ قومی ،ملکی اور پبلک مفادات کو کسی صورت میں پسِ پشت ڈالنے کی جرأت و ہمت نہ کرسکیں۔ان کی زندگی کا مقصد رضائے حق کے حصول کے لئے خدمتِ خلق ہو۔یہ بات تبھی پیدا ہوسکتی ہے جب ہم اپنی اعلیٰ سروسوں سے لے کر ادنیٰ ملازمتوں تک دینی ذہن و مزاج کو عام کر دیں ،اور اسلامی نظریہ کے مطابق ملازمین محض خدمتِ خلق اور ادائیگی حقوق کو اپنا فریضہ سمجھیں۔آج حقوق طلبی کی فضا نے ملک کی بُنیادیں ہلا دی ہیں۔اس مشکل کا حل ''حقوق رسانی اور ادائیگی حقوق'' کے اسلامی جذبہ ہی سے ہوسکتا ہے۔غرض سرکاری ملازمین کے بارے میں جو آج ہنگامہ برپا ہے، اسکا علاج صرف مذہبی تربیت اور اسلامی ذہن ہی کرسکتا ہے۔اسی طرح ہماری شیر دل افواج کی ہمت و جرأت اسلامی جذبۂ شجاعت اور ولولہ شہادت کا ثمرہ ہے۔

اس مختصر وقت میں گنجائش نہیں کہ ''قومی تعمیرِ نو میں مذہب کی اہمیت'' کے تمام پہلوؤں پر مختصر گفتگو بھی کی جاسکے۔ تاہم آخر میں ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں، وہ اپنے ''ذرائع ابلاغ'' کو ''اسلامیانا'' (Islamization) ہے۔آج ہمارے قومی کردار و اخلاق کی تعمیر و تخریب میں ریڈیو، اخبار و رسائل وغیرہ جو اہم حصّہ ادا کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔عمومی ذہن پر ان کا اثر جتنا دُور رس اور نتیجہ خیز ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ضرورت

ہے کہ جملہ ''ذرائع ابلاغ'' کو مذہبی حدود و قیود کا پابند اور خالص اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کے پرچار کا ذریعہ بنایا جائے۔ کسی نظریاتی مملکت کی تعمیر نو اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام دروازوں پر سنگین پہرہ بٹھایا جائے جہاں سے نظریہ کی تخریب کا اندیشہ ہو۔

پاکستان اور اس کے باشندے ایک درخشندہ مستقبل سے اسی صورت میں ہمکنار ہو سکتے ہیں کہ ہماری تعمیر نو کی بُنیاد اسلامی زرّیں تعلیمات اور مذہب کے تابندہ و روشن احکام پر استوار کی جائے۔

غرض پاکستان کی بقا و ترقی تمامتر ''مذہب'' پر مبنی ہے۔ اسلئے ہمیں اپنی تعمیر نو کے خاکہ میں سراسر اسلامی رنگ بھرنے کی ضرورت ہے، تاکہ پاکستان ایک مضبوط مملکت بن سکے اور پاکستانی ملّت ایک پُرشکوہ عظیم اور مثالی اُمت کی حیثیت سے دُنیا میں اُبھر سکے اور آخرت میں بھی سُرخرو ہو سکے، تاکہ اسکے قیام کا اصل مقصد پورا ہو، اور پاکستان اسلامی تہذیب و تمدن، قانون، عدل و انصاف اور معاشی ہمواری اور معاشرتی زیبائی کا ''دیرینہ'' نظارہ دُنیا کو دِکھا سکے۔

اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے اور ''تعمیر نو'' کے ناخُداؤں اور ملّت کے رہنماؤں کو توفیق بخشے کہ پاکستان کی تعمیر نو اسلام کی عظیم تعلیمات کے مطابق کر سکیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆☆☆☆☆

عبدیت کی جامعیت

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ ط

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ۔ (البقرہ۔۲۱)

ترجمہ: ''لوگو! بندگی کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔''

یہاں آپ ایک بات کو دیکھئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُم

ترجمہ: ''بندگی کرو اپنے پروردگار کی تا کہ تم متقی بن جاؤ''

اب یہاں گویا کہ بندگی کا حاصل تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بندگی مقصدِ آفرینشِ انسانیت ہے۔ انسان کے پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ ...... بندگی ہے۔ ...... اور کس رخ سے بندگی؟ ...... اسلام کے نزدیک بندگی صرف چند تعبدی اعمال (عبادت والے اعمال) کا نام نہیں جنھیں کہ ہم عبادت یعنی کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بیشک عبادت کے بڑے عنوان یہی ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ لیکن اسلام نے صرف ان عبادات میں عبدیت کو محدود نہیں کر دیا بلکہ انسان کا ہر فعل جو اللہ کی رضا کے لیے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو وہ عبدیت ہو گا اور بندگی ہو گی۔ یعنی اسلام کی

جامعیت میں بندگی کے جملہ گوشوں کو ایک لفظ کے اندر سمیٹ دیا جسے اس نے عبدیت قرار دیا۔ جب چاہتِ نفس مٹ جائے اور خدا کی چاہت انسان کے اندر رسوخ کر جائے اور انسان کے اندر جذبۂ نفسانی مٹ کر جذبۂ رحمانی پیدا ہو جائے اسے ربّانیت کہتے ہیں۔ اب ربانیت کے نتیجے کے طور پر جتنے بھی اعمال ہوں گے وہ سب کے سب عبادت کہلائیں گے اور وہ شخص ربّانی کہلائے گا، اللہ کا ولی کہلائے گا۔ اصل میں اسلام نے ہمیں فکر کی تبدیلی کی دعوت دی ہے اور نری فکر کی تبدیلی کی دعوت پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ زندگی کی تبدیلی کی بھی دعوت دی۔ اور زندگی کی تبدیلی کی دعوت میں صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ ہمارے ذاتی اور شخصی ظاہری اعمال بدل جائیں بلکہ اس نے ذاتی ظاہری اعمال کے بدلنے پر بھی زور دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے یوں کہا کہ ہمارے باطنی اعمال بھی خدا والے رُخ پر آ جائیں۔ اگر ہمارا ظاہر سنورتا ہے تو اس سے بڑھ کر ہمارا باطن سنور جائے۔ میرے آقا سید الانبیاء حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَرِیرَتِیْ خَیْرًا مِنْ عَلَا نِیَتِیْ وَاجْعَلْ عَلَانِیَتِیْ صَالِحَۃً (ترمذی)

ترجمہ: ''اے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بھی زیادہ اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو بھی نیک کر دے۔''

یعنی ظاہر بھی اچھا ہو اور باطن اس سے زیادہ اچھا ہو۔ اسلام نے ظاہر اور باطن دونوں کی نوعیت سے اعمال کو بدلنے کی کوشش کی، کہ ہم ظاہراً بھی شریعت پر ہوں اور باطناً بھی احوالِ نبوت پر ہوں۔ اسی طور پر اس نے یہاں صرف انفرادی

اعمال پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام نے یوں چاہا کہ ہماری زندگی نہ صرف انفرادی گوشوں میں بلکہ جملہ اجتماعی گوشوں میں بھی عبدیت کے رُخ پر آ جائے۔ یعنی ہم اگر عدالت میں ہوں تو ہمارا عدل خدا کے حکم کے مطابق ہو اور حقیقت یہ ہے کہ عدل وہی ہوا کرتا ہے جو خدا کے احکام کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی انسان کا بنایا ہوا قانون، کسی انسان کا بنایا ہوا آئین، اسے ہزار عدل کہتے رہیں اسلام کی نگاہ میں وہ ظلم و کفر ہے کیونکہ صرف خدا کی ذات کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ کسی کی رعایت نہ کرتے ہوئے تمام انسانیت کے مفادات کو سامنے رکھ کر تمام طبقاتِ انسانیہ کے مفادات کو سامنے رکھ کر قانون بنائے اور قانون دے۔ لہٰذا عدلِ حقیقی صرف خدا کا قانون ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم یوں کہتے ہیں کہ عدالت میں بیٹھ کر جب کوئی قاضی شریعت کے مطابق فیصلہ کرے اس وقت اس کا فیصلہ کرنا عبدیّت ہوگی اور بندگی ہوگی۔ آپ اگر سرکاری دفتر میں، کسی مسلمان حکومت کے دفتر میں بیٹھ کر خدا کی رضا کے لیے اور بنی نوعِ انسان کے فائدے کے لیے حدودِ شریعت کے اندر کسی حکم کو نافذ کرتے ہیں اور کسی کی خدمت کرتے ہیں تو یہ بھی عبدیت ہے، یہ عبدیت سے خارج نہیں یہ بھی آپ کو خدا تک پہنچانے والی چیز ہے۔ آپ اگر رشوت نہیں لیتے، آپ اگر غلط کام نہیں کرتے بلکہ خدا کا ڈر آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں لے کر چلتا ہے تو یہ سب عبدیت ہے۔ اسی طور پر اگر کوئی زراعت کے لیے ایک پودا لگا دیتا ہے تو میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اگر کوئی پودا لگائے اور اس پودا لگانے کے بعد اس سے کوئی انسان، حیوان، چرند پرند وغیرہ کھائے یا اس کے سائے میں کوئی بیٹھے تو یہ سب اس درخت کے لگانے والے

کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا۔ ہمارے صوفیاء تک نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کا کھیت ہے اور اس میں دس من غلہ پیدا ہوسکتا ہے لیکن وہ اپنی کام چوری کی بناء پر وہاں سے دس من غلہ پیدا نہیں کرتا بلکہ ایک من یا دو من غلہ پیدا کرتا ہے، یعنی وہ دس من غلہ پیدا کرنے کے وسائل اختیار نہیں کرتا، تو جتنا غلہ کم پیدا ہوگا تو اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تو نے کیوں اس چیز پر اتنی محنت نہیں کی کہ انسانوں کے لیے غلہ پیدا کرتا جس سے انسانوں کی ضروریات پوری ہوتیں۔ میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ اگر آپ کھیت میں ہیں تو وہاں پر عبدیت کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ آپ تاجر ہیں اور آپ کسی کے ساتھ ناجائز تجارت نہیں کرتے، بلکہ جیسے کہ شریعت کے احکام ہیں گاہک کو بتا دیتے ہیں کہ اس میں یہ فائدہ ہے اور یہ نقصان ہے، جیسے بھائی بھائی کو کوئی چیز دیتا ہے، مسلمان بھائی، آجکل کے بھائیوں کی بات نہیں ہے، کسی نے کہا ہے ۔

چھوڑا ان بردہ فروشوں کو کہاں کے بھائی
بیچ آویں گے اگر یوسف سا برادر ہو

ایسا نہیں بلکہ مسلمان جو بھائی ہوتے ہیں، مسلمانوں کی طرح جو تجارت آپ کرتے ہیں اور آپ کسی چیز کو اس کے سامنے احکام شریعت کے مطابق بیچتے ہیں تو فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تاجرِ صدوق یعنی سچے تاجر کا کل قیامت کے دن حشر صدیقین اور نبیین کے ساتھ ہوگا۔

میں آپ کو اسلام کی وسعت بتا رہا تھا کہ اسلام کی عبدیت صرف چند گوشوں میں اَٹکی ہوئی نہیں۔ اسی طور پر آگے بڑھیئے اگر آپ اللہ کے راستے میں اسلام کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جہاد کرتے ہیں تو اس سے

بڑھ کر کونسی عبادت ہے، یہ بھی عبدیت ہے، اگر آپ حکومت کی کرسی پر بیٹھے ہیں اور آپ عدل کر رہے ہیں اس وقت بھی آپ عبادت کے فرائض کو ادا کر رہے ہیں۔ گویا میری تمام گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں عبدیت کا تصور زندگی کے صرف چند گوشوں تک محدود نہیں بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جز وکُل عبدیت کے خاکے کے اندر مدغم ہے۔ انسان اگر اللہ کی رضا کے لیے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق زندگی کے جس گوشے میں بھی قدم اٹھائے گا یہ عبدیت ہو گی۔ عبدیت کی زندگی وہ راہ ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ اس بناء پر ہم یوں کہتے ہیں کہ مسلمان کا سلوک زندگی کے ہر مرحلے پر طے ہوتا ہے۔ اسی معنیٰ میں مولانا رومؒ نے ایک مقام پر فرمایا ہے ؎

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں تو حکمت یہ تھی کہ غار و کوہ میں جا کر خدا کو تلاش کریں جبکہ ہم عملی زندگی کے بہادر جوان ہیں، ہم میدانِ عمل میں رہ کر جنگ و شکوہ میں خدا کو حاصل کریں گے۔ بقول اقبال کے ؎

سروری در دین ما خدمت گری

عدلِ فاروقی و فقر حیدری

ترجمہ: ''اگر ہم بادشاہ ہیں اور تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو ہمارے ہاں سروری کس چیز کا نام ہے؟ ...... خدمت گری کا نام ہے، حضرت عمر فاروقؓ کا عدل ہو اور حضرت علیؓ کا فقر ہو۔''

ہم شاہی تختوں پر بیٹھ کر تعیش کے خاکے نہیں بسایا کرتے ، بلکہ ہم اگر تخت پر بھی آتے ہیں تو خود تو فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے ہیں لیکن عامۃ الناس کو ان مقامات پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں کہ

بھوکے رہتے تھے خود، اوروں کو کھلا دیتے تھے
کیسے صابر تھے محمدؐ کے زمانے والے

خود بھوکا رہنا اوروں کو کھلانا، یہ اسلام کا عدل اور مساوات کا نظام ہے۔ شاہی میں ہم فقیری کرتے ہیں، ہم شاہی ....شاہی کے لیے نہیں کرتے بلکہ فقیری اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں، اس بناء پر مسلمان جس مقام پر بھی ہوگا جہاں بھی ہوگا وہ عبدیت کی زندگی گزارنے والا ہوگا، اب جیسے میں نے پہلے عرض کر دیا تقویٰ پیدا ہوتا ہے عبدیت کی زندگی سے۔

یَآ یُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (البقرہ۔۲۱)

ترجمہ: ”لوگو! بندگی کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔“

اب آسان لفظوں میں یوں سمجھئے تقویٰ نتیجہ ہے عبادت کا، اور عبادت کہتے ہیں اپنی زندگی خدا کی رضا کے لیے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق گزارنے کو۔ اب اس لحاظ سے ہمارے لیے آسان راہ یہ ہوگئی کہ اگر ہم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہر قدم کو اٹھانے سے بیشتر اس چیز کا فیصلہ کرنا ہوگا، اس چیز کو سوچنا ہوگا، پہلے ہم اپنے دل کو ٹٹولیں، جیسے بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ سب

سے اُونچا مقام اخلاص کا مقام ہے، اخلاص کہتے ہیں اس چیز کو کہ ہمارا داعیۂ عمل محض رضائے حق ہو جائے، کسی دوسرے کی رضا باقی نہ رہے۔ سب سے پہلے اپنے قلب کو ٹٹولیں، دِل کو دیکھیں کہ ہم عمل تو کر رہے ہیں، آیا یہ عمل ہم خدا کے لیے کر رہے ہیں یا غیر کے لیے کر رہے ہیں۔ دیکھئے! ایک ہوتی ہے عمل کی جان اور ایک ہوتا ہے عمل کا جسم، اعمال کے جسم تو مختلف ہوں گے، کبھی آپ کھانا کھا رہے ہوں گے کبھی کھلا رہے ہوں گے، کبھی آپ سو رہے ہوں گے کبھی جاگ رہے ہوں گے، کبھی آپ میدانِ جنگ میں ہوں گے اور کبھی عدالت کے کٹہرے میں ہوں گے یا عدالت کی کرسی پر ہوں گے۔ مختلف مقامات پر اور مختلف جگہوں پر صورتیں اور شکلیں اعمال کی بدلتی رہیں گی لیکن جانِ عمل ہر جگہ پر ایک ہو گی اور جانِ عمل اخلاص ہے، اب جس طور پر جانِ عمل اخلاص ہے اسی طور پر رونقِ عمل احسان ہے۔ احسان کسے کہتے ہیں؟ ...... میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ (بخاری)

ترجمہ: ''اپنے پروردگار کی بندگی تُو اس طور پر کر گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تُو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔''

اب احسان نام ہے اس چیز کا کہ عمل کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا دھیان ہو کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے اور میرے اس عمل سے خوش ہو رہا ہے۔ اس سے عمل میں جان پڑ جائے گی، رونق آ جائے گی ...... اگر کسی کا کوئی بہت ہی مہربان آقا اور مالک ہو اور اس کے کسی عمل کے کرنے سے خوش ہوتا ہو اور شاباش بھی دیتا ہو۔ اگر آپ کو اس کی حضوری کا علم ہے تو اس حضوری کے علم کی بناء پر آپ کے عمل میں رونق

پیدا ہو جائے گی میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اخلاص جانِ عمل ہے اور احسان رونق عمل ہے۔ احسان کا مطلب میں نے عرض کر دیا یعنی اللہ کے حاضر اور ناظر ہونے کے عقیدے کے ساتھ کسی عمل کا کرنا، صوفیاءِ کرام کی جملہ محنت کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ کیفیتِ احسان ہمارے دل کی کیفیتِ دائمہ بن جائے یعنی ہر حال میں ہم خداوندِ قدوس کو حاضر و ناظر جان رہے ہوں، گویا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کسی کا شعر ہے ؎

حاصل رہے ہر وقت کیفیت حضوری کی
آ دِل میں میرے سما جائے صورتِ جاناناں

اور کسی نے فارسی میں کہا ہے ؎

قربِ بے غیبت نماز عاشقاں
فی صلوۃٍ دائمونم آرزوست

عاشقوں کی نماز کیا ہے؟ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ O عاشقوں کے لیے دائمی نماز ہے...... یعنی ہر وقت خدا کی قربت کا دھیان ہونا ...... اللہ موجود ہے، اللہ حاضر ہے، اللہ ناظر ہے، اللہ میرے پاس ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اللہ میرے نیک اعمال سے خوش ہو رہا ہے اور اپنی رحمت کی بارش مجھ پر کر رہا ہے۔ آپ خود اندازہ کیجئے کہ اگر آپ کا یہ دھیان ہو گا کہ آپ خدا کے سامنے ہیں اور خدا اپنی پوری رحمانیت کے ساتھ اور پوری رحیمی کے ساتھ، اور اپنے پورے فضل اور احسان کے ساتھ اور پوری محبت کی نگاہوں کے ساتھ آپ کے قلب کو دیکھ رہا ہے تو آپ اللہ کی محبت کے نشہ کے جام سے سرشار نہیں ہو جائیں گے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ دیکھو

اگر انسان کو سردی محسوس ہو رہی ہے، آجکل سردی کے دن ہیں سردی مجھے زیادہ لگتی ہے تو ہڈیاں سست ہو جاتی ہیں لیکن اگر دھوپ میں نکل کر بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر کے بعد ہڈیوں میں ایک طاقت سی محسوس ہونے لگتی ہے، تو جس طور پر آپ کہتے ہیں کہ دُھوپ میں جا کر دُھوپ کی شعائیں آپ کے جسم کو زندگی بخش دیتی ہیں، اسی طور پر ہم یقین سے کہتے ہیں اور دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر آپ کا دائمی تصور اور اگر دائمی نہ ہو تو تھوڑا سا بھی ہو جائے کہ خداوندِ قدوس میرے دل کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اپنی رحمتیں مجھ پر نازل کر رہا ہے اور یہ خدا کا دھیان آپ کے دِلوں کے اندر سما جائے جسے احسان کی کیفیت کہتے ہیں تو آپ کے دِلوں کو اطمینان مل جائے۔ دل زندہ ہوتے ہیں حضورِ ربّ کے تصور سے۔ حضورِ ربّ کا تصور دل کو زندہ کر دیتا ہے اور دھیانِ ربّ عشقِ الٰہی کی آگ دلوں میں لگا دیتا ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو دُوں کہ جیسے ایک آتشی شیشہ ہو آپ اسے سورج کے سامنے کر دیں تو آگ لگ جایا کرتی ہے، اسی طور پر اگر آپ اپنے قلوب کو اللہ کی طرف متوجہ کریں اور خدا کا دھیان خدا کی ذات کے تصور کے ساتھ کرتے رہیں تو کیا ہوگا؟...... آپ کے دِلوں میں خدا کی محبت کی آگ بھڑک اُٹھے گی۔ کسی نے کہا ہے کہ

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

اور آگے چل کر کہتا ہے کہ

اگر میں کیمیا گر ہوں تو میری کیمیا کیا ہے
یہی تارِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

تارِنفس صوفیاء کے نزدیک پاسِ انفاس کو کہتے ہیں۔ پاسِ انفاس اس کو کہتے ہیں کہ کوئی سانس اندر جائے یا باہر نکلے یا دِحق کے بغیر نہ ہو، دھیانِ حق کے بغیر نہ ہو، اللہ کے دھیان کے بغیر نہ ہو۔ جب آپ خدا کی یاد کریں گے تو جس طور پر برما لکڑی کو چھید دیتا ہے اسی طور پر خدا کی یاد، ذِکر کی کثرت اور دھیانِ حق کی کثرت آپ کے دِلوں کے اندر برما کر کے خدا کی وحدانیت کو، خدا کے حضور کو، خدا کی محبت کو، خدا کی خشیت کو آپ کے دِلوں کے اندر ڈال دے گی۔ دل زندہ ہوتے ہیں ذکرِحق کے ساتھ، دھیانِ حق کے ساتھ اور اللہ کی طرف رجوع کے ساتھ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اعمال کی جان ہے اخلاص اور اعمال کی رونق ہے احسان۔ احسان ذِکر کی کثرت سے میسر آیا کرتا ہے اگر ذِکر مع الحقیقت ہو۔ ذِکر مع الحقیقت کسے کہتے ہیں؟ ...... ذِکر مع الحقیقت اسے کہتے ہیں کہ زبان پر نام ہو اور دل میں یاد ہو۔ ایک تو یہ کہ زبان پر نام ہے اور دل میں ...... ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

ترجمہ: ’’زبان پہ اللہ کا نام اور دل میں گائے اور گدھا، مرد ہو گئے عورت ہو گئی، سونا ہو گیا چاندی ہو گئی یا کچھ بھی، اس تسبیح کا کیا اثر ہوگا!‘‘

ذِکر میں تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک تو مذکور کی ذات یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اور ایک ہے الفاظِ ذِکر، اور ایک ہے ذاکر۔ الفاظِ ذِکر آپ کی زبان ادا کرے گی، اور حقیقتِ ذِکر یعنی یاد دل کا کام ہے۔ زبان سے لفظ ادا ہوں یا نہ ہوں، دل میں جو ہوتا ہے زبان اس کی دلالت کرتی ہے، الفاظ دلالت کرتے ہیں الفاظ حقیقتِ ذِکر

نہیں بلکہ دلالتِ ذِکر کا آلہ ہیں، الفاظ زبان ادا کرے گی اور سامنے ہوگا مذکور، اس مذکور کا دھیان یعنی اللہ کا دھیان آپ کے دل و دماغ میں سمایا ہوا ہوگا تو اس وقت ذِکر کی حقیقت موجود ہوگی۔ ورنہ اگر ان تینوں چیزوں میں سے ایک بھی شے نہیں ہے تو حقیقت میں ذِکر پورا نہیں ہو رہا۔ ہمارے ذِکر میں تاثیر اسی وجہ سے نہیں آتی کہ ہم صرف الفاظ کو حقیقت ذِکر سمجھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو امّاں یاد آ گئی یا کوئی اور یاد آ گیا، اب جو یاد آ گئی تو زبان سے نام لیا یا نہیں لیا لیکن دل میں یاد تو آ گئی، اسی طور پر ذِکر کی حقیقت یادِ حق ہے جو کہ فعل ہے قلب کا اور دل کا۔ یہ زبان کا کام نہیں زبان صرف دلالت کرتی ہے لیکن چونکہ اسم مسمّٰی پر دلالت کرتا ہے، نام، نام والے پر دلالت کرتا ہے، اس لیے محبوب کا نام بھی محبوب ہوتا ہے، اس بناء پر قرآن نے کہا :

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد۔۲۸)

ترجمہ: ”دیکھو! دلوں کی تسلّی اللہ تعالیٰ کے ذِکر میں ہے۔“

اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کہا

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًاo (الدھر:۲۵)

ترجمہ: اپنے پروردگار کا صبح وشام نام لیا کیجئے۔

اپنے پروردگار کے نام کو یاد کیا کرو، کہیں کہا فَاذْکُرُوا اللّٰہَ اللہ کو یاد کرو، یہاں اسم ذاتی لیا اور کہیں کہا وَاذْکُرُوْہُ اللہ کو یاد کرو یعنی اس کی ذات کو یاد کرو۔ آپ ڈوبے ہوئے ہوں یادِ حق میں، اللہ کے دھیان میں، بقول شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ شہود کی کیفیت ہو۔ مثال کے طور پر کوئی پانی کی موج میں ڈوبا ہوتا ہے تو اس کا

ڈوب جانا خود بتا رہا ہے، وہ کہے یا نہ کہے کہ میں ڈوبا ہوا ہوں، پانی کا تذکرہ کرے یا نہ کرے، پانی کے اثرات اس کے ظاہر و باطن پر ہویدا رہتے ہیں۔ اسی طور پر جو شخص کہ شہود کی کیفیت میں ڈوب گیا، اللہ کے دھیان کی کیفیت میں جو ڈوب گیا، اسے خود معلوم ہوتا ہے کہ ذِکر کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور ذِکر کیا ہوتا ہے...... اگر ایسے میں الفاظِ ذِکر بند بھی ہو جائیں تو وہ حقیقت ذِکر میں رہتا ہے۔ بہر حال مجھ جیسے کو تو کچھ میسر نہیں ہمیں تو مجنوں کی طرح کام کرنا چاہیئے۔ مولانا رومؒ نے ایک مقام پر فرمایا مجنوں ریت پر بیٹھا ہوا تھا اور انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے۔ کسی نے پوچھا کیا کر رہا ہے پگلے؟ کہتا ہے کہ ۔

گفت مشق اسم لیلیٰ می کنم

خاطرِ خود را تسلی می دہم

لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اس کا نام لے لے کر اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔ اگر نام والا نہیں تو نام ہی سہی۔ ذِکر دلالت کرتا ہے ذِکر والے پر، اس بناء پر ذِکر ہلکی چیز نہیں ہے۔ نام سے آپ نام والے تک پہنچ جائیں گے۔ اسی لیے صوفیاء مرید کو پہلی چیز جو بتاتے ہیں یہ ہے کہ غفلت دُور کرو اور ذِکر میں آ جاؤ۔

یاد کر یاد کر بس یاد کر یاد سے غفلت کو تو برباد کر

اس یاد کے لیے جنگل میں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا خدا تم سے بعید نہیں ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق۔۱۶)

ترجمہ: ''ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ۔''

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار

بس ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

کسی نے عامیانہ شعر کہا ہے لیکن معنیٰ کے لحاظ سے اچھا ہے۔ کہتا ہے ۔

زاہد نے شہر چھوڑا جنگل میں جا کے بیٹھا

جس کی تلاش تجھ کو تیری بغل میں بیٹھا

جس کی تجھے تلاش ہے وہ تیرے قریب ہے۔ ہم ہر جگہ کی مسافت کو طے کر لیتے ہیں لیکن نفس سے دل تک کی مسافت ہم سے طے نہیں ہوتی۔ سلوک کی پوری انتہا یہ ہے کہ نفس کو چھوڑ کر آ جا۔ نفس کی منزل سے نکل قلب کی منزل میں آ جا تیرا مقام طے ہو جائے گا۔ یعنی نفس کے جو تقاضے ہیں ان سے نکل آ اور قلب کے جو تقاضے ہیں ان کو اپنا لے۔ قلب کا تقاضا کیا ہے؟ قلب کی رُوح کیا ہے؟ قلب کی غذا کیا ہے؟ ......اللہ کی یاد اور اعمالِ صالحہ...... جتنے آپ اللہ کی یاد میں بسے رہیں گے اور اللہ کا ذِکر کرتے رہیں گے اور اعمالِ صالحہ کو اختیار کرتے رہیں گے آپ کا دل زندگی کو طے کرتا چلا جائے گا۔ اب جس وقت آپ کا قلب یادِ حق سے منور ہو گا تو یادِ حق توجہاتِ الٰہیہ کو آپ کی طرف ملتفت کرتی ہے۔ دیکھو قرآن کہتا ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ۔۱۵۲)

ترجمہ: ''تم میری یاد کرو میں تمہاری یاد کروں گا۔''

جب آپ اللہ کی یاد میں آتے ہیں تو آپ اللہ کی توجہات کا مورد بنتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ آپ ہر وقت یاد کرتے رہیں گے تو ہر وقت آپ کی طرف توجہ ہو گی، اور توجہ آپ کے قلب کے ساتھ ایک

رابطے کو قائم کر لے گی، جب یہ رابطہ قائم ہو جائے گا اسے صوفیاء کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں۔ آپ کو نسبت الٰہیہ نصیب ہو جائے گی اور اس نسبت کے نتیجے کے طور پر خدا کا آپ کے ساتھ تعلق محبت والا اور عطاء والا ہو جائے گا، اور آپ کا اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق عبدیت والا اور یادِ حق والا ہو جائے گا۔ آپ اُس سے غافل نہیں ہوں گے اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ دو چیزیں آپ سے ہوں گی اور دو چیزیں اُن سے ہوں گی۔ ہر قسم کی عطاء، جو کہ خدا کے نزدیک عطاء ہے کیونکہ مؤمن جو ہوتا ہے وہ اپنے رُخ کی چیزوں کا طالب نہیں ہوتا بلکہ اس کا تو مقصد یہ ہوتا ہے یہاں تک پہنچ جاتا ہے ۔

فراق و وصل چه باشد رضائے دوست طلب

حیف باشد از او غیر او تمنائے

ترجمہ: ''وصال کیا ہے اور فراق کیا ہے، رضائے دوست طلب کر کیونکہ اس سے اس کے سوا کسی غیر کو طلب کرنا محبت کی نشانی نہیں۔''

کسی اُردو کے شاعر نے کہا ہے اور اچھا کہا ہے، شاعری کے لحاظ سے اچھا ہو یا نہ ہو معنیٰ کے لحاظ سے اچھا ہے ۔

نہ یہ چاہتا ہوں نہ وہ چاہتا ہوں

خدا کے لیے میں خدا چاہتا ہوں

خدا کی طلب بھی خدا کے لیے ہو۔ نفس کا تقاضا یہاں تک مٹ جائے کہ کوئی تقاضا اندر باقی نہ رہے، بس ایک ہی ایک موجود ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سی حدیث کی دُعاء ہے:

اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْلِیْ

ترجمہ: ''اے اللہ چھانٹ لے میرے واسطے اور پسند کر لے میرے لیے''

اب جب یہ چیز انسان کے اندر آتی ہے تو خدا کی طرف سے انوارات کا نزول ہوتا ہے اور انسان کے اندر توحیدِ کاملہ پیدا ہوتی ہے۔ توحیدِ کاملہ اسے کہتے ہیں کہ انسان خدا کے تعلق کی بناء پر ہر غیر کو ترک کر کے خدا کا ہو جائے۔ قرآن نے کہا ہے:

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (المزمل۔۸)

ترجمہ: ''اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اُسی کی طرف متوجہ رہو۔''

سب کو چھوڑوں تجھ سے جوڑوں
تیری گلی کے ڈھور بٹوروں

سب کو چھوڑ کر تیری ذات کے ساتھ جڑ جاؤں بس۔ اب جب آپ اس کے ساتھ تعلق کو قائم کریں گے، تو پھر کیا نتیجہ ہوگا؟ ...... کہ آپ پر اللہ کی صفات کھلنے لگیں گی۔ آپ کا اعتقادی علم عرفانی علم میں اور معرفت کے رُخ پر بدلنے لگے گا۔ پہلے آپ عقیدے کے طور پر کہتے تھے کہ خدا عالم ہے، اب آپ کا دل یہ جاننے لگے گا کہ خدا جاننے والا ہے مجھے دیکھ رہا ہے، خدا کو ہر چیز کا علم ہے۔ پہلے آپ رازق کہتے تھے اور آپ کی زبان سے ر، ز اور ق کے لفظ نکلتے تھے آپ ان لفظوں کو رازق سمجھتے تھے، اندر بات نہیں اُتری ہوئی تھی۔ جب توحید کاملہ آئے گی تو آپ پر خدا کی رزّاقیت اور خدا کی ربوبیت کھلے گی اور آپ کو یقین ہو جائے گا کہ پورے عالم میں

اگر ایک دانہ یا خوراک کا کوئی ذرّہ بھی موجود نہ ہو تو بھی میرا ربّ مجھے پال کر دِکھا دے گا۔ جب یہ یقین کی کیفیت آئے گی تو نتیجے کے طور پر آپ کے اندر توکل پیدا ہوگا۔توکل نتیجہ ہے توحید اور ایمان کا قرآن کہتا ہے:

وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○ (الانفال: ۲)

ترجمہ: اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں۔

ایمان بڑھتا ہے تو توکل پیدا ہوتا ہے۔توکل ہاتھ توڑ کر بیٹھ جانے کا نام نہیں بلکہ توکل یہ ہے کہ ظاہری اسباب کو اختیار کرنے کے باوجود اسباب میں کچھ نہ سمجھنا اور سب کچھ خدا کی ذات میں سمجھنا، یہ کمالِ توکل ہے۔اسی کے نتیجے کے طور پر جب انسان دیکھے گا کہ میرا ربّ ہی سب کچھ کرنے والا ہے اور اسی کی ذات سے سب کچھ ہوتا ہے تو انسان کے اندر ایک چیز پیدا ہوگی، وہ کہے گا سب کچھ وہی ہے۔ وہ رحمٰن بھی ہے، رحیم بھی ہے، علیم بھی ہے، حکیم بھی ہے اور مجھ پر انتہائی عطایا کا کرنے والا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے گا، اسے صوفیاء کی اصطلاح میں کہتے ہیں تفویض یعنی سپرد کر دینا

ؔ سپردم بہ تو مایہ خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

ترجمہ: میں نے اپنا سب کچھ تجھے سپرد کر دیا تو کم و بیش کے حساب کو جانتا ہے۔

کارساز ما بسازِ کارِ ما

فکر ما در کارِ ما آزارِ ما

ترجمہ: میرا کارساز میرے کام بنا رہا ہے اب اپنے کام کی فکر کرنا اپنے کو آزار دینا ہے۔

انسان جب تفویض کے مقام پر پہنچتا ہے تو تفویض کے نتیجے کے طور پر تسلیم پیدا ہو جاتی ہے، جسے صوفیاء کی اصطلاح میں تسلیم و رضا کہتے ہیں۔ صوفیاء میں دو طبقے ہیں ایک طبقہ اخلاص کو آخری درجہ قرار دیتا ہے اور ایک تسلیم و رضا کو آخری درجہ قرار دیتا ہے

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جو کریں اب تو ہم آپ کے ہو چکے ہیں۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے، حضرت عثمان ہارونیؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا، شاہ معین الدین اجمیریؒ کے پیر تھے۔

بہر قتلم چو کشد تیغ نہم سر بسجود

او بہ نازے عجبے، من بہ نیازے عجبے

ترجمہ: ''اگر میرے قتل کے لیے تلوار کو اُٹھالے تو اس وقت میں گردن کو نیچے رکھ دوں، وہ ناز آزما رہا ہو میں نیاز آزما رہا ہوں۔''

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ترجمہ: یہ دشمن کا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے جس پر تو خنجر آزمائے۔

؎ ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
به امید آں که روزے بشکار خواہی آمد

ترجمہ: صحرا کے سارے ہرن اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھے اس امید میں ہیں کہ محبوب انھیں شکار کرنے آ جائے۔

تسلیم و رضا کسے کہتے ہیں؟......خدا کا ہو جانا اور خدا کا ہونے کے بعد خدا کے ہر حکمِ تکوینی یا تشریعی پر اس طور پر راضی ہو جانا کہ یوں سمجھنا کہ اگر خدا کا حکم اس طرح نہ ہوتا تو میں خام رہ جاتا، میں کامل نہ ہوتا، میری خیر اس کی رضا میں ہے۔ اپنی رضا کو خدا کی رضا میں فنا کر دینے کو کہتے ہیں تسلیم و رضا، اور اسی کو صوفیاء نے فناء کے مقام سے یاد کیا ہے۔ اس میں ایسا مزہ ہوتا ہے، حضرت شیخ جیلیؒ کا ملفوظ ہے اپنے شاگرد کو کہتے ہیں ''اے بیٹا! میں تجھے ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے دُنیا ہی میں جنت کا مزہ آ جائے۔'' اس نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے، ''اپنی رضا کو اس کی رضا پر قربان کر دو اور اپنے کو اس کے سپرد کر دو، جو وہ چاہے تم وہی چاہو تو تمھیں دُنیا میں ہی جنت کا مزہ آ جائے گا۔'' ہمیں جتنی بھی مشکلات پیش آتی ہیں یہ اپنی تجویزوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، خدا کی تقدیر سے ٹکراتے ہیں......سپرد کر دو خود کو خدا کے۔ چھوٹا بچہ جو ہوتا ہے نہ اسے کمانے کی فکر، نہ کھانے کی فکر۔ اپنے کو اللہ میاں کے سپرد کر دو تو تمام معاملے خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے۔

بہلولؒ کا نام آپ نے سنا ہوگا ایک دفعہ کہیں جنگل میں بیٹھے تھے، ہارون الرشید خلیفہ کا گزر ہوا تو پوچھا کہ تیرا کیا حال ہے؟ بہلولؒ نے کہا کہ اُس سے کیا حال پوچھتے ہو جس کے اشارے پہ دُنیا ناچ رہی ہے۔ ہارون نے کہا کوئی سمجھ داری کی

بات کر، کیا کفر بک رہا ہے۔کہا میرے اشارے پہ دُنیا ناچ رہی ہے۔پوچھا کیسے تیرے اشارے پہ دُنیا ناچ رہی ہے؟ بہلولؒ نے کہا کہ میری رضا اور خدا کی رضا ایک ہوگئی ، جو وہ چاہتا ہے وہی میں چاہتا ہوں لہذا جو میں چاہتا ہوں وہ ..وہ چاہتا ہے،فرق ہی کیا ہے۔من وتو کا پردہ ہٹادو،اپنی مشیت کو خدا کی مشیت میں ضم کردو، اپنی نہ چاہو اس کی چاہو اور جب اس کی چاہنے لگو گے تو غم اور پریشانی کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O (یونس۔۶۲)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے ولیوں پر نہ خوف ہے اور نہ اُن کو کوئی غم ہے۔''

جو اللہ کے ولی ہیں انھیں کوئی غم ہے نہ فکر۔اتنا بڑا اللہ میاں جو رکھتا ہے اسے کس چیز کا غم ہو؟ اس نے تو اپنی رضا کو خدا کی رضا میں فنا کردیا ہے اور جو خدا کر رہا ہے اس پر وہ راضی برضائے حق ہے،اسے کوئی فکر نہیں ہے وہ سمجھتا ہے جو میرا ربّ کررہا ہے اس میں میرا عین فائدہ ہے، جب عین فائدہ ہے تو غم کس بات کا۔ ڈاکٹر کے پاس جاکر آپ انجکشن لگواتے ہیں تو کیا آپ روتے ہیں؟ اگر تکلیف ہو بھی تو اسے گوارا کرتے ہیں کہ یہ انجکشن میرے اندر شفا ڈال رہا ہے۔اس بناء پر آپ خود سوچیں کہ ربّ اگر آپ کو چٹکی کاٹ لے تو اس کی چٹکی میں بھی مزہ ہے۔بعضے آدمی بچوں سے پیار کرنے لگتے ہیں تو اس کی چٹکیاں لیتے ہیں، بچہ چوں چوں کررہا ہے اور یہ مزہ لے رہا ہے......تو اللہ میاں بعض اوقات پیار کا معاملہ کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ کیا کردیا۔ بھائی جس کے سامنے ہماری تمام آئندہ کی زندگی ہے اس کی رضا پہ راضی ہوجاؤ، خدا کی قسم دنیا میں کوئی غم نہیں ہوگا۔ پہلے مسلمان کبھی خودکشی نہیں کرتے

تھے۔ کیوں نہیں کرتے تھے؟ ان کے پاس رضا بالقضاء تھی ، اللہ تعالیٰ کی مرضی پر شاکر تھے۔ یورپ اورامریکہ میں کتنی خودکشیاں ہوتی ہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ توحید کے نتیجے پر یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔

اسی طور پر جب آپ رَبّ کے معاملات اپنے ساتھ دیکھیں گے ،اس کی کرمفرمائیاں دیکھیں گے تو بقول حضرت شاہ ولی اللہ کہ ''جب کوئی عارف اپنے دل کے اندر اللہ کی نعمتوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے اندر خدا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اور جب اپنے اعمال کو دیکھتا ہے تو اللہ کی خشیت پیدا ہو جاتی ہے۔'' خدا کا ڈر سانپ بچھو کا ڈر نہیں ہے۔اللہ کا جو ڈر ہے وہ تو محبوب کے اعراض کا ڈر ہے۔اگر آپ عاشق نہیں ہیں تو عاشقوں کے واقعات تو سنے ہوں گے۔مجازی ہی سہی،عشاق جو ہوتے ہیں باوجود محبت کے کمال کے انھیں یہ ڈر رہوتا ہے کہ کہیں محبوب خفا نہ ہو جائے اور یہی محبت اور خفگی کا ڈر رہونا خشیت ہے۔خشیت انسان کو اللہ کے احکام کا پابند کر دیتی ہے اور گناہوں سے بچنے کے لیے لگام دیتی ہے،اور محبت آپ کو اعمال پر اور مہمیز کرتی ہے۔یہ خشیت اور محبت کے جذبات دل میں آئیں گے تو اسی کے تحت للّٰہیت پیدا ہوگی اور خدا کا دھیان پیدا ہوگا۔ یہ جتنی بھی چیزیں ہیں انھیں صوفیاء کی اصطلاح میں مقامات کہتے ہیں یعنی دل کا بن جانا۔ جب دل بنتا ہے تو صرف دل ہی نہیں بنا کرتا بلکہ جس کا دل خدا کے تابع ہوتا ہے تو بقول محقق صوفیاء کے جسم دل کے تابع ہے اور میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے:

اَلَاوَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ (بخاری)

ترجمہ: ''دیکھو تمہارے جسموں میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر وہ سنورا تو تمام جسم سنور جائے گا اور اگر وہ بگڑا تو تمام جسم بگڑ جائے گا، جان لو وہ...دل ہے۔''

دل کو سنبھال لو تو خود سنبھل جاؤ گے اور اگر دل بگڑ گیا تو تمام جسم بگڑ گیا۔ اس دل کو خدا کا بنا دو جب تمہارا دل خدا کا بن جائے گا تو تمام جسم خدا کا بن جائے گا۔ وقت کم ہے میں اشارہ کیے دیتا ہوں کہ خدا کا بننے کا طریقہ کیا ہے۔ ایک آسان طریقہ ہے، خدا کو تو ہم نے نہیں دیکھا، خدا کے حالات کو ہم نے نہیں جانا لیکن میرے آقا سید الانبیاء حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جزو کل ہم پر ایسے آشکارا ہے جیسے کہ ابھی دن کا ایک بجے کا وقت ہے اور ہم کو سوئی بھی دکھائی دے رہی ہے۔ خدا کی قسم اس سے بڑھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی تفصیل ہمارے سامنے ہے۔ اس زندگی کو اپناؤ، اگر خدا کی رضا کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہر قدم پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کو اپنا لو۔ دیکھو کہتے ہیں کہ صوفیاء عاشق الٰہی ہوتے ہیں، خدا نے خود فرمایا:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔۳۱)

ترجمہ: ''اگر تم کو خدا سے محبت ہے، تو میری اطاعت کرو، اللہ تم سے محبت کرینگے۔''

اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرو تو اللہ تمھیں محبوب بنا لے گا۔ وجہ کیا ہے...... کہ محبوب کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت ہوتی ہے ؎

قہر ہو یا مہر ہو جو کچھ بھی ہو
ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

ے زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

ترجمہ: ''سر سے لے کر پاؤں تک جہاں بھی دیکھتا ہوں تو دل یہ کہتا ہے کہ یہی جگہ ہے جو دل کو کھینچنے والی ہے۔''

تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جیسے خود محبوب اور محبوبیت والی ہے اسی طور پر خداوندِ قدوس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں میں محبوبیت کو رکھ دیا ہے۔ جس میں ادائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پائی جائے گی وہ محبوبِ خدا بن جائے گا۔ حضورؐ بڑے اور ہم چھوٹے، لیکن محبوبیت آئے گی ......صوفیاء کی اصطلاح میں ایک لفظ ہے ''جذب'' تو آپ کا تعلق خدا سے انجذاب کے راستے سے ہوگا۔ انجذاب کہتے ہیں مثلاً یہاں ایک طرف پانچ من کا مقناطیس کا ٹکڑا رکھ دو اور پاس دو تولے کا لوہے کا ٹکڑا، تو لوہے کا ٹکڑا کیسے مقناطیس کی طرف کھنچ کر آئے گا۔ خدا کی ذات میں محبّ ہونے کی حیثیت سے جو مقناطیسیت ہے وہ آپ کی محبت کی بناء پر آپ کو کھینچ لے گی۔ دیکھو خدا کا وصل جسے وصال کہتے ہیں، وصال کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوئی خدا کی گود میں جا بیٹھتا ہے بلکہ محبت میں قدم حدِ ادب سے باہر نہیں رکھنا ہوتا کیونکہ محبوب سراپا ناز ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہم ان کی گود میں جا بیٹھیں گے۔ بہر حال خدا کی رضا کا مل جانا ہی وصال ہے۔ اور خدا کی رضا ملتی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر۔ اس راہ پر آپ جتنا بھی چلتے رہیں گے ہر قدم آپ کا منزل ہوگا، ہر قدم پہ خدا کی رضا آپ کو ملے گی۔ اور رضائے خداوندی کا حصول ہی حاصلِ عبدیت ہے اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں، تقویٰ نام ہے دل کے اندر خدا کے ایسے تعلق اور دھیان کے بس جانے کا کہ خدا

تمھیں ہر آن گویا دکھائی دے، اور اس دھیان کی بناء پر آپ ہر چھوٹے بڑے، ظاہر اور پوشید گناہ سے بچیں اور نیکی کی راہ کو اختیار کرتے چلے جائیں اور زندگی کا کل و جز اللہ کے حکموں کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق آجائے۔ اس معنی میں ہم کہتے ہیں کہ تصوف کو آپ طریق تقویٰ کہہ لیجئے، طریق اتقاء کہہ لیجئے، سلوک کہہ لیجئے جس نام سے بھی تصوف کو پکاریں، حقیقت تصوف ایک ہے جو اسلام کے جزو وکُل پر چھائی ہوئی ہے۔ گلاب کو جس نام سے بھی پکاریں وہ گلاب ہوگا۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان نِرے کانوں سے نہیں بنا کرتا آنکھوں سے زیادہ بنتا ہے، یعنی انسان صرف سن سن کر نہیں بنا کرتا بلکہ بعض اوقات سن سن کر سُن ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی اہلِ دل کی صحبت کو اختیار کیجئے، اہلِ دل کی صحبت سے دل بن جایا کرتے ہیں، جب تک اہلِ دل کی صحبت حاصل نہیں ہوتی تو کتابوں کے انبار آپ کو اپنے نیچے دبالیں گے۔ کالی سیاہی سے لکھے ہوئے جو نقوش ہوتے ہیں اکثر دلوں کو سیاہ کر دیتے ہیں، اگر آپ عمل پر نہیں پڑیں گے یا اہلِ دل کی صحبت کو اختیار نہیں کریں گے تو دل سخت ہو جاتا ہے۔ اس لیے سلوک کے طے کرنے کے لیے بقول مولانا رومؒ کے:

بے قلاوز اندر ایں صحرا مرو

ترجمہ: اس صحرا میں راہنما کے بغیر نہ چلو۔

طریقت کا جو راستہ ہے اس میں بغیر شیخ کے اور بغیر رہبر کے یا بغیر اُستاد کے نہ چلو، استاد ایسا ہو جو واقعی اُستاد ہو، گرگ باراں دیدہ ہو یعنی تجربہ کار ہو، جب تک

اسے خود پتہ نہ ہو تو دوسرے کو کیا بتائے گا۔ راہنما کو دیکھ کر چلو لیکن رہنما کو پکڑ نے سے پہلے دیکھ لو کہ رہنما کتنے پانی میں ہے۔ بقول مولانا رومؒ کہ:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

بہت سارے ابلیس آدم کی صورت میں ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے دینا، پہلے سو مرتبہ دیکھو کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے اور جب دیکھ لو تو پھر کیا کرو؟ مولانا رومؒ کے بقول:

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد از ایں دیوانہ سازم خویش را

ترجمہ: میں نے عقل دور اندیش کو آزمایا اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ بنایا، یعنی محبت الٰہی کا راستہ اختیار کیا۔

قال را بگزار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پا مال شو

ترجمہ: باتیں بنانا چھوڑ و اور حال والے بنو اور کسی کامل کے آگے پامال ہو جاؤ۔

ایک مقام پر فرمایا ہے:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

ترجمہ: مولانا رومؒ ہرگز مولوی نہ بنا جب تک کہ شمس الدّین تبریز کا غلام نہ بنا۔

جب تک رہنما نہیں ہوتا آدمی آدمی نہیں بنتا کتابوں کا پلندہ بن جائے گا۔

معلومات اور چیز ہوتی ہیں علمِ حقیقی اور چیز ہوتا ہے۔معلومات کا مخزن دماغ ہے اور علم صحیح کا مقام رُوح اور دل ہے۔ جب علمِ صحیح آتا ہے تو دلوں کی زندگی پلٹ جایا کرتی ہے، دل دل والے کے پاس بنا کرتا ہے۔میرے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات فرمائی تھی اسی بات پر ختم کرتا ہوں فرمایا کہ ''خدا کے بغیر کہیں دل کی روشنی ملتی ہے؟

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (النور: ۳۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

اگر دلوں کی روشنی چاہتے ہو تو ان دلوں کو تلاش کرو جن دلوں میں اللہ کا نور ہے۔جیسے دِیے سے دِیا روشن ہو جاتا ہے دل سے دل روشن ہو جائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔



﴿ اللہ کی رضا کا حصول اور عبدیت ﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ
وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَ مَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَشَفِیْعَنَاوَحَبِیْبَنَاوَمُرْشِدَنَا مُحَمَّدً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍوَ اٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ وَ بَارِکَ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ o اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی حَبِیْبِکَ وَرَسُوْلِکَ مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ مُزَکِّیِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْکِرَامِ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

میرے بزرگو، عزیزو اور دوستو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو ایک انتہائی اُونچے اور عالی مقصد کے لیے قائم فرمایا ہے۔ یہ کائنات ایسے ہی نہیں بنادی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا، کوئی مدّعا نہیں تھا، کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس دُنیا کو یونہی پیدا کر دیا گیا ہو۔ بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس عالم کی پیدائش ایک انتہائی اُونچے اور اعلیٰ مقصد کے لیے کی۔ اور وہ اعلیٰ مقصد کیا

تھا؟...... کہ خداوندِ قدوس اپنی ذاتِ عالی کو اپنی ایک خاص مخلوق سے خاص طور پر پہچانوانا چاہتے تھے، اور یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسی مخلوق پیدا ہو جو خدا کی ذات کی پوری معرفت رکھنے والی ہو، خدا کو پہچاننے والی ہو، خدا کے احکام کی پابند ہو، خدا کی بندگی کرنے والی ہو، اور خدا کے حُکموں پر چلنے والی ہو۔

اللہ کی بندگی اتنی اُونچی چیز ہے اور عبدیت اتنا اُونچا مقام ہے کہ اقبال نے تو عبدیت کی مستی میں آ کر یہاں تک کہہ دیا:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

بندگی میں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی بلندیوں کو رکھا ہے حقیقت کے لحاظ سے کسی دوسری چیز میں نہیں رکھا۔ بندگی کا جو لطف ہے، اور بندگی کا جو ذائقہ ہے اور جو بندگی کا کمال ہے وہ کسی دوسری چیز میں حاصل نہیں ہوتا۔ دوستو! یہی وجہ ہے کہ اللہ کے سب سے پیارے محبوب، مخلوق میں سب سے اُونچے، اکمل اور اعلیٰ، جن جیسا کوئی پیدا نہیں کیا گیا اور نہ اللہ کی حکمت نے چاہا کہ اُن جیسا کوئی دوسرا پیدا کیا جائے، میری مراد اپنے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی سے ہے۔ آپؐ کی ذاتِ عالی جس مقام پر فائز ہے اور جن درجات کی حامل ہے سچی بات ہے کہ دوسرا اس مقام کو کیا جانے اور کیا پہچانے!...... بقول ہمارے ایک بزرگ کے کہ ایک مشہور فقرہ ہے کہ ”ولی را ولی می شناسد“ اگر یہ بات ہے کہ ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے تو یہ بات بھی ضروری ہوئی کہ ”نبی را نبی می شناسد“ کہ نبی کو نبی پہچانے گا اور پھر خاتم الانبیاء کو کون پہچانے گا؟...... جب کوئی

دوسرا خاتم الانبیاء نہیں ہوسکتا، تو خاتم الانبیاء کی سوائے خدا کے کوئی دوسرا کما حقہ معرفت نہیں پا سکتا۔ اسی لیے ہمارے اس دوست نے فرمایا "خاتم الانبیاء را خدا می شناسد" کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی مقام کو اور آپ کے اصلی درجے کو اگر کوئی جانتا ہے تو خداوندِ قدوس کی ذاتِ عالی جانتی ہے کہ کن کمالات کے حامل تھے، کیا خوبیاں تھیں اور کیا کچھ آپؐ میں تھا۔ قرآنِ کریم کو اگر آپ دیکھئے تو آپ کو یہ چیز معلوم ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر تعریف قرآن نے کی ہے اور جن رُخوں سے کی ہے اور جن صورتوں سے کی ہے دوسرے کسی نبی کی نہیں کی۔ بیشک تمام انبیاء اپنے درجے میں انتہائی اُونچے ہیں، ہر ایک کامل ہے۔ کوئی نبی ایسا نہیں جو کہ غیر کامل ہو...... لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کاملین میں اکمل ہیں، اُونچوں میں اونچے ہیں، بڑوں میں بڑے ہیں۔ تو آپ ﷺ کی جو تعریف کی نوعیت ہے وہ کسی دوسرے کی تعریف کی نہیں۔ بہرحال عرض کرنے کا مدعا یہ تھا، میں بندگی پر بحث کر رہا تھا، کہ ایسی اُونچی ذات جس کا مقام بقول مولاناؒ کے: ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

خدا کے بعد سب سے اُونچا مقام ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ قرآن نے ان مقامات پر جہاں سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی انتہائی اُونچے مدارج پر فائز ہوتی ہے وہاں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا، ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ کسی اور لقب سے آپ کو پکارا گیا ہو، اُونچے مقامات پر جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آتا ہے تو وہاں عبدہٗ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دیکھئے! معراج کی بات ہے، اور معراج کی ابتداء میں نبی پاک صلی اللہ

علیہ وسلم کو کعبۃ اللہ کی مسجد سے مسجد اقصیٰ بیت المقدس تک لے جایا گیا اور معراج آپ جانتے ہیں کہ انتہائی اُونچا مقام ہے، وہ ایک ایسی شان ہے، وہ ایک ایسا درجہ ہے جو کسی دوسرے کو اس صورت سے نہیں دیا گیا، اب جو یہ رُخ ہے تو چاہئے تو یہ تھا کہ آپ ﷺ کو مصطفیٰ کہہ کر پکارا جاتا، آپ ﷺ کو مجتبیٰ کہہ کر پکارا جاتا لیکن قرآن نے وہاں جو لفظ استعمال کیے وہ نہ مجتبیٰ کے ہیں نہ مصطفیٰ کے ہیں بلکہ جو لفظ استعمال کیے گئے وہ یہ کہ:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ط (بنی اسرائیل:۱)

ترجمہ: ''پاک ہے اللہ کی ذات جو لے گئی اپنے خاص بندے یعنی سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجدِ کعبہ سے مسجدِ بیت المقدس تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں۔''

اب جہاں ابتدائے معراج ہے وہاں بھی عبد کہا گیا اور جب وہ اُوپر جاتے ہیں آسمانوں پر اور وہاں پہنچتے ہیں جہاں کہ جبریلؑ کے بھی پَر جلتے ہیں، سدرۃ المنتہیٰ ایک مقام ہے اور حدیث میں آتا ہے بخاری کی روایت ہے کہ سدرہ، اللہ کے علم میں ہے کہ اس کی کیا حقیقت ہے لیکن جہاں تک کہ روایات کا تعلق ہے سدرۃ المنتہیٰ ایک بیری کا درخت ہے جہاں کہ مخلوق کی انتہا ہوتی ہے۔ آپؐ جب وہاں اس مقام پر پہنچتے ہیں تو سدرۃ المنتہیٰ سے آگے جبریلِ امین کہہ دیتے ہیں کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا، میری پرواز نہیں۔ جبریلؑ جو کہ سیدالملائکہ ہیں اور ملائکہ میں سب سے اُونچے ہیں وہ یوں کہہ دیتے ہیں اے اللہ کے نبی! آپؐ آگے جا سکتے ہیں میرا مقام نہیں کہ

میں آگے جاؤں ۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کی وہ پرواز ہے جو کہ جبریلِ امین کی رُوحانیت کی پرواز نہیں ہے۔اس مقام کو جانئے اور اس چیز کو سمجھئے کہ جبریلِ امین جو سیدالملائکہ ہیں،فرشتوں میں سب سے اُونچے ہیں،اور خدا کے انتہائی مقرب فرشتے ہیں،اتنے اُونچے ہیں کہ خود خدا ان کی تعریف کرتا ہے لیکن اتنا اُونچا فرشتہ بھی ایک مقام پر آ کے کہہ دیتا ہے کہ

؎ اگر یک سر موئے برتر پرم
فرغِ تجلی بسوزد پرم

اگر تھوڑا سا میں ایک بال کے برابر بھی آگے جاؤں تو تجلیاتِ ربّانیہ مجھے جلا کر رکھ دیں گی۔ میں آگے نہیں جا سکتا۔اس سے آگے خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جاتے ہیں اور آپ ﷺ کی سواری کا نام رفرف ہے۔آپؐ جاتے ہیں اور پھر وہاں پہنچتے ہیں جس کے متعلق عام طور سے مشہور ہے ’’قابَ قوسین‘‘ کا مقام،یعنی وہاں پہنچے جس مقام پر کوئی دوسرا نہیں جا سکا۔اب اس مقام پر پہنچنے پر بھی یہ نہیں کہا گیا کہ میں نے فلاں کو یہ کہا بلکہ عبدیت کا ذِکر وہاں بھی ہے اور قرآن یہ کہتا ہے:

فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰیO مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰیO (النجم:۱۰,۱۱)

ترجمہ: ’’ہم نے اپنے خاص بندے سیدالانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ وحی کی جو ہم نے کرنی چاہی۔قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی۔‘‘

اب ’’مَـــا اَوْحٰـی ‘‘یعنی کیا کہا،کس طور پر کہا اور کیونکر کہا،اور کیا کیا کھولا ...... یہ خدا جانے اور اس کا نبی جانے ......کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اب یہ ’’مَـا‘‘

جو ہے اس '' مَـا '' کا اتنا بڑا پیٹ ہے کہ سب کچھ اس میں آتا ہے۔ جو کچھ خدا نے کہا، جو کچھ خدا نے بتایا اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جانیں یا ان کا خدا جانے لیکن میرے اس وقت عرض کرنے کا مدعا یہ تھا کہ جس وقت اس مقام پر پہنچے جو کہ انتہائی اُونچا مقام ہے، جہاں کہ تجلیاتِ ربّ کو دیکھا، بلکہ اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق جہاں کہ خدا کی ذاتِ عالی کا دیدار ہوا، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا، اس مقام پر بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں یا فلاں بلکہ وہاں بھی عبد کا لفظ ادا کیا ہے اور عبدیت کا تذکرہ ہے۔

نماز میں دیکھئے، نماز میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کہا گیا؟ وَاَشْهَـدُ اَنَّ مُـحَـمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ط عبدیت کو پہلے لائے رسالت کو بعد میں۔ عبدیت اتنا اُونچا مقام ہے کہ عبدیت کے بغیر بندے پر معرفتِ حق کھلتی ہی نہیں۔ خدا کی پہچان کے لیے بندگی ضروری ہے۔ جب تک بندگی نہیں ہوگی خدائی نہیں کھلے گی۔ جھکو گے تو اُٹھائے جاؤ گے، اور اپنے اندر اگر غرور کی شان کو پیدا کرو گے، اپنے اندر اصطفٰی کی شان کو پیدا کرو گے، اپنے کو کچھ سمجھو گے تو مٹائے جاؤ گے، گرائے جاؤ گے۔ اور جتنا جھکو گے اتنا اُٹھائے جاؤ گے۔ حدیث میں آتا ہے:

وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰه (صحیح مسلم، ترمذی)

ترجمہ: جس کسی نے اللہ کے لیے تواضع کی اللہ اسے بلند کرے گا۔

جو اللہ کے لیے جھکتا ہے اللہ اسے اُٹھا دیتا ہے۔ دیکھو سجدہ ہے اور سجدے میں انسان کی پیشانی جو کہ انسان کی سب سے اُونچی چیز ہے، یہ پیشانی جا کر زمین پر لگتی ہے اور انسان اپنے آپ کو انتہائی نیچا ڈال دیتا ہے۔ اب حدیث میں آتا ہے کہ

انسان خدا کے سب سے زیادہ قریب جو اس دُنیا میں ہوتا ہے وہ سجدے کی حالت میں ہوتا ہے ۔یعنی تم جھکو گے تو اُونچے کیے جاؤ گے۔ بندگی کیا ہے؟...... اپنے آپ کو مٹا دینا۔عبد کہتے ہی اسے ہیں، عربی میں مُتَعَبَّدُ سے مراد ایسا راستہ ہے جو کہ ایسا کچا راستہ ہو جس کی مٹی پاؤں کے نیچے روندی جا جا کر بالکل سرمے کی طرح باریک ہو چکی ہو، ایسے راستے کو مُتَعَبَّدُ کہتے ہیں۔ بندہ وہ ہوتا ہے جو اپنی چاہتوں کو، اپنی خواہشاتِ نفس کو اس طور پر مٹا چکا ہو کہ اس کی کوئی بھی حقیقت باقی نہ رہی ہو۔ جو مٹ گیا بندہ بن گیا اور جس نے یوں کہا کہ میں کچھ ہوں تو حقیقت میں نہ اس میں بندگی آئی اور نہ ہی خدا کی معرفت آئی ، نہ اس نے خدا کو پہچانا نہ اپنے آپ کو پہچانا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان کا سب سے بڑا جو کمال ہے وہ بندگی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پوری کی پوری کائنات کو کس لیے پیدا کیا ؟...... آپ یہ تو جانتے ہیں آپ نے سنا ہوگا اور کہا ہوگا بار بار:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ (الذاریات.۵۶)

ترجمہ: ’’ہم نے نہیں پیدا کیا جنوں کو اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں۔‘‘

یعنی انسان پیدا کیے گئے ، جنات پیدا کیے گئے ،اس لیے کہ خدا کی بندگی کریں ۔اور یہ کائنات کیوں پیدا کی گئی ؟...... کائنات اپنے لیے پیدا نہیں کی گئی ، کائنات اس لیے پیدا کی گئی کہ یہاں بندے آنے والے ہیں۔آپ نے وہ روایت سنی ہوگی جس میں آتا ہے:

لَوْ لَاہُ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک (طبرانی)

ترجمہ: ''اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہ کیا جاتا۔''

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو پیدا کرنا اللہ کا مقصود نہ ہوتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس زمین وآسمان کے خاکے کو پیدا نہ فرماتے۔

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے لیے اس پورے کے پورے خاکے کو کیوں قائم کیا گیا؟ اس عالم کو کیوں بنایا گیا؟ دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ

(الملک۔۲)

ترجمہ: '' ہم نے موت وحیات کے پورے کے پورے نظام کو اس لیے پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائیں کہ تم میں اچھا عمل کون کرنے والا ہے (اور برائی کی راہوں پر کون آنے والا ہے)''

اچھائیوں کو کون اختیار کرنے والا ہے اور برائیوں سے کون بچنے والا ہے، ٹھیک راہ پر کون چلتا ہے اور برائی سے بچ کر کون نکل جاتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر اسے گھاٹی قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھاٹی جس میں سے انسان نکل کر کامیابی کی راہوں پر آتا ہے وہ کونسی گھاٹی ہے؟ یہ وہی گھاٹی ہے کہ انسان نیکی کی صورتوں کو اختیار کرتا ہے اور برائی کی راہوں سے بچتا ہے۔

بہرحال میرے عرض کرنے کا مدعا یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدُ العباد ہیں۔ خدا کی بندگی کرنے والوں میں، خدا کے چاہنے والوں میں، خدا کی معرفت کے رکھنے والوں میں، خدا کے پہچاننے والوں میں، خدا کے آگے جھکنے والوں میں، اور

خدا کے احکام کے رائج کرنے والوں میں سب کے سردار سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔آپ ﷺ پہ خداوندِ قدوس کی ذات کھلی ہے اور اس طور سے کھلی ہے کہ کسی دوسرے پر نہیں کھلی۔آپ ﷺ نے خدا کی وہ بندگی کی ہے کہ کسی دوسری ذات نے خدا کی ایسی بندگی نہیں کی۔اس بندگی کرنے کی بناء پر، اس خدا کے پہچاننے کی بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کو اس عالم کی پیدائش کا مقصد قرار دیا۔آپ ﷺ سب سے زیادہ خدا کے پہچاننے والے تھے اَعْرَفُ النَّاس سب سے زیادہ خدا کو جاننے والے، خود فرمایا:

اَنَا اَتْقٰکُمْ لِلّٰہِ وَ اَعْلَمُکُمْ بِحُدُوْدِ اللّٰہِ (مسند احمد)

ترجمہ: میں تم سب سے زیادہ خدا کا جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں۔

خدا کی سب سے زیادہ پہچان کے رکھنے والے، خدا کی سب سے زیادہ چاہتوں کے رکھنے والے، خدا کی سب سے زیادہ محبتوں کے رکھنے والے، خدا کے آگے سب سے زیادہ جھکنے والے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خدا کی معرفت کا حق ادا کیا ہے، کوئی دوسرا خدا کو ویسا نہیں پہچان سکا جیسا کہ آپ ﷺ سے خداوندِ قدوس نے اپنے آپ کو پہچنوایا ہے۔اگر معرفت کا کسی نے حق ادا کیا اور کوئی مخلوق خدا کو اس درجے میں جان سکی جیسے کہ خدا کو جاننے کا حق تھا تو وہ ایک ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی ہے، جس نے سب سے زیادہ جانا۔باقی ہر ایک نبی اپنے اپنے مقام پر جانتا رہا اور سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقام پر خداوندِ قدوس کی ذاتِ عالی کو پہچانا۔ہر نبی کا عرفان

کامل ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عرفان ان کاملین میں سب سے زیادہ اکمل ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو پیدا فرمایا اس دُنیا کو پیدا فرمایا بندگی کے لیے، عبادت کے لیے، خدا کے آگے جھکنے کے لیے اور خدا کے احکام کی پابندی کرنے کے لیے۔ تو دوستو! اب جب یہ پورے کا پورا خاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قائم فرمایا کہ لوگ خدا کے بندے بن کر زندگی گذاریں، خدا کے حکموں پر چلنے والے بن کر زندگی گزاریں، خدا کی راہوں کو اختیار کرنے والے بن کر زندگی گزاریں۔ تو دوستو! اب آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ یہ پورے کا پورا عالم ہمارے لیے ہے، ہم اس عالم کے لیے نہیں ہیں۔ انسان غلطی اس وقت کرتا ہے، ٹھوکر انسان کو اس وقت لگتی ہے جب وہ دُنیا کو مقصود سمجھتا ہے اور خود اس کا قاصد اور چاہنے والا بن جاتا ہے، خود طالب بن جاتا ہے دُنیا کو مطلوب بنالیتا ہے، خود محبّ بن جاتا ہے دُنیا کو محبوب بنالیتا ہے، دُنیا کو چہیتا بنالیتا ہے اور خود اس کا چاہنے والا بن جاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا اس کے لیے ہے یہ دُنیا کے لیے نہیں ہے۔

؎ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

حدیث میں اس مضمون کو یوں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ان الدنيا خلقت لكم و انتم خلقتم للآخرة﴾

ترجمہ: ''یہ دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے، اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

اور ہم نے کیا کہا؟ کہ ہم تو دُنیا کے ہیں۔ ہماری پوری کی پوری محنت، ہماری پوری کی پوری طاقت، اور ہماری پوری کی پوری استعداد اس پر لگتی ہے کہ ہم

دُنیا والے ہیں۔ طالب مطلوب نہیں بنا کرتا اور مطلوب طالب نہیں ہوا کرتا۔ آج ہم نے دُنیا کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لیا، حالانکہ خداوندِ قدوس نے دُنیا کو ہمارا خادم بنایا تھا، یہ دُنیا ہمارے خادم کی حیثیت سے بنائی گئی تھی یہ اس لیے نہیں تھی کہ ہم اس پر قربان ہوتے، بلکہ یہ دُنیا ہم پر قربان ہونے کے لیے تھی۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

وَ لَا تَجۡعَلِ الدُّنۡیَا اَکۡبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبۡلَغَ عِلۡمِنَا (سنن الترمذی)

ترجمہ: ''اے اللہ! اس دُنیا کو ہمارے علم کی انتہا نہ بنا دے، ہم اپنا مبلغ یعنی اپنا انتہائی مقصد دُنیا کو نہ گردانیں، ہماری چاہتوں کا مرکز دُنیا نہ بن جائے، ہم صرف دُنیا والے ہو کر نہ رہ جائیں۔''

دوستو! دیکھو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پورے کے پورے نظام کو ہمارے لیے پیدا کیا ہے اور اگر آپ تھوڑا سا بھی غور کریں تو یہ چیز آپ پر کھل کر ظاہر ہو جائے گی کہ یہ پورے کے پورے زمین و آسمان اور ہر چیز جو کچھ کرتی ہے یہ آپ کے لیے کرتی ہے، کہنے والے نے کہا ہے:

ابرو باد و مه و خورشید وفلك در كارند
تا تو نانے بكفب آری و بغفلت نه خوری

ہمه از بہر تو سرگشته و فرمانبردار
شرطِ انصاف نباشد كه تو فرماں نه بری

ترجمہ: بادل ہوا چاند سورج سب تیرے کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو روزی حاصل کرے اور غفلت سے نہ کھائے۔ سب تمہارے لیے کام میں لگے ہوئے ہیں

اور تمہارے فرمانبردار ہیں، لہٰذا انصاف کی بات نہیں ہو گی اگر تم خدا کی فرمانبرداری نہ کرو۔

یہ سورج، یہ چاند، یہ تارے، اے انسان! ہر چیز تیرے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس کو اللہ نے تیرا خادم بنایا ہے تُو اس کا خادم نہیں۔ لیکن ہم نے دُنیا کو اپنا مقصود بنا کر گھوڑے کو گاڑی کے آگے باندھنے کی بجائے پیچھے باندھ دیا جیسے کہ انسان اس رُخ پر آ جائے کہ اگلی بات کو پیچھے کر دے اور پچھلی بات کو آگے کر دے، اور انسان بالکل اس رُخ پر آ جائے کہ اپنی قیادت و سیادت کے مقام کو چھوڑ کر غلامی اور اتنے نیچے مقام پر گر جائے کہ خادم کا یہ خادم بن کر زندگی کو گزارنے لگ جائے۔ دوستو! میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا کہ انسان جب دُنیا کو مقصود گردان لیتا ہے اور دُنیا کا طالب بن جاتا ہے اور دُنیا کے پیچھے چلنا شروع کر دیتا ہے تو یہ دُنیا کی طلب میں رہتا ہے لیکن دُنیا کو پورا حاصل نہیں کر پاتا کہ موت آتی ہے اور اس کو ختم کر دیتی ہے۔ اور جو شخص آخرت کو اپنی چاہت بنا لیتا ہے اور آخرت کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے، وہ چاہتا نہیں لیکن پھر بھی دُنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں پر آ کر گرا کرتی ہے۔ میں اکثر ایک مثال دیا کروں ...... کہ دوستو! دیکھو ہم جب راستے پر چلتے ہیں، راہ پر غبار ہوتا ہے گرد ہوتی ہے، انسان جب راہ پر چلتا ہے تو آجکل کے ہمارے جو فیشن ایبل اور ایسے جو کہ بڑا صفائی کو باقی رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں یہ نہیں چاہتے کہ ان کے جوتوں کے اُوپر بھی گرد پڑے، جوتوں کو خوب صاف کر کے چمکا کر لے جاتے ہیں لیکن چند قدم چلے ہوتے ہیں کہ وہ گرد آلود ہو جاتے ہیں۔ جوتوں پر گرد پڑ جایا کرتی ہے، چاہو یا نہ چاہو پڑ

جاتی ہے ۔تو اسی طور پر دوستو! جس وقت انسان خدا کا طالب بن کر اور آخرت کا طالب بن کر چلتا ہے تو دُنیا ذلیل ہو کر اس کے قدموں پر گرتی ہے، لیکن جب یہ دُنیا کا طالب بن جاتا ہے، تو دُنیا اس کو ذلیل کر کے چھوڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نچلی چیز کو، ادنیٰ اور سفلی چیز کو، کمینہ چیز کو اُونچا درجہ دے دیا جائے تو پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کا مزاج بگڑ جایا کرتا ہے۔تو جب ہم دُنیا کو اُونچی چیز گردان لیتے ہیں تو دُنیا ہمیں اپنے لیے ذلیل کر دیتی ہے، پست کر دیتی ہے۔ہم دُنیا کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں لیکن جس قدر کہ ہم دُنیا کو چاہتے ہیں اتنی دُنیا ہمیں ملتی نہیں۔آج آپ دُنیا کے لحاظ سے اُونچے سے اُونچے لوگوں کو دیکھ لیجئے، اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو دیکھ لیجئے جس نے بھی دُنیا کو اپنا مقصد بنایا حقیقت کے لحاظ سے اس دُنیا ہی میں رہتے ہوئے اپنے دل کے اندر ایک جہنم کو بھڑکا لیا، دُنیا کی چاہتوں کی جہنم اس کے دل کے اندر بھڑکتی رہتی ہے۔وہ چاہتا ہے کہ فلاں چاہت پوری ہو جائے، فلاں چاہت پوری ہو جائے، لیکن آخر ہوتا یہی ہے

ے ہزاروں خواہشیں ایسیں کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہزاروں چاہتیں ہوتی ہیں، ایک بات پوری نہیں ہوتی کہ دوسری بات پر لگ جاتا ہے، دوسری چاہت پوری ہوتی ہے تو تیسری پر لگ جاتا ہے۔ ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انسان کے لیے اگر سونے کی ایک وادی ہو جائے یا چلتا ہوا دریا ہو جائے تو یہ دوسری وادی کو چاہے گا اور اگر دوسری ہو جائے تو یہ تیسری کو چاہے گا، انسان کی حرص کو یا تو قبر کی مٹی بھر سکتی

ہے یا قناعت بھر سکتی ہے۔انسان کے اندر جب ایمان نہیں ہوتا اورانسان کے اندر جب دُنیا مقصود بن کر چلی آتی ہے تو انسان پوری دُنیا کو لے کر قناعت کرنے والانہیں بنتا۔

تو میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ دوستو! اس پورے کارخانۂ قدرت کواللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے، تمھیں اس کے لیے نہیں پیدا کیا۔ یہ تمہارا خادم ہے تم اس کے مخدوم ہو۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذاتِ عالی کوتمہارا مقصود گردانا اورتمہارا مدعا گردانا،اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا کہ تم خدا کے بندے بن کر، خدا کے طالب بن کر، خدا کے چاہنے والے بن کراور خدا کی رضا کے طلبگار بن کرخدا کے حکموں کے لیے اپنی جانوں کو لگاؤ، اپنے مالوں کو لگاؤ، اپنی قوتوں کوصرف کرو۔ تمہاری زندگی کا مقصد یہ دُنیا نہ ہو،تمہاری زندگی کا مقصدایک رضائے حق ہو۔خدا کو راضی کرنا تمہاری زندگی کا مدعا ہواورموت کے بعد کی زندگی کا سنوارنا تمہارا مقصود ہو۔تم دُنیا میں رہوتو اس دُنیا کے بن کر نہ رہو، بلکہ جیسا کہ ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ایک چلتا مسافر ہوتا ہے، مسافر جو ہوتا ہے وہ سفر کی حالت میں کھاتا بھی ہے پیتا بھی ہے لیکن اسے راہ جانتا ہے راہگزر سمجھتا ہے، راہگزر کو اپنا مکان قرار نہیں دیتا۔آپ میں سے غالبًا اکثر لوگ اس بستی میں آکر رہ رہے ہوں گے اور ملازم کی حیثیت سے رہتے ہوں گے۔اب جو ملازم کی حیثیت سے اچھے اچھے بنگلوں میں رہ رہے ہیں اور بڑے اچھے عالیشان مکانات میں رہ رہے ہیں کیا انھوں نے اسے اپنا مکان قرار دے لیا ہے؟ جیسے اپنے گھر کو سمجھتے ہیں جس گاؤں کے یہ رہنے والے ہیں یا جس بستی کے رہنے والے ہیں،

جیسے ان کا دل وہاں لگتا ہے کیا اس بستی میں لگتا ہے؟ یہاں کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں ہنستے بھی ہیں بولتے بھی ہیں لیکن اسے کسی نے بھی اپنا گھر قرار نہیں دیا۔ یہ ایک رہگزر ہے یہاں کچھ دن گزارو گے اور آگے روانہ ہو جاؤ گے۔ دوستو! اسی طور سے اس دُنیا کا حال ہے یہ چند دن کی بستی ہے، یہاں چند دن گزارنے ہیں، اور کچھ دن گزار کر اس سے آگے چلا جانا ہے۔ اور خداوندِ قدوس نے اس دُنیا میں تمھیں جو بھیجا ہے تو ایک بہت اُونچے انتہائی اعلیٰ مقصد کے لیے بھیجا ہے۔ دیکھو اگر کسی بچے کا والد اسے روپے دے اور روپے دے کر کہے کہ بیٹا جاؤ بازار سے ایک تولہ سونا لے آؤ، وہ بچہ بازار میں جائے اور اسے کوئی دوسری چیز پسند آ جائے، پکوڑے پسند آ جائیں کچھ اور کھانے پینے کی چیز پسند آ جائے اور وہ روپے وہاں جا کر خرچ کر آئے تو کیا اس کا باپ اس پر خوش ہو گا؟ قطعاً خوش نہیں ہو سکتا۔ اسی طور پر اس دُنیا کے بازار میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو بھیجا ہے جیسے کہ مال لے کر کوئی شخص بازار میں خرید کے لیے جاتا ہے اسی طور پر دُنیا کے بازار میں خداوندِ قدوس نے تمہارے اندر ایک استعداد رکھ کر تمھیں بھیجا ہے اور وہ ایسی استعدا ہے کہ فقیر چاہے تو وہ بھی اسے استعمال کر سکتا ہے، شاہ چاہے تو وہ بھی اسے استعمال کر سکتا ہے، دولت والا چاہے تو وہ بھی اسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہر شخص کے اندر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک طاقت رکھی ہے، ایک قوت رکھی ہے، ایک استعداد رکھی ہے۔ اور وہ استعداد کس چیز کی ہے؟ کہ اگر انسان صحیح رُخ سے اس استعداد کو استعمال کر لے، اس استعداد کو استعمال کر لینے سے انسان خدا کی رَضا کو حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ نے دُنیا کے بازار میں تمھیں خاک مٹی کے خریدنے کے لیے نہیں بھیجا، اس دُنیا کے خاکوں

کوخریدنے کے لیےنہیں بھیجا۔تم اس دُنیا میں بھیجے گئے ہو،ایک مایہ دے کر بھیجے گئے ہو، یہ تمہارے دل کی مایہ یہ تمہارے اعضاء و جوارح کی مایہ ہے، یہ جو دو قوتیں تمھیں دی گئیں تمہارا دل اورتمہارا جسم، یہ ہرانسان کے ساتھ ہیں، اگر شاہ ہےتو اس کے ساتھ بھی اس کا دل ہے، اگر گدا ہےتو اس کے ساتھ بھی اس کا دل ہے، اگر کوئی شخص کسی مقام پر کالا ہےتو وہ بھی دل رکھتا ہے، گورا ہےتو وہ بھی دل رکھتا ہے، فقیر ہےتو وہ بھی دل رکھتا ہے، امیر ہےتو وہ بھی دل رکھتا ہے۔ جتنے اعضاء تمھیں دیے گئے اتنے ہرشخص کو دیے۔اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دُنیا میں اس لیے بھیجا کہ میری قیمت تمہارے دل اورتمہارے جسم کا صحیح استعمال ہے۔اگرتمہارا دل اورتمہارا جسم اس دُنیا میں صحیح استعمال ہوگیا تو میں تمھیں مل جاؤں گا۔تم میرے خریدار بن کراس بازار میں آؤ، جب میرے خریدار بنو گےاور اپنے دل کوصحیح رُخ پہ استعمال کرو گے اور اپنے جسم کوصحیح رُخ پہ استعمال کرو گےتو میں تمہارا ہو جاؤں گا اور جب میں تمہارا ہو جاؤں گا:

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ

ترجمہ: ''جواللہ کا ہوجا تا ہےاللہ اس کے ہوجاتے ہیں''

اور جوخدا کا ہوجا تا ہےخدا کی پوری کائنات اس کے قدموں پرآکرگر جاتی ہے۔

دیوانۂ خود کنی و ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہردو جہاں را چہ کند

ترجمہ: تم اپنا دیوانہ بناتے ہواور پھر دونوں جہان عطا کرتے ہو،تمہارا دیوانہ دونوں جہانوں کا کیا کرے گا۔

جو اُس کا ہو گیا لوح بھی اس کا، قلم بھی اس کا، زمین بھی اس کی، آسمان بھی اس کا، جنتیں بھی اس کی۔ پوری کائنات اس کے قدموں پر بچھ جاتی ہے جو خدا کا بن جاتا ہے۔ خدا کا بننے کے لیے ضروری نہیں کہ اگر تم تخت پہ جا کے بیٹھو گے تو خدا تمھیں ملے گا۔ یہ بات نہیں، یہ ضروری نہیں کہ تمھیں حکومت ملے تو تم خدا والے بن سکتے ہو، اگر تم مال والے ہو تو تم خدا والے بن سکتے ہو۔ خدا کے لینے کے لیے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو حکومت کی ضرورت، نہ دولت کی ضرورت، نہ ملک کی ضرورت، نہ مال کی ضرورت۔ ایک قلبِ سلیم کی اور ایک جسمِ صالح کی ضرورت ہے، بس۔ ایسا دل جس میں کہ غیر نہ سمائے، اور ایسی آنکھ جس میں دوسرا نہ سمائے، وہ ہاتھ جو کہ غیر کے لیے استعمال نہ ہو، وہ پاؤں جو غیر کے لیے نہ چلے، وہ جسم جو غیر کے لیے استعمال نہ ہو۔ اندر سے لیکر باہر تک اور ظاہر سے لیکر باطن تک، دل سے لے کے جسم تک انسان کلیۃً خدا کا ہو جائے، بس۔ اگر خدا کے ہو جاؤ تو خدا تمہارے ہو جائیں گے اور خدا کا انسان کیسے ہوتا ہے، خدا کا انسان کیسے بنتا ہے ...... اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا بنانے کے لیے، اور جسم کے صحیح استعمال کے لیے، اور دل کے صحیح استعمال کے لیے اس عالم میں ہر زمانے میں ایک مخلوق کو بھیجا اور وہ مخلوق کونسی تھی انبیاء علیہم السلام والی۔ انبیاء علیہم السلام ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش آئے۔ اور جو نبی بھی آیا کسی نبی نے آکر یہ دعوت نہیں دی کہ دُنیا والے بن جاؤ تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہر ایک نبی نے آکر یہ آواز دی کہ خدا والے بن جاؤ تو کامیاب ہو جاؤ گے، آخرت والے بن جاؤ تو کامیاب ہو جاؤ گے، اپنے دل کو بنا لو تو کامیاب ہو جاؤ گے، اپنے جسم کو بنا لو تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ تمہاری کامیابی

خارج پر منحصر نہیں ہے تمہاری کامیابی تمہارے اندرون پر منحصر ہے۔ اگر تمہارا دل بن گیا تو تم بھی بن جاؤ گے۔ اور دل کا بننا کس پر موقوف ہے؟ ...... دل کیسے بنتا ہے؟ ...... دل بنتا ہے خدا کے یقین کے ساتھ۔ جیسے ہمارے اندر رُوح ہوتی ہے تو ہم زندہ ہوتے ہیں اور رُوح نہیں ہوتی تو ہم ایک لاش بن جاتے ہیں، ایسی لاش جسے کوئی بھی گوارا نہیں کرتا۔ میرا دَھڑ اس وقت اپنے اندر رُوح کو رکھتا ہے، بندہ ہوں یہاں بیٹھا ہوں، آپ میری بات کو سن رہے ہیں، اگر اسی وقت خداوندِ قدوس کا فرشتہ آجائے اور مجھ سے اس رُوح کو چھین کر لے جائے تو آپ غالباً مجھے ایک گھنٹے تک مسجد میں بلکہ پندرہ منٹ تک بھی مسجد میں گوارا نہیں کریں گے، چاہیں گے کہ جلد سے جلد یہ مردہ لاش یہاں سے باہر نکال کر پھینک دی جائے۔ لاشوں کو کوئی نہیں چاہا کرتا، مُردوں کو کوئی نہیں چاہا کرتا۔ زمین میں ہی جاکر وہ کھپ جاتے ہیں جو مردہ ہیں۔ انسان اپنی رُوح کے ساتھ زندہ ہے، اور رُوح نہیں ہے تو انسان مردہ ہے۔ جس طور پر انسان کی جان رُوح ہے ایسے ہی رُوح کی جان خدا کا تعلق ہے، خدا کا یقین ہے، خدا کا ایمان ہے، خدا کی محبت ہے، خدا کی خشیت ہے، خداوندِ قدوس کے طریقوں پر آنا ہے۔ تو دوستو! انبیاء علیھم السلام سب سے پہلے آکر ہمیں ایک دعوت دیتے ہیں، ایک بات ہمیں بتاتے ہیں اور وہ بات ایسی بات ہوتی ہے کہ دیکھو اُجڑی ہوئی کھیتی ہو اور جہاں خشک سالی کی وجہ سے کچھ بھی چیز پیدا نہ ہو رہی ہو، اگر وہاں پانی دے دیا جائے تو کھیتی سرسبز و شاداب ہو جایا کرتی ہے، اسی طور سے دوستو! جس وقت کہ بدن کی اُجڑی ہوئی کھیتیاں جن میں کہ ایمان وتقویٰ کا کوئی بھی گل بوٹا نہیں اُگتا، انبیاء آتے ہیں اور اس کے اُوپر ایک چھینٹا دیتے ہیں دعوت کا، اور ایمان کی

آواز لگاتے ہیں اور ایک بات کہتے ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دیکھو دلوں کے اندر ایک چیز کو پیدا کرو، دلوں کے اندر یقین کی مایہ کو لے آؤ، یہ دل معمولی چیز نہیں ہے یہ دل وہ چیز ہے کہ جس دل کے ذریعے تم خداوندِ قدوس کی ذات کو لے سکتے ہو

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ترجمہ: میرے جنون کے جنگل میں جبریلؑ پھنسا ہوا ہے، اے ہمت مردانہ تو تو خدا تعالیٰ پر کمند ڈال۔

تم اپنے اندر خدا کی ذات کو لے سکتے ہو، خداوندِ قدوس کے تعلق کو لے سکتے ہو، خدا والے بن سکتے ہو۔ لیکن اس کی صورت کیا ہے؟ ...... کہ اپنے دلوں کے اندر یقین کی مایہ پیدا کرلو۔ اور یقین کسے کہتے ہیں؟ ...... یقین الفاظ کا نام نہیں ہے، یقین نرے بولوں کا نام نہیں ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ صرف لفظوں کا نام نہیں ہے، یہ الفاظ اپنے اندر ایک حقیقت رکھتے ہیں کہ ہر غیر سے منقطع ہوکر، ہر غیر سے کٹ کر ایک خدا کا ہو جانا اور یوں سمجھ لینا کہ ایک خدا سے سب کچھ ہوتا ہے، جو کچھ اس زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، جو تھا، جو ہے اور جو ہوگا یہ سب خدا کی ذات سے ہوتا ہے اور خداوندِ قدوس ہی خالق و مالک ہے۔ خداوندِ قدوس کی محبت کے فوارے ہمارے قلوب کے اندر اس طور سے آجائیں کہ ایک خدا کے سوا ہم کسی کے چاہنے والے نہ رہیں۔ دوستو! جب دلوں کے اندر خدا تعالیٰ کی محبت آجاتی ہے، اس کی خشیت آجاتی ہے، اس کا یقین آجاتا ہے تو دل زندہ ہو جایا کرتے ہیں، دلوں میں نور آجایا کرتا ہے۔ جیسے کہ آپ یہاں بجلی کو ظاہری طور پہ پیدا کرتے ہیں، اب یہ

بلب سب آپ لگا دیں لیکن اس کے اندر کرنٹ نہ چھوڑیں تو گھپ اندھیرا ہوتا ہے، اسی طور پر جس وقت تک کہ انسانوں کے دلوں کے اندر ایمان کا نور نہیں آتا، یقین کا نور نہیں آتا آپ الفاظ کی تاریں خوب پھیلاتے چلے جائیں لیکن جب تک اس کے اندر ایمان و یقین کے نور کے کرنٹ کو نہیں چھوڑیں گے خدا کی قسم ویسے کا ویسا گھپ اندھیرا رہے گا۔ جب تک کہ یقین کی مایہ کامل نہیں ہوگی، یقین مکمل نہیں ہوگا تب تک خداوندِ قدوس کا تعلق کامل نہیں ہوگا۔ دوستو! نہ تو ہمارے اعمال میں جان ہوگی اور نہ ہماری اپنی جانوں میں جان ہوگی۔ انسان مردہ ہے اور انسان خدا کے تعلق سے زندہ ہوا کرتا ہے۔

خدا کا تعلق انسان کو میسر آتا ہے ایک طریقے سے اور وہ طریقہ انبیاء علیھم الصّلوٰۃ السلام آکر بتاتے ہیں اور سب سے آخر میں آکر ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو کھولا۔ یہ عرض کر رہا تھا کہ دیکھو! نبی آکر دو ہی باتیں بتاتے ہیں، باقی سب اس کی شاخیں ہوتی ہیں

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر:۳)

ترجمہ: مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے (کہ یہ کمال ہے) ایمان اور عملِ صالح۔

دل کے بننے کا نام ایمان اور جسم کے بننے کا نام عملِ صالح۔ دل صحیح استعمال ہو جائے اور دل میں قوت آجائے اور دل خدا سے لینے کے قابل بن جائے اور اس کے اندر اتنی استعداد آجائے کہ خداوندِ قدوس کے انوارات کو وہ اپنے اندر جذب کر سکے اور خداوندِ قدوس کی ذات کو وہ اپنے اندر سمو سکے، یہ دل غیر سے فارغ ہو جائے

اور اللہ کی ذات میں شاغل ہو جائے اور خدا والا دل بن جائے تو دوستو! وہ دل دُرست استعمال ہو گیا۔ قرآن میں آتا ہے قیامت کے دن کوئی چیز فائدہ نہیں دے گی

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ o اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ o

ترجمہ: جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا۔ (الشعراء۔۸۸،۸۹)

کل قیامت کے دن نہ تو اموال فائدہ دیں گے اور نہ ہی بیٹے فائدہ دیں گے اِلَّامَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ o سوائے اس شخص کے جو کہ اللہ کے پاس بے روگا اور سلیم دل لے کر آیا۔ ایسا دل جس میں غیر کی بیماری نہیں ہے، غیر کا روگ نہیں ہے، غیر کی محبت نہیں ہے، غیر کی طلب نہیں ہے، وہ صرف خدا کا چاہنے والا ہے۔ خدا کو ایسا دل پسند نہیں، خدا اس دل کو نہیں چاہتے جو دوسروں کو بھی چاہتا ہو۔ بلا تشبیہ ایک بات عرض کروں دوستو دیکھو! کوئی غیرت مند مسلمان ایسا ہوگا، مسلمان کا لفظ میں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے، جس کی شادی ہوئی ہو اور اس کی بیوی خدانخواستہ اس کی بیوی ہونے کے باوجود شرافت کا دعویٰ کرنے کے باوجود، اس کا خاوند جانے کہ میری بیوی کا تعلق کسی غیر سے ہے، کیا وہ اس بیوی کو برداشت کرے گا؟ ایک غیرت مند آدمی ہے اور اس کی بیوی ہے، منکوحہ بیوی ہے اور کہتی کہ میں تیری بیوی ہوں لیکن خاوند کو پتہ چل جائے کہ میری تو شریف بیوی بنتی ہے لیکن حقیقت میں اس کا کسی دوسرے کے ساتھ تعلق ہے، تو کیا شریف خاوند اسے برداشت کر لے گا؟ ...... کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ کوئی ایسی عورت ہو جو میری ہوتے ہوئے کسی غیر کی بن جائے۔ تو دوستو! تھوڑی دیر کے لیے اتنا سوچیے میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب غیرت مندوں سے زیادہ غیرت والا ہے، اس لیے اس نے بے حیائی کی چیزوں کو حرام کیا ہے۔تو غیرت مند خدا جس کا کہ ہم دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ اے خدا ہم تیرے ہیں۔

؎ تم مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
تم کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

؎ بتوں کا ہے بندہ، خدا کا نہیں ہے
خدا کا نہ ہو جو مسلمان ہو کر

مسلمان ہوتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ مسلم وہ ہے جو کہ ہر غیر سے کٹ کٹا کر، ہر چیز سے نکل کر کلیتًا اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے

؎ عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودند
دل بدستِ دیگرے دادن و حیراں بودند

ترجمہ: عاشقی کیا ہے؟ کہو کہ محبوب کا بندہ بن جانا، دِل دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا اور حیران ہو جانا۔کلیتًا خدا کا ہو جانا

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (المزمل۔۸)

ترجمہ: اور پڑھے جا نام اپنے ربّ کا اور چھوٹ کر چلا آ اس کی طرف سب سے الگ ہو کر۔

ہر ایک سے کٹ کٹا کر ایک خدا کی محبت ہو کہ پھر کسی دوسرے کو نہ چاہو۔ اگر دوسرے کو بھی چاہتے ہو اور خدا کو بھی چاہتے ہو تو یہ ایمان کا کمال نہیں ہے۔

ایمان کی غیرت یہ چاہتی ہے کہ مؤمن کے دل میں ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا نہ ہو۔ وہ دل جو خدا والا ہو گیا وہ دل درست ہو گیا۔ اور ایسا دل جو کہ کلیتاً خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اس کا ہر عمل دُرست ہو گا۔ دیکھو ایک موٹی سی مثال میں عرض کروں، ایک شخص کو اگر سردی محسوس ہوتی ہے اور وہ دھوپ میں جا کر بیٹھ جاتا ہے اور دھوپ کچھ دیر اسے لگتی ہے تو اس کے جسم کی وہ ہڈیاں جو کہ سردی کی وجہ سے خشک ہو چکی ہیں انھیں کچھ گرمائش پہنچتی ہے اور ان میں طاقت آ جاتی ہے، سردی اس کی ختم ہو جاتی ہے وہ گرمائش کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ سورج سامنے ہی موجود ہوتا ہے لیکن اگر وہ کمرے کے اندر ہو، سائے میں بیٹھا ہوا ہے اور تمازت کو نہیں لیتا تو سردی محسوس ہوتی رہے گی۔ جب سورج کے سامنے جا کر بیٹھے گا تو سورج کی گرمائش کو لے لے گا۔ اسی طور پر دوستو! جس وقت تک ہمارا دل غیروں کی طرف متوجہ رہتا ہے تو خدا کے لطف و الطاف والے دھیان میں نہیں آتا، خدا کے رحمت والے دھیان میں نہیں آتا، خدا کی عطائے خاص کے دھیان میں نہیں آتا۔ اور جب انسان اپنے دل کو ہر ایک سے فارغ کر کے صرف خدا کی طرف کر لیتا ہے اور یوں کہہ دیتا ہے:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

وَّمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ O (الانعام:۷۹)

ترجمہ: میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

میں نے اپنے دل کے رُخ کو اپنے پورے کے پورے چہرے کو اور اپنے رُخ کو تیری ذات کی طرف کر دیا، ہر غیر سے میں نے اپنے آپ کو پھیر لیا اور میں کلیۃً

تیری طرف متوجہ ہوں، یک سُو ہو کر میں تیرا ہو چکا ہوں۔ جس وقت انسان یوں کہتا ہے اور ہر ایک سے کٹ جاتا ہے تو خدا کی پوری کی پوری توجہات اس کی طرف ملتفت ہونے لگتی ہیں اور خداوندِ قدوس اس کے دل کو اپنے نور سے بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خدا کے نور کو لینے کے لیے تمہارے دلوں کا خدا کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ دوستو! اس کی موٹی سی مثال دوں۔ دیکھئے آپ تو بجلی والے ہیں اس لیے میں بجلی کی مثال دیتا ہوں، بجلی یہاں موجود ہے اور باہر لگا ہوا ہے سوئچ لیکن پلگ جب تک کہ اس کے ساتھ لگتا نہیں اس کے اندر بجلی کا کرنٹ نہیں آئے گا۔ اور اگر آپ نے پلگ کو اس کے ساتھ ہاتھ سے لگا بھی دیا لیکن وہ پورا کا پورا ٹچ (Touch) نہیں کرتا، اس کے ساتھ چھوتا نہیں ہے تب بھی وہ پوری کی پوری کرنٹ کو اپنے اندر نہیں کھینچے گا۔ جس طور پر کہ آپ بجلی لینے کے لیے پلگ کو پورا کا پورا اس سوئچ کے اندر ڈال کر اس سے بجلی کو لیتے ہیں، دوستو! اسی طور پر بِلا تشبیہ کہئے کہ آپ کا دل جس وقت کہ ہر غیر سے منقطع ہو کر خدا کی ذات کے ساتھ اپنی توجہ کے پلگ کو کلیۃً لگا نہیں دیتا اور ہر غیر سے منقطع ہو کر خدا کی طرف جب تک تمہارا پورا دھیان نہیں ہو جاتا تم خدا کے نور کو نہیں لے سکتے، خدا کا نور اسی وقت لو گے جب غیر سے تمہارا دل خالی ہو گا۔ اور جب تمہارا دل غیر میں اٹکا ہوا ہے تو دوستو! خدا وہاں کیسے آئے؟ دیکھو! یہ مصلےٰ پڑا ہوا ہے، امام صاحب اس پر نماز پڑھتے ہیں، اور امام کا مصلےٰ دوسروں کے مصلوں سے تو زیادہ ہی پاک ہوتا ہے، دیکھو! اگر اس مصلےٰ کے اُوپر خدانخواستہ کچھ گندگی آ جائے اور گندگی ایسی یعنی ایک تولے سے زیادہ نجاستِ غلیظہ ہو اور یہ نجاست پھیل جائے تو اس پہ نماز ہو سکے گی؟ مصلےٰ پر نماز ہو سکے

گی؟ ......نہیں ہوگی ۔ آپ کے کپڑوں کے اُوپر نجاست لگ جائے تو کیا نماز کا عمل ان کپڑوں سے ہوسکے گا؟ آپ کے جسم پر نجاست لگ جائے آپ کی نماز ہو سکے گی؟ ......نماز کا عمل ہے خدا سے لینے کا عمل ۔ خدا سے لینے کا عمل جب نجاست کے ساتھ نہیں ہوسکتا تو خدا اس جگہ پر آ کیسے سکتے ہیں جہاں کہ غیر کی نجاستیں پڑی ہوئی ہیں؟ انسان کا دل جب تک کہ غیر کی نجاست کے ساتھ اَٹا ہوا ہے، دیکھو! خدا کی نسبت کے ساتھ خدا کے مقابلے میں ہر غیر جو ہے وہ ناپاک ہے، خدا کے تعلق کے ساتھ ہی کوئی چیز پاک ہوتی ہے ۔ دوستو! جس دل میں غیروں کی محبتیں سرایت کی ہوئی ہوتی ہیں، غیروں کے تعلق بنے ہوئے ہوتے ہیں اور جو دل خدا کے لیے فارغ نہیں ہوتا، دوستو! خداوندِ قدوس کے انوارات وہاں نہیں آیا کرتے ۔ میرے مثال کے پیش کرنے کا مدعا یہ ہے کہ جس طور پر ناپاک جائے نماز پر آپ نماز نہیں پڑھتے اسی طور پر ناپاک دل پر خدا محبت کی نظر نہیں ڈالتے، خدا عنایت کی نظر نہیں کرتے ۔ خداوندِ قدوس ان دلوں پر اپنے انوارات کی بارش نہیں کرتے جو کہ غیر میں اَٹکے ہوئے ہوتے ہیں ۔

تو اب دلوں کے بنانے کے لیے سب سے پہلے دلوں کو غیر سے فارغ کیجیے، اور دل اس وقت تک غیر سے فارغ نہیں ہوتے جب تک کہ خدا کا یقین نہیں آتا ۔ یقین سے کیا مدعا ہے؟ ......آپ جب تک یہ نہیں جانیں گے کہ عزت کلیتاً خدا کے ہاتھ میں ہے، ذلّت خدا کے ہاتھ میں ہے، موت خدا کے ہاتھ میں، حیات خدا کے ہاتھ میں، دینا خدا کے ہاتھ میں، لینا خدا کے ہاتھ میں، سب کچھ خدا کے ہاتھ میں جب تک آپ نہیں سمجھیں گے تب تک ایمان کامل نہیں ہوگا ۔ انسان ہے حاجت مند

اور ضرورت مند، انسان اپنی حاجت کے لیے کبھی کسی کے دَر پر جاتا ہے کبھی کسی کے دَر پر جاتا ہے۔ کہیں تو عزت کے لینے کے لیے جائے گا، کہیں پہ رزق کے لینے کے لیے جائے گا لیکن جو شخص خدا سے سب کچھ سمجھے گا وہ کسی دوسرے کے دَر کے آگے نہیں جھکے گا۔ جس وقت تک کہ خدا کا یقین کامل نہیں ہوتا انسان غیروں کے پیچھے پھرتا ہے، اور جب خدا کا یقین آجاتا ہے تو سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان ایک خدا کے دَر پر آکر پڑ جاتا ہے اور خدا سے لینے والا بن جاتا ہے۔ جب خدا کا یقین انسان کے اندر آتا ہے تو انسان کا دل بن جاتا ہے، اور جب انسان کا دل بنتا ہے تو اس کے اندر تقویٰ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ایمان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تو جس طور پر نبیوں نے دلوں کے بنانے کا طریقہ بتایا، انھوں نے جسموں اور اعضاء کے بنانے کا طریقہ بھی بتایا، اعضاء کیسے بنتے ہیں؟ جیسے دل ایمان و یقین سے بنتا ہے انسان کے اعضاء خداوندِ قدوس کے بتائے ہوئے اعمال سے بنتے ہیں۔ ہماری آنکھ اس جگہ پر استعمال ہو جہاں حبیبِ خدا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اپنی آنکھ کو جائز پر استعمال کرو ناجائز پر استعمال نہ کرو، اپنی زبان کو حق کے لیے استعمال کرو باطل کے لیے استعمال نہ کرو۔ اپنے ہاتھ کو صحیح کام کے لیے استعمال کرو غلط کام کے لیے استعمال نہ کرو۔ تمہارے قدم خیر کے راستے میں اُٹھیں غلط راستے میں نہ اُٹھیں۔ تمہارا معدہ حلال کا کھانے والا ہو حرام کا کھانے والا نہ ہو۔ تمہارے جسم کے ایک ایک حصے کے سامنے اس کا مقصد ہو اور تمہارا جسم صرف اُسی رُخ پر استعمال ہو جو رُخ کہ نبیٔ پاک سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ دوستو! جس طور پر دل خدا کی مناسبت کو لے کر دل بن جاتا ہے اسی طور پر

جسم سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال کو لے کر جسم بن جاتا ہے۔ایک تو جسم وہ ہیں جو کہ ظاہراً انسانوں کے جسم ہیں لیکن حقیقت میں بقول مولانا رومؒ کے ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

ترجمہ: کئی شیطان صفت آدمی کے روپ میں ہوتے ہیں۔

ظاہر میں تو انسان کے جسم ہوتے ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے وہ اجسام حیوانوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔انسان کا جسم جب انسانیت کے مقام پر آتا ہے، جب وہ عبدیت کے مقام پر آتا ہے تو اس کا ایک ایک عضو خدا کی ذات سے لینے والا بن جاتا ہے۔اس کے اندر نور سرایت کرتا ہے۔اس کی آنکھ نور کو لیتی ہے، اس کا پاؤں نور کو لیتا ہے، اس کا ہاتھ نور کو لیتا ہے، وہ سب کا سب نورانی بن جایا کرتا ہے جس وقت کہ انسان کے اندر اعمالِ محمدیہ آتے ہیں۔دوستو! ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہ اعمال دیے جن اعمال کو اختیار کر کے ہمارا جسم بن سکتا ہے اور ہم خدا والے بن سکتے ہیں۔میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اللہ نے اس دنیا میں ہمیں دو چیزیں دے کر بھیجا، اور ان دو چیزوں کے ذریعے سے ہم خدا کی ذات کو لے سکتے ہیں، ایک دل اور ایک جسم۔اگر دل بن جائے، یقین والا ہو جائے اور جسم بن جائے یعنی جسم اعمالِ محمدیہ والے ہو جائیں تو دوستو! یہ دو چیزیں ہمارے پاس ایسی آجائیں گی کہ خدا کی ذات ہمیں میسر آجائے گی، ہم خدا والے ہو جائیں گے۔اور جب خدا والا انسان ہو جاتا ہے تو اس کا کیا کمال ہوتا ہے؟...... دیکھئے نبی تو نبی ہوتے ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے، ایک

ہاتھ کے اشارے سے چاند دوٹکڑے ہوجاتا ہے، ہاتھ میں کنکریاں لیں انھوں نے کلمہ پڑھ دیا، خداوندقدوس نے چاہاتو ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے، درخت کواشارہ کیا درخت قریب آ گیا۔تھوڑا سا پانی ہےاور چودہ سو کا مجمع ہے لیکن اسے کافی ہو جاتا ہے۔ یہ کیا تھا؟ ...... خداوندِ قدوس کی قوتیں جب بندے کی طرف ملتفت ہو جاتی ہیں، متوجہ ہو جاتی ہیں،خدا کی برکات اور خدا کی عنایات اور خدا کی معیت بندے کے ساتھ ہو جاتی ہےتو خداوندِ قدوس کی پوری مخلوق اس کے اشاروں پر کام کرنے لگتی ہے۔ایک بزرگ گزرے ہیں بہلول دانا ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے اورریت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہارون رشید کا ادھر سے گزر ہوا تو کہنے لگا اے پگلے ! کیا کررہا ہے؟ جیسے چھوٹے بچے ریت کو اچھال رہے ہوتے ہیں،تُو یہ کیا کرر ہا ہے؟ کیا حال چال ہے تیرا؟ کہنے لگا کہ میرا کیا حال پوچھتے ہو، میرے اشاروں پرتو دنیا ناچ رہی ہے۔ ہارون کہنے لگے کہ اللہ کے بندے کوئی ایمان کی بات کرکیا کفر کی بات کرتا ہے۔کہنے لگے ؎

چو رضائے من رضائے حق شود

جب میری رضا خدا کی رضا ہوگئی اوراس کی رضا میری رضا ہوگئی۔تو جو وہ چاہتا ہے میں چاہتا ہوں لہٰذا میرے اشاروں پرتو دنیا ناچ رہی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جب تم مرادِحق بن جاؤ گے، جب تم مطلوبِ حق بن جاؤ گے، جب تم محبوب حق بن جاؤ گےتو خدا تمہاری چاہتوں کواس طور پر پورا کرے گا کہ تم چاہو گے یا نہیں

جا ہو گے خدا تمہاری مُرادوں کو بر لائے گا۔تم خدا کے چہیتے ہو جاؤ گے،تم خدا کے مُراد ہو جاؤ گے۔دیکھو جو کسی کا محبوب ہو جاتا ہے تو وہ نہیں پسند کرتا کہ محبوب کو کانٹا تک چبھ جائے، اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا۔یہ علیٰحدہ بات ہے کہ کسی حکمت کی بناء پر اور کسی خاص ضرورت کی بناء پر...... ہم اسے ضرورت نہ سمجھتے ہوں اور خدا کی ذات اسے ضرورت سمجھتی ہو اور اسے کوئی تکلیف دے دی جائے ...... ورنہ حقیقت کے لحاظ سے محبوبین کو پھولوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔محبوبین کو اتنا پیارا رکھا جاتا ہے کہ دوستو! جب ہم خدا کے ہو جائیں گے تو کیا یہ پوری کی پوری مخلوق ہماری نہیں ہو جائے گی؟ یہ سب ہمارے قدموں میں ہو گی۔

انبیاء نے ہمیں یہ سیدھا سادہ رستہ بتا دیا کہ اس راستے کو اختیار کر لو، اس راستے کو اختیار کرنے سے تمہاری بہت ساری محنت بچ جائے گی۔دیکھو! ایک محنت ہے چیزوں کی محنت، ہر شخص ایک ایک چیز کو مقصد بنا کر اُس پر محنت کرے اور اسے حاصل کرے، اور ایک ہے کُل کی محنت۔ایک ہے جز کی محنت (چیزوں کی) اور ایک ہے کُل کی محنت۔کُل کی محنت جو کرے گا اس کے ہاتھ میں کُل آئے گا، اور جو جز کی محنت کرے گا اس کے ہاتھ میں جز آئے گا۔اگر کوئی شخص خدا کی محنت کرے گا تو اس کے ہاتھ میں خدا بھی آئے گا خدا کی خدائی بھی آئے گی۔ایک شخص صرف ایک پھول کو لینے کے لیے محنت کرتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک ہی پھول آئے گا، اور ایک شخص گلدستے کے لیے محنت کرتا ہے تو اس کے ہاتھ میں گلدستہ آئے گا۔اسی طور پر آپ محنت کرتے ہیں ایک جگہ کی، ایک زمین کے آباد کرنے کی تو ایک ہی زمین کو آپ آباد کریں گے، آپ ایک ملک کو لینے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ ایک ملک کو لیں

گے۔ یہ تمام اجزاء ہیں یہ جزو ہیں، یہ پوری کی پوری دنیا جزو ہے، یہ کل نہیں ہے، خدا کی خدائی میں ہفت اقلیم ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک ذرّے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ کل کی حیثیت نہیں رکھتے۔تو جب آپ اجزاء پر محنت کریں گے تو آپ کو جزو ملے گا اور جب خدا پر محنت کریں گے تو خدا ملے گا۔اردو کا محاورہ ہے کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، جب خدا تمہارا ہو گیا تو اس کی پوری خدائی تمہاری ہو جائے گی۔تو یہ انبیاء کیا طریقہ بتاتے ہیں؟...... وہ تمھیں یوں نہیں کہتے کہ تم خاروخس پر محنت کرو، تم مٹی کے گھروندوں پر محنت کرو، بلکہ تمھیں خدا پر محنت کرنا سکھاتے ہیں، کہ خدا پر محنت کر لو تو خدا تمہارا ہو جائے گا، اور جب خدا تمہارا ہو جائے گا تو کیا ہو جائے گا؟...... یہ دنیا بھی تمہاری ہو جائے گی اور آخرت بھی تمہاری ہو جائے گی۔ دنیا تو تمھیں چونگے کے طور پر مل جائے گی، ضمیمے کے طور پر مل جائے گی، دنیا تو ایسے ہی دے دی جائے گی۔ صحابہ کرامؓ کے قدموں میں آ کر جب یہ دنیا گری تو اس طور پر گری کہ اسے ہٹاتے تھے اور یہ قدموں میں آ کر گرتی تھی۔ ہم دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن دنیا ہمیں نہیں ملتی، اور صحابہ کرامؓ دنیا کو ہٹاتے تھے لیکن ان کے قدموں پر آتی تھی۔جس وقت کہ کسریٰ کے خزائن مسجدِ نبوی میں آ کر لگے ہیں تو سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔لوگوں نے کہا کہ اے امیرالمؤمنین! یہ رونے کا وقت تو نہیں یہ تو شکر کا وقت ہے کہ اتنی سات پشتوں کی دولت جو کسریٰ نے اکٹھی کر رکھی تھی اللہ نے آپ کے قدموں میں لا کر ڈال دی ہے۔ کہنے لگے یہ وہ دولت ہے جس نے انھیں ہلاک کیا، آج یہ دولت ہمارے پاس آ گئی اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پڑھی

فَوَاللّٰہِ مَا الْفَقْرَ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ وَلٰکِنْ اَخْشٰی عَلَیْکُمْ اَنْ تُبْسَطَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا کَمَا بُسِطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ فَتَنَافَسُوْھَا کَمَا تَنَافَسُوْھَا وَتُلْھِیَکُمْ کَمَا اَلْھَتْھُمْ (بخاری)

ترجمہ: میں تم پر فقر کا خوف نہیں کھاتا لیکن دنیا کا خوف کھاتا ہوں کہ تم پر پھیل جائے اور تمھیں بھی ویسے ہی ہلاک کردے جیسے پہلوں کو ہلاک کیا تھا۔

تو دوستو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دولتیں آتی تھیں لیکن دولتوں کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ دنیا قدموں میں تھی، دریاؤں نے انھیں راہیں دیں، سمندروں نے انھیں راہیں دیں، مُردے ان کے ہاتھوں سے زندہ ہوئے۔ قیروان کا علاقہ ہے، قیروان کی بستی آجکل الجزائر کے علاقے میں بہت بڑی چھاؤنی ہے، جب یہ بستی آباد کرنے کے لیے گئے وہاں چھاؤنی ڈالی ہے اور عقبہ بن نافعؓ ایک صحابی ہیں، جس وقت اس مقام پر پہنچے، ان دنوں میں وہاں بہت بڑا جنگل تھا اور چیتے اور درندے اور خزندے بہت قسم کے جانور وہاں رہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ وہاں عقبہ بن نافعؓ نے کھڑے ہو کر یہ آواز لگائی کہ اے جنگل کے درندو اور اے خزندو! دیکھو اس جنگل کو خالی کر کے نکل جاؤ، ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اگر کل تک تم یہاں رہے تو تمہارا خون حذر (ضائع) ہوگا اور ہم نے تمھیں قتل کر دیا تو پھر تم ناراض نہ ہونا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اگر شیرنی ہے تو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو منہ میں پکڑے ہوئے جیسے بلّی بھگا کر لے جاتی ہے لیکر بھاگ رہے تھے۔ جانور تک ان کے حکم کو مانتے تھے اور جنگلوں کو خالی کر کے چلے جاتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں اپنے غیب کے خزائن سے رزق دیتا تھا، اور سب کچھ

انھیں ملتا تھا کیونکہ وہ خدا کے ہوگئے تھے ۔اور دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت محمدیہ مرحومہ پر انتہائی فضل فرمایا، اس امت کو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنایا، اس نبی کی امت بنایا جس جیسا نبی پیدا نہیں ہوا، جو خود نبی الانبیاء ہے، جس کے سینے کے انوارات سے پورا عالم روشن ہے شَمْسُ النبوة و الرسالة جو نبوت کا بھی سورج ہے اور رسالت کا بھی سورج ہے۔اللہ نے تمھیں وہ نبی دیا اس نبی کی قدر کرو، اس نبی کی قدردانی کو پہچانو اس کے مقام کو جانو اور اس کی قدر کرلو۔دوستو! نبی کی قدر کا پہچاننا کیا ہے؟ کہ نبی نے جو میراث تمہارے حوالے کی ہے اور جو دولت تمہارے حوالے کی ہے اس دولت کو سنبھالو، اس دولت کو ضائع نہ کرو۔اور دوستو! دولت کا سنبھالنا کیا ہے؟ بس میں مختصر لفظوں میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دولت تمھیں دے کر گئے، اور جو امانت تمھیں دے کر گئے وہ دو رخوں سے ہے جس طور پر انسان کا ذاتی طور سے بننا دل اور جسم کے ساتھ ہے اسی طور پر اس امت کا بننا دو چیزوں کے ساتھ ہے، شخصی محنت اپنے جسم اور دل کو بنانے کی اور امت کی محنت دعوت کے رخ کی۔یعنی ہم محنت کرنے والے بنیں جس سے ہمارے اندر ایمان وتقویٰ آتا ہے، ہم خدا والے بنیں، صرف ہم اپنے آپ کو بنانے والے نہ ہوں بلکہ ہماری محنت اس پر بھی ہو رہی ہو کہ اللہ کا کوئی بندہ، اس دنیا میں رہنے والا ایسا نہ ہو جو خدا پر ایمان والا نہ ہو، جو تقویٰ والا نہ ہو۔میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک وصیت کی ہے اور جس نے بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط پڑھا ہے اسے وصیت کی ہے۔ دیکھو! شریف انسان جو ہوتا ہے اپنے والد کی وصیت کو کبھی بھلایا نہیں کرتا۔باپ کی

وصیت ہوآخری وقت کی تو کوئی مسلمان بیٹا بھلا سکتا ہے؟نہیں بلکہ آخر وقت تک اس پرعمل کرتا ہے ۔تو دیکھو جب باپ کی وصیت کونہیں بھلاتے تو نبی کی وصیت کوکوئی شریف امتی بھلاسکتا ہے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وصیت ہےاور وہ وصیت آخر میں ہم بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ۔فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اور پوری امت کو خطاب کرتے ہوئے یوں فرمایا کہ دیکھو! جو دین خدا نے مجھے دیا تھا اور جو امانت مجھے دی تھی ﴿ هَلْ بَلَّغتُ ﴾ کیا اس دین کو میں نے تم تک پہنچا دیا؟ کیا اس امانت کو میں نے تم تک پہنچا دیا؟ سب نے گواہی دی بَلَّغتَ وَاَحسَنتَ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے پہنچا دیا اور بہتر طور سے پہنچا دیا ۔ اسکے بعد نبی پاک سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

انا خاتم النبیین و انتم آخر الامم فلیبلغو الشاھد منکم الغائب

ترجمہ: میں اللہ کا آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو پس تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو اس دین کی ہر ہر بات کو پہنچا دے۔

جتنا دین تم تک پہنچا ہے یہ میری وصیت ہے، میں یہ بات تمہارے ذمے ڈالتا ہوں کہ جو کچھ تم کو مجھ سے پہنچے تم میں سے اس وقت تک کوئی کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (بخاری)

ترجمہ: کوئی تم میں سے اس وقت تک مؤمن ہو نہیں سکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی اسی خیر کو نہ چاہے جو کہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

اور بعض روایات میں آتا ہے حَتّٰی یُحِبُّ لِلنَّاسِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ یہاں تک کہ ہر انسان کے لیے اس بھلائی اور خیر کو چاہے جو کہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

دوستو! سب سے بڑی خیر اور سب سے بڑی نعمت جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں دی وہ دین کی نعمت ہے، وہ ایمان کی نعمت ہے، وہ تقویٰ کی نعمت ہے، یہ وہ دولت ہے جو ہمیں آخرت تک پہنچاتی ہے، جو خدا کی رضا ہمیں دلاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں سخاوتِ نبوی بتائی، مال و دولت کی سخاوت ایک سخاوت ہے لیکن جو سب سے بڑی سخاوت ہے وہ ایمان کی سخاوت ہے، وہ تقویٰ کی سخاوت ہے، وہ بھلائیوں کو پھیلانے کی سخاوت ہے۔ نبیوں کی طرح ان کی نیابت میں ہم ملک ملک، قوم قوم، علاقہ علاقہ پھرتے ہوئے اللہ کی باتوں کو پہنچانے والے، دین کی باتوں کے پھیلانے والے اور خیر کے تذکروں کے کرنے والے اور لوگوں کو دین پر ڈالنے والے بن جائیں۔ دوستو! اگر امت میں اس وقت صرف یہ دو چیزیں پیدا ہو جائیں تو یہ امت اپنے مقام پر آ جائے۔ ایک بات یہ کہ ہر شخص اپنے آپ کو بنانے کی محنت کرے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے بنانے کی محنت کے ساتھ ساتھ اس کی فکر، اس کی محنت، اس کی دعائیں، اس کا درد، اس کی طرف مبذول رہے اور وہ پوری محنت کرے کہ دنیا میں جتنی بھی مخلوق ہے میں اسے اپنے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر ڈالنے والا بنوں گا، خدا کی راہ پر لانے والا بنوں گا۔ اس میں چاہے میری جان لگ جائے، چاہے میرا مال لگ جائے، قوتیں صرف ہو جائیں میں اگر زندہ ہوں تو اس لیے زندہ ہوں کہ نبی کا طریقہ دنیا میں جاری رہے، میں مروں گا تو دین کے لیے مروں گا، جیوں گا تو دین کے لیے جیوں گا۔

دوستو! خصوصاً یہ پچھلے دنوں میں آپ نے منایا ہوگا عاشورہ کا دن۔ عاشورہ جانتے ہیں ناں؟ دسویں محرم۔ عاشورہ کا سبق کیا ہے؟...... حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی کیا ہے؟ قربانی کا حاصل کیا ہے؟ ...... قربانی کا یہ تو حاصل نہیں کہ ہم چہروں کو پیٹ لیں یا گریبان کو چاک کرلیں۔ ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ عیہ وسلم نے یہ صاف لفظوں میں فرمادیا

لَیْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَ شَقَّ الْجُیُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَی الْجَاھِلِیَّۃِ (بخاری)

ترجمہ: جس نے اپنے گالوں کو پیٹا جس نے اپنے کپڑوں کو غم کے طور پر پھاڑا وہ ہم سے نہیں ہے۔

آپؐ نے تو برأت کا اظہار کردیا اس طبقے سے جو کہ روتا اور پیٹتا ہے، وہ تو آپؐ والا طبقہ ہے ہی نہیں۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کا سبق کیا؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے آپ کو کیا بتایا؟ ...... دیکھو! واقعات تو آپ سن ہی چکے ہوں گے، میں بات کافی کرچکا ہوں لمبی کرنا نہیں چاہتا، مختصر لفظوں میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا حضرت حسینؓ کی قربانی کا حاصل یہ ہے کہ حق کے پھیلانے کے لیے نکلو، اکیلے ہو یا چند افراد کے ساتھ ہو، اگر پورا کا پورا زمانہ تمہارا مخالف ہوجاتا ہے اور تم اکیلے بات کو حق سمجھتے ہو تو حق کے لیے جان لٹادو، حق کی بات خدا کے بندوں تک پہنچادو، کوئی مانے یا نہ مانے، منوانا تمہارا کام نہیں ہے، بات کا پہنچانا تمہارا کام ہے، اگر کوئی نہیں مانتا اور تمہاری گردن بھی اس راہ میں کٹ جاتی ہے تو اسے شہادت سمجھو، اسے موت نہ سمجھو۔ مقصود کیا ہے شہادتِ حسینی سے؟ ...... صرف اتنا حاصل ہے کہ جب

دنیا میں سے حق کا کوئی ذرہ مٹ رہا ہو، حق کی کوئی بات، حق کی کوئی اینٹ گر رہی ہو اس اینٹ کو اپنی جگہ پر سنوارنے کے لیے سینہ سپر ہو جاؤ، باہر نکل آؤ۔ دین کی بات کو پہنچاؤ اور جہاں تک پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ۔ اگر تمام زمانہ تمہارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں رہتا، جو تمہارے بنے ہوئے تھے وہ بھی تمہارے مخالف ہو جاتے ہیں تو اس وقت بھی تم خدا کے پیغام کو پہنچاؤ، بس۔...... یہ وہی بات ہے جیسا کہ سیدنا حضرت ابو بکرؓ نے کہا تھا

اِنَّهٗ قَدِانْقَطَعَ الْوَحْیُ وَتَمَّ الدِّیْنُ اَیَنْقُصُ وَاَنَا حَیٌّ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے ایسی صورت میں دین کمزور و ناقص ہو جائے ایسا میں اپنی زندگی میں ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

"کیا دین مٹے گا اور میں زندہ رہوں گا! "

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ہے ابتدا ہے اسماعیل

جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قربانی دے دی، جیسے حسین رضی اللہ عنہ نے قربانی دے دی۔ قربانی کس لیے تھی؟ ......قربانی حکومت کے لیے نہیں تھی، غلط کہتے ہیں، تہمت باندھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ حکومت کے لیے لڑے۔ ان کی شہادت کے مقام کو نہیں سمجھتے، ان کی قربانی کے درجے کو نہیں جانتے، جو یوں گمان کرتے ہیں کہ انھوں نے سلطنت اور حکومت کے لیے جان دی۔ یہ تو ادنیٰ آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ بھئی نکل رہے ہیں کوئی بہتر تہتر نفس ہیں اور ان کے ساتھ زیادہ عورتیں ہیں، ساتھ اسلحہ بھی نہیں ہے، بائیس ہزار کا لشکر سامنے ہے۔ اگر سلطنت مقصود ہوتی تو صاف

جان رہے تھے کہ کیا بنتا ہے۔ جان دی ہے، کس لیے دی ہے؟...... کہ ایک نقش قائم ہو جائے کہ مؤمن خدا کی بات کو دنیا میں ثبت کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا تو اسے ثبت کر کے رکھ دیتا ہے اور اگر ثبت نہ ہو سکے تو اپنی جان دے دیتا ہے۔ تو ہمیں بھی بس اپنے سامنے ایک نظریہ رکھنا ہے کہ خداوندِ قدوس کے دین کے لیے جہاں بھی ہیں جس مقام پر بھی ہیں، جس جگہ پر بھی ہیں اپنے اندر دین کو زندہ کریں گے اور دین کو پھیلانے کے لیے محنت کریں گے کوشش کریں گے۔ جماعتیں بن بن کر علاقوں میں پھریں گے، ملکوں میں پھریں گے لوگوں تک دین کی بات پہنچائیں گے۔ اور جب تک ہم دین کی محنت نہیں کریں گے دین سمٹتا چلا جائے گا، دین پھیلے گا نہیں۔ آج دنیا کے نقشے پر آپ ایک نگاہ ڈالئے، تو مسلمان ہر جگہ سمٹتا چلا آرہا ہے۔ انھیں ان علاقوں سے نکالا جا رہا ہے جہاں وہ صدیوں سے رہ رہا تھا۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ جو پھیلنے والی محنت تھی، ہم نے دین کا پھیلانا چھوڑ دیا تو خدا نے ہمیں سمیٹنا شروع کر دیا۔ اگر ہم دین کے پھیلانے والے بنیں خدا ہمیں ہر ایک جگہ پر پھیلا کر رکھ دے گا۔ دنیا بھی ہمیں دے گا آخرت بھی دے گا۔ اس کے لیے دوستو بس موٹی سی بات یہ ہے اور میری تمام بات کا حاصل دو چار لفظوں میں اتنا ہے، خدا کی رضامندی کو اپنا مقصد بنائیے، آخرت کو اپنا مقصد بنائیے، اس دنیا کو مطلوب نہ بنائیے، اس دنیا کو مقصود نہ بنائیے، موت کی فکر کیجئے، آخرت کی فکر کیجئے۔ مرنا ہے اور یقیناً مرنا ہے۔ آپ چاہیں تب بھی مرنا ہے اور آپ نہ چاہیں تب بھی مرنا ہے۔ اور خدا کی قسم آپ کو علم نہیں اور نہ مجھے علم ہے کہ ایک پل کے بعد بھی ہم زندہ رہتے ہیں یا نہیں رہتے۔ یہ آتی جاتی زندگی ہے، اس آتی جاتی زندگی پر بھروسہ نہ کریں، ہم اس دنیا میں خدا کے لینے کے

لیے بھجوائے گئے ہیں، خدا کو حاصل کریں تو کامیاب ہو جائیں گے۔ اور خدا کو حاصل نہ کیا اور تمام دنیا کو لے لیا تو خدا کی قسم ناکام ہیں۔ خدا کے لینے کا طریقہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں پر اپنے عقیدے کی درستگی، دل کا بنا لینا اور اپنے جسم کا بنا لینا، اپنے اعمال کو درست کر لینا، اور اس کامیابی کے لیے اور اس دین کے لیے اس محنت پر آجانا جو محنت کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دی ہے۔ اور وہ محنت کیا ہے؟...... ملک ملک علاقہ علاقہ خدا کے دین کو لے کر پھرنا اور لوگوں تک دین کی بات پہنچانا۔ کوئی مانتا ہے تب بھی پہنچاؤ کوئی نہیں مانتا تب بھی پہنچاؤ۔ کوئی گالی دیتا ہے تب بھی سناؤ، کوئی پھول برساتا ہے تب بھی سناؤ۔ مخلوق سے تمہارا واسطہ نہیں، مخلوق کے لیے تم نے نہیں کہنا۔ اگر مخلوق کے لیے کہو گے اور مخلوق کی رضا کے لیے دین کی بات بتاؤ گے تو خدا کے نزدیک تمہارے کہنے کا رتی بھر بھی ثواب نہیں ہوگا۔ جو کہو خدا کے لیے کہو، جو سناؤ خدا کے لیے سناؤ۔ کوئی اچھا کہے تب سناؤ، کوئی برا کہے تب سناؤ۔ دین کے لیے نکلو اور خداوندِ قدوس کی بات کو لے کر علاقہ علاقہ، ملک ملک، طبقہ طبقہ پہنچاتے رہو یہاں تک کہ آخری سانس آجائے اور دین کی محنت تمہارے اندر اس طور پر رچ چکی ہو کہ جب قیامت کے دن اٹھو تو تمہارے چہرے اس چیز کی شہادت دے رہے ہوں کہ ان کے اوپر یہ جو نور ہے دین کی محنت کا نور ہے، ان کے اوپر جو مشقت کے اثرات ہیں وہ دین کی مشقت کے اثرات ہیں۔ یہ دنیا میں جو راتوں کو جاگے ہیں تو یہ دین کے لیے جاگے ہیں، انھوں نے جو سفر کیے ہیں وہ دین کے لیے کیے ہیں۔ یہ دنیا کے طالب نہیں تھے، یہ خدا کے طالب تھے۔ یہ خدا کے لیے جیتے تھے یہ خدا کے لیے مرتے تھے۔ خدا کو اپنی زندگی کا مقصد

بناؤ، خدا کو اپنی زندگی کا محور بناؤ، خدا کو لے لو خدا تمھیں اپنا بنالے گا، خدا تمھیں اونچا کرے گا۔ یہ دنیا بھی تمہارے قدموں میں آئے گی، جنت بھی تم پر قربان ہوگی، جنت تم پر نچھاور کی جائے گی، اس کی نعمتیں تم پر قربان کی جائیں گی۔ تم جنت کے طالب بنو یا نہ بنو اگر تم نے خدا کو لے لیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ انعام کے طور پر تم کو جنت دے کر رہیں گے۔ لیکن تم خدا کے بن تو جاؤ۔ خدا کے بننے کا طریقہ اس امت میں صرف اتنا ہے کہ اپنے آپ کو درست کرو اور اس امتِ محمد یہ مرحومہ کو درست کرنے کی کوشش کرو۔ دین کی محنت کو اپناؤ، یہ نہیں کہ صرف اپنی نماز پڑھ لی تو کامیابی کما حقہ نصیب ہوگئی۔ اپنی نماز کو بنانے کے لیے اوروں کی نمازوں پر محنت کرو۔ اپنے اندر دین کو لانے کے لیے اوروں میں دین کو پیدا کرنے کی کوشش کرو، اپنے کلمے کو درست کرنے کے لیے اوروں تک کلمے کو پہنچاؤ۔ کلمے کی حقیقت کو اپنے اندر انڈیلنے کے لیے دوسروں کے اندر اس کلمے کی حقیقت کو انڈیلنے کی کوشش کرو۔ جتنا اوروں کے اندر ایمان کی محنت کو کرو گے، یقین کی محنت کو کرو گے، دعوت کی محنت کو کرو گے خداوند قدوس اپنے خزائن سے ایمان وتقویٰ کے نور کو تمہارے اندر اتارے گا۔ تمہارے اندر یقین آئے گا، جب خدا کے لیے محنت کرو گے، جب خدا کے دین کو تم دوسروں میں پیدا کرنا چاہو گے، خدا اپنے خزائن سے تمہارے اندر اپنا دین پیدا کرے گا۔ جب تقویٰ کی محنت تم دوسروں پر کرو گے تو خداوند قدوس اس تقویٰ کو تمہارے اندر پیدا کر کے دکھا دے گا۔ اس کے لیے دوستو آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہمارے اس ملک میں، اور تقریباً تمام دنیا میں اللہ کے کچھ بندے بہت سارے طریقوں سے دین کی محنت کو کر رہے ہیں ایک محنت کا طریقہ یہ بھی ہے کہ بہت

سارے اللہ کے بندے اپنی زندگیوں میں سے اوقات کو نکالتے ہیں، چار چار مہینوں کے لیے چھ چھ مہینوں کے لیے اپنے ملک میں بھی پھرتے ہیں دوسرے علاقوں میں بھی جاتے ہیں۔ مساجد میں قیام کرتے ہیں، اللہ کی باتوں کو سنتے ہیں سناتے ہیں کچھ اللہ کی یاد کرتے ہیں۔ کچھ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کی کتابوں کو پڑھتے ہیں احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں اور کچھ محنت کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے اندر ایمان و تقویٰ پیدا ہو جائے، لوگ دین والے بن جائیں، لوگ دعوت والے بن جائیں، لوگوں میں دین زندہ ہو جائے کہ تمام امت جو ہے یہ امت داعی امت ہے، یہ دین کو پھیلانے والی امت ہے، یہ لوگوں میں یقین کو پیدا کرنے والی امت ہے۔ امت کا یہ جذبہ مردہ ہو چکا، اس امت کا یہ جذبہ زندہ ہو جائے اس کے لیے یہ لوگ چار چار مہینے کے لیے بھی پھرتے ہیں، چالیس چالیس دن کے لیے بھی نکلتے ہیں، علاقے میں تین تین دن کے لیے نکلتے ہیں، مقام پر گشت و تعلیم کرتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ یہاں ہوتا ہے یا نہیں ہوتا بہر حال کبھی ایک مسجد میں کبھی دوسری مسجد میں جاتے ہیں۔ تو آخر میں یہ آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ کچھ ہمتیں کر کے آپ لوگ بھی اپنا کچھ ایسا نظم بنائیں کہ اپنی زندگیوں میں سے کچھ اوقات کو فارغ کریں دین کے سیکھنے سکھانے کے لیے، ایمان کے لینے کے لیے اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے، تقویٰ کی محنت کو سمجھنے کے لیے اور اوروں تک اس کے پہنچانے کے لیے۔ یہ جو تبلیغ کے نام سے ایک کام ہو رہا ہے، رائے ونڈ میں ان لوگوں کا اکٹھ ہوتا ہے تو وہاں بھی آپ جا سکتے ہیں، یہاں پشاور شہر میں مثلاً جمعرات ہے تحصیل کے قریب ایک مسجد ہے خواجہ معروف کی وہاں بھی یہ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں ہر جمعرات کو۔ پتہ نہیں یہاں کیا مرکز

کی نوعیت ہے یہاں کام ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ تو یہاں بھی آپ لوگ کچھ ہمتیں کر کے اس کام کو بڑھانے کی کوشش کریں انشاء اللہ، اللہ کرے گا جس وقت آپ کچھ دین کی محنت کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے اندر بھی ایمان وتقویٰ پیدا کرے گا اور خداوند قدوس کے ملنے کی صورتیں ہوں گی، اور جب خدا تعالیٰ مل جائیں گے تو دنیا بھی بن جائے گی، آخرت بھی بن جائے گی۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم ایمان وتقویٰ کی محنت کو اختیار کریں، خود دین پر چلنے والے بنیں اوروں کو چلانے والے بنیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اور آخر میں اتنی بات عرض کرتا ہوں کہ میری بات اگر کچھ سمجھ میں آگئی ہو سمجھا تو میں غالباً نہیں سکا لیکن بہر حال اتنا عرض کروں گا کہ میری بات کا حاصل اتنا تھا کہ ہم سب خدا کی طرف رخ کریں اور اس محنت کو اختیار کریں کہ ہمارے اندر ایمان وتقویٰ آجائے۔ اس محنت کے لیے اگر آپ حضرات تیار ہیں تو جو آمادہ ہوں وہ کچھ اس چیز کا اظہار کرلیں، انشاء اللہ ہم اس محنت کو اپنائیں گے اور اس رُخ پر آنے کے لیے اپنی زندگیوں میں سے کچھ اوقات دے دیں گے، تو جو کوئی اوقات دینے کا ارادہ کریں اگر کچھ اپنے اوقات کا اظہار کردیں تو زیادہ ہی بہتر ہوگا۔

اس کے بعد طویل دعا فرمائی۔



اسباب اور توکل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَمَّا بَعْدُ!

دوستو اور بزرگو! اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انسان کو دو قسم کے اسباب دیے گئے ہیں۔ ایک تو ظاہری مادی اسباب ہیں اور دوسرے روحانی اسباب ہیں۔ اسبابِ روحانیہ میں دعاء بھی آجاتی ہے، صلوٰۃِ حاجت بھی آجاتی ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو سورۂ واقعہ پڑھے گا اسے فاقہ نہیں آئے گا، اسی طور پر مختلف چیزیں ہیں جو کہ اسباب روحانیہ میں شامل ہیں۔ بلکہ تمام اعمالِ صالحہ اللہ تعالیٰ سے لینے کے مستقل ذرائع اور اسباب ہیں۔ دیکھو! قرآن کریم میں مختلف آیتیں ہیں، میں نے جمع کی تھیں، کوئی سو کے قریب آیتیں ہیں جو کہ اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ جتنے بھی اعمالِ صالحہ ہیں مستقل اسباب ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے کہ

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:۹۶)

ترجمہ: اگر یہ بستیوں والے ایمان وتقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں آسمان کی برکات میں سے بھی حصہ دیتا اور زمین کی برکات میں سے بھی حصہ دیتا۔

اسی طور پر مختلف آیتوں میں آتا رہتا ہے۔ تو بہر حال جتنے بھی نیک اعمال ہیں یہ سب خدا کی ذات سے لینے کے مستقل اسباب ہیں۔

جہاں تک کہ دوسرے اسباب کا تعلق ہے جن کے متعلق آپ کا سوال ہے کہ مادی اسباب کس وقت اختیار کیے جائیں، کس وقت چھوڑے جائیں، کس حالت میں کن اسباب کا لینا ضروری ہے کن کا لینا ضروری نہیں۔ تو اس میں دیکھو! آپ نے بات شروع کی تھی توکل کے بارے میں، توکل حقیقت میں ایک اُس کیفیتِ قلبی کا نام ہے، دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کیفیت کی بناء پر انسان کا اعتماد اشیاء سے ہٹ کر خدا کی ذات پر آجاتا ہے اور انسان سچ مچ دل کے اندرون سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ سب کچھ خدا سے ہوتا ہے۔ تو جب سب کچھ خدا سے ہوتا ہے تو جن چیزوں سے نہیں ہوتا ان پر سے اس کا بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور خدا کی ذات پر سچا توکل اس کے اندر پیدا ہو جاتا ہے، یہی اصل توکل ہے۔

دیکھو! ایک توکل تو یہ ہے کہ انسان یوں سمجھے کہ خدا سے ہوتا ہے اور پھر بھی غیر خدا پر یقین اور بھروسہ رکھے، اور ایک یہ ہے کہ خدا کی ذات پر بھروسہ اس طور پر پیدا ہو جائے کہ دل کے اندرون سے یہ جاننے لگ پڑے کہ ہاں ایک خدا کرتا ہے اور اسی سے ہوگا، اس بناء پر باقی چیزوں سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور خدا کی ذات پر آجاتا ہے، یہ کیفیتِ قلبی اور حالِ قلبی ہے اور یہ ایمان کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ ہے اور یہ تب حاصل ہوتا ہے جب صفات ربّانی پر یقین کمال کو پہنچتا ہے، جتنا صفات ربّانی پر یقین کامل ہوگا اسی قدر توکل کامل ہوگا۔ صرف الفاظِ توکل سے توکل پیدا نہیں ہوتا۔ توکل کیفیت اور حال کا نام ہے، یہ قال کا نام نہیں اور نہ قال سے توکل

سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جس طور پر کہ تمام کیفیاتِ قلبیہ قال (بولنے) سے بیان نہیں ہو سکتی ہیں بلکہ جس پر وہ گزریں وہ ہی انھیں جان سکتا ہے اسی طور پر توکل کی حقیقت کو جب تک کہ انسان کے اندر خدا کا کمالِ اعتماد پیدا نہ ہو جائے وہ اس کو نہیں جان سکتا۔ اسی بناء پر بقول ہمارے حضرت تھانویؒ کے بہت سارے اہل توکل اہل تاٗ کل بن جاتے ہیں یعنی کھانے والے بن جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے اور نام ہے توکل کا، اہل توکل کہلاتے ہیں اور بن جاتے ہیں اہل تاٗ کل۔ توکل یہ بھی نہیں ہے کہ آپ معطل ہو کر رہ جائیں بلکہ توکل یہ ہے کہ جہاں اسباب کو اختیار کرنے کا حکم ہے وہاں اسباب کو اختیار کرو گے اور جہاں ترک کرنے کا حکم ہے وہاں ترک کرو گے۔ جیسے مولانا نے ایک مقام پر فرمایا اور حدیث کو نقل کیا، ترمذی شریف کی روایت ہے

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَعْقِلُھَا وَاَتَوَکَّلُ اَوْ اُطْلِقُھَا وَ اَتَوَکَّلُ قَالَ اعْقِلْھَا وَتَوَکَّلْ (الترمذی)

ترجمہ: ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا کھلی چھوڑ کر توکل کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو باندھ دو اور توکل کرو۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں

گفت پیغمبر بآوازِ بلند

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز کے ساتھ فرمایا کہ توکل کرتے ہوئے اونٹ کے گھٹنے کو باندھ دو۔

ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ! اللہ کے توکل پر اس اونٹ کو کھلا چھوڑ دوں یا اس کے گھٹنے کو باندھ کر اللہ پر توکل کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھٹنا باندھو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔

دیکھو اب توکل کی مختلف نوعیتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ توکل اپنی ذات میں کیا ہے؟ پھر افراد کے لحاظ سے توکل کے مختلف مدارج ہوں گے۔ مختلف افراد کی مختلف کیفیات اور حالات کے لحاظ سے اور ان کے توکل کے مدارج کے لحاظ سے مختلف کیفیتیں اور احکام ہوں گے۔ جتنا توکل ہوگا اس توکل کے مطابق سبب کے ترک کرنے کا یا اختیار کرنے کا حکم بھی دیا جائے گا۔ قوی الھمت اشخاص کو ایک چیز کے ترک کرنے کی اجازت دی جائے گی اور مجھ جیسے ضعیف الھمت کو اس کے ترک کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اسی طور پر قوی الھمت اشخاص کے لیے بھی بعض اسباب ایسے ہیں جن کا ترک کرنا جائز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میں پانی نہیں پیتا اللہ میری پیاس ایسے ہی بجھاتا رہے، تو یہ حقیقت میں خدا کی نعمت کی ناقدری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانی کو سبب بنایا ہے تمہاری پیاس کے بجھانے کا اس کا حکم ہے کہ پانی پیو تو تمہاری پیاس بجھ جائے گی۔

اب ایک نوعیت یہ ہے کہ حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ جہاں کہ پانی قطعاً ہے ہی نہیں، پانی کا بالکل وجود ہی نہیں ہے۔ اس پانی کے نہ ہوتے ہوئے آپ کہتے ہیں اے ربّ پانی تو موجود نہیں تو مجھے سیرابی بخش دے۔ اب ربّ چاہے تو تمھیں بغیر پلائے سیرابی بخش دے، چاہے تو تمہارے لیے آسمان سے بارش برسا دے، چاہے زمین سے چشمے کو نکال دے چاہے جس رُخ سے تمہاری ضرورت کو پورا کر

دے۔ جب تمہارے دل کی نگاہ ،توجۂ قلبی اپنی حاجت کے پورا ہونے کے لیے خدا کی ذات پر ٹِک جاتی ہے تو اسے توکل کہتے ہیں۔ جیسے دیکھو ایک ہوتا ہے سوال کرنا اور ایک ہوتا ہے اشراف۔ سوال یہ ہے کہ دوسرے سے منہ سے مانگ لینا، اور اشراف یہ ہے کہ دل کا غیر کی طرف جھانکنا کہ کہیں سے مجھے آجائے۔ اسی طور پر جب دل خدا ہی کی طرف جھانکتا ہے اور غیر خدا سے اس کا جھانکنا قطعاً ختم ہو جاتا ہے اور یہ یوں سمجھتا ہے کہ وہیں سے آئے گا چاہے جس صورت سے دے، چاہے سبب ظاہری سے دے، چاہے سبب باطنی سے دے، میرا توکل تو اس پر ہی ہے، وہی مجھے پال کر دکھائے گا، وہی مجھے دے گا، تو اسے توکل کہتے ہیں۔ اسباب میں نہ دیکھنا اور دل کے اندر سے خدا میں دیکھنا، حقیقت قلبیہ خدا کے ساتھ اس طور پہ متعلق ہو جائے کہ غیر خدا پر اس کی نگاہ نہ آئے، اس وقت توکل پیدا ہوتا ہے، ورنہ وہ توکل نہیں ہوتا الفاظِ توکل ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسۡئَلُکَ التَّوۡفِیۡقَ لِمَحَآ بِّکَ مِنَ الۡاَعۡمَالِ وَ صِدۡقَ التَّوَکُّلِ عَلَیۡکَ وَحُسۡنَ الظَّنِّ بِکَ (کنزالعمال)

ترجمہ: یا اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے توفیق تیرے پسندیدہ اعمال کی اور سچے توکل کی اور تجھ پر نیک گمان کی۔

جب صدقِ توکل آئے گا تو یہ نتیجہ ہو گا کہ تم خدا پر نگاہ رکھنے والے ہو جاؤ گے۔ اب اس کے بعد دیکھو ایک ہے اعتقادی توکل، یہ فرض کے درجے میں ہے ...... کہ اللہ سب کچھ کرتا ہے ...... ہر مسلمان پر لازم ہے کہ یہ عقیدہ رکھے کہ خدا دیتا

ہے اور خدا نہ دے تو کوئی نہیں دے سکتا، اسباب میں جو کچھ بھی ہے یہ اللہ کی طرف سے ہے، فاعلیت حقیقی خدا کی ہے۔ یہ تو ہے اعتقادی توکل اور یہ ہر مسلمان پر عقیدے کے درجے میں فرض اور واجب ہے۔ اب پھر آ جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے کہ کونسے اسباب ہیں جن کو ترک کیا جا سکتا ہے اور کونسے اسباب کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اسباب کی دو نوعیتیں ہیں، کچھ اسباب دینیہ ہیں اور کچھ اسباب دنیویہ ہیں۔ دینی اسباب میں مثال کے طور پر جہاد ہے۔ اب جہاد میں تم نے کافروں سے جنگ کرنی ہے، اب جنگ کے لیے تم جاتے ہو تو اس میں تم پر یہ فرض ہے کہ جس قدر اسباب اپنی قوت اور استطاعت کے بقدر تم اکٹھا کر سکتے ہو کر لو

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال:٦٠)

ترجمہ: اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے سامان درست رکھو۔

اور اس استطاعت کے باہر پھر تم یوں نہیں کہو گے کہ بھئی اور تو کچھ ہے نہیں ہم دشمن سے کیسے لڑیں۔ اپنی استطاعت کے بقدر تو اختیار کرو اور بھروسہ خدا کی ذات پہ رکھو کہ نہ تو میں نے جو اکٹھا کیا ہے اس سے کچھ ہوگا اور نہ جو میرے پاس نہیں ہے اس سے ہوگا، کرنے والی اللہ کی ذات ہے، حکمِ الٰہی کے نتیجے کے طور پر میں یہ چیزیں اکٹھی کرتا جاتا ہوں۔ یا مثال کے طور پر آپ نے وضو کرنا ہے، ضرورتِ دینیہ ہے، اور آپ کہتے ہیں چلو بھئی ؎

ممکن ہے کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمّم آگ سے اور خاک سے وضو کرتے

تم کہو کہ بھئی پانی کی کیا ضرورت ہے، میں ایسے ہی وضو کر لیتا ہوں، پانی

کے بغیر ہی وضو کر لیتا ہوں تو یہ توکل نہیں بلکہ حکم عدولی ہے۔یعنی ضروریات دینیہ کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوگی انھیں اختیار کرنا ہوگا۔شریعت کی کتاب آپ پڑھنا چاہتے ہیں اس کے لیے آپ کتاب پیدا کریں گے۔آپ نے علم حاصل کرنا ہے تو استاد کے سامنے جا کر زانوئے تلمذ تہہ کرنا ہوگا۔آپ چاہتے ہیں کہ مسائل کو معلوم کریں تو آپ کسی مفتی کے پاس جا کر بیٹھیں گے، آپ آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ جائیں گے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح کہ مجھ وحی پر نازل ہونا شروع ہوگئی، یہ بات نہیں ہوگی بلکہ جیسے کہ وحی آئی ہے اور احکام آئے ہیں نبیؑ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اور سلسلہ بسلسلہ علماء کے ذریعے سے پہنچے ہیں تو آپ اگر چاہیں کہ مجھے علم معلوم ہو، جو کہ ضرورتِ دینیہ میں سے ہے،تو اس کا سبب اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ مثال کے طور پر میں نے کہا۔

اب اسی طور پر آپ چاہتے ہیں کہ میرا پیٹ بھرے اب ہر وقت آپ کہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کھلا دے،تو یہ جرأت ہے۔خداوند قدوس قادر ہیں کہ آپ کا ایسے ہی پیٹ بھر کر دکھا دیں لیکن عام طور پر آپ کو کھانا استعمال کرنا پڑے گا۔کھانا ہے اور آپ نہیں کھاتے اور آپ کہتے ہیں کہ اللہ مجھے پال کر دکھائے،اگر اس وقت میں آپ کے نہ کھانے کی وجہ سے آپ کی موت واقع ہوگئی تو یہ خودکشی ہوگی۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کھانے کا ترک کرنا حرام ہے،ممکن ہے کہ موت واقع ہو جائے۔اسی طور پر بعضے دوسرے اسباب ہیں جن کا ترک کرنا ناجائز ہو جاتا ہے۔

بعضے اسباب ایسے ہیں کہ ان کو اگر آپ اختیار کریں تو آپ کو فائدہ مل سکتا ہے اور ان کو چھوڑ دیں تو نقصان نہیں ہوتا۔ایسے اسباب کو اختیار کر لیں تو کوئی حرج

نہیں ہے اور نہ کریں تو کوئی نقصان نہیں ہے۔ دیکھو اب مثال کے طور پر جائز سفارش ہے، یہ اسباب ظنیہ میں سے ہے، ظنی سبب ہے۔ اگر کرلیں تو شرعاً کوئی حرج نہیں ہے اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اسے آپ ترک کر سکتے ہیں۔ لیکن مثال کے طور پر آپ کا اولاد کو خوب جی چاہتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے جیسے اللہ نے حوا علیہ السلام کو پیدا کر دیا تھا ویسے ہی میرا بھی بچہ پیدا کر دے بیوی کے پاس میں نہیں جاتا، تو یہ نہیں ہوگا، شادی کرنی پڑے گی۔ یا شادی تو کرلی اب میں اس کے قریب نہیں جاتا، اللہ میاں عیسیٰ کی طرح اس سے پیدا کر دیں، تو اللہ میاں ایسا نہیں کریں گے یہ حرام ہے۔ اس کے سبب کو اختیار کرنا پڑے گا۔

بعض لوگ قوی الہمت ہوتے ہیں، وہ مستحب توکل میں ایسے اسباب جو کہ ظنی اسباب ہیں ان کو وہ ترک کر دیا کرتے ہیں لیکن ہم جیسے لوگ جو ہیں اگر ان ظنی اسباب کو ترک کر دیں تو ممکن ہے کہ ہماری ہمت کی کمزوری کی بناء پر خدا کے متعلق ہمارے اندر شکایت پیدا ہو جائے اور ایسا توکل ہمارے لیے زیادتِ ایمان کا سبب نہ بنے بلکہ ہمارے ایمان کی کمزوری کا سبب بن جائے۔ اس بناء پر ضعیف الہمت لوگوں کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ اس چیز کو ترک کر دیں۔ دیکھو میں تمھیں ایک بات سمجھاؤں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو لکھا کہ حضرت میں ملازمت ترک کر دوں؟ ابتدائی طور پر جب ان سے اصلاحی تعلق تھا، تو حضرتؒ نے منع فرما دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزرا تو ان کا توکل اتنا قوی ہو گیا کہ پوچھا بھی نہیں اور ملازمت چھوڑ دی۔ ہمارے حضرت تھانویؒ ۱۳۰۱ھ سے لیکر ۱۳۱۵ھ تک کانپور میں مدرسہ کے صدر اور شیخ الحدیث رہے، کام کرتے رہے اور وہاں سے کچھ

لیتے بھی رہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے توکل کامل کر دیا تو ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۶۳ھ تک اڑتالیس سال تک اللہ پر توکل کر کے بیٹھے رہے، اللہ دیتا رہا اور پہنچاتا رہا۔ پھر فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے اور فتوحات غیبیہ آتی ہیں، کہاں سے آتا ہے، کیسے اللہ میاں دیتے ہیں وہ تو پھر دوسری لائن ہے۔ وہ دوسری لائن اس بناء پر کہ جب تم توکل کی لائن پر آ جاؤ گے، اعتمادِ کلی ہو جائے گا تو پھر یہ نوعیت ہو جائے گی

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۝ وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ط وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ط قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۝ (طلاق:۲)

ترجمہ: اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی (اصلاح مہمات) کے لیے کافی ہے۔

جب تقویٰ کامل ہو جائے، جب توکل کامل ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے خزائن سے پال کر دکھا دے گا اور وہاں سے دے گا کہ تمھیں وہم و گمان بھی نہیں ہوگا وہ پھر اگلا مقام ہے لیکن یہ تب ہوتا ہے جبکہ تمہارا یقین اور اعتماد خدا کی ذات پر بالکل ایسے ہو جائے کہ جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں، جتنا اس پر تمھیں یقین ہے اس سے بڑھ کر خدا کی ذات پر یقین ہو جائے۔ جتنا تمھیں یقین ہے کہ رزق مجھے ہاسٹل میں ملے گا اس سے بڑھ کر تمھیں یقین ہو جائے کہ جہاں بھی میں پہنچوں گا میرا رزق میرے آگے ہوگا۔ جب یہ نوعیت ہو گی پھر تو اللہ میاں ہر جگہ دے دے گا۔

مولانا رومؒ نے ایک قصہ لکھا ہے فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے قوی الہمت

اور طاقت والے یعنی ایمان کی طاقت والے تھے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ چل پڑے، اور کیا کہا؟...... کہ چلو حج پر چلتے ہیں اور شرط یہ لگادی کہ جو اللہ میاں بھیجے گا وہ کل کے لیے اٹھا کر نہیں رکھو گے، وہیں کھاؤ گے وہیں پیو گے...... اب وہ چلتے رہے اور کھاتے پیتے رہے بس عیش تھا۔ راستے میں کچھ مجھ جیسے بیچ میں گڑ بڑ یقین والے بھی تھے، انھوں نے کیا کیا کہ کچھ چھپالیا، تو اللہ کی مدد آنی بند ہوگئی۔ اب صحرا کا سفر ہے نہ پانی آ رہا ہے نہ کھانا، دو چار دن میں بس اب تنگ ہو گئے، شیخ پر غصہ کر رہے کہ حضرت آپ اچھے بزرگ ہیں ہمیں لے کر آئے اور ہمیں مار رہے ہیں، کچھ تو ملے کھانے پینے کو۔ اتنے میں آگے دیکھتے ہیں کہ صحرا میں کچھ ہرن ہیں اور ایک کنواں ہے جس میں پانی بالکل اوپر تک آیا ہوا ہے اور یہ ہرن جا کر اوپر سے پانی پی رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ چلو اللہ میاں نے مدد کی اور پہنچے، یہ جب پہنچے تو ہرن بھی بھاگ گئے اور کنویں کا پانی بھی نیچے ہو گیا، انھوں نے ہاتھ سے لینا چاہا تو پانی اور نیچے ہو گیا، انھوں نے ڈول ڈالا تو وہ اور نیچے ہو گیا، انھوں نے رسی ڈالی وہ اور نیچے ہو گیا، ساتھ پگڑی باندھ کر اور رسی باندھی تو اور نیچے۔ کہنے لگے اے اللہ! ہم بھی تیرے ہی بندے ہیں جیسے یہ ہرن تیری مخلوق ہے ویسے ہی ہم بھی تیری مخلوق ہیں۔ آواز آئی کہ تمہارا بھروسہ ڈول اور رسی پر ہے اور ان کا ہماری ذات پر تھا اس لیے انھیں پلا رہے ہیں۔ یہ تو اب جتنا توکل اور اعتماد قوی ہو گا اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ غیب کی صورتیں پیدا فرمائیں گے۔ تقویٰ اور توکل مستقل ایک ذریعہ ہے خدا سے ملنے کا، اور پھر کیسے پلتے ہیں؟ بات لمبی ہو جائے گی میں اس وقت نہیں چھیڑتا پھر کسی وقت بتاؤں گا کہ یہ کیسا ذریعہ ہے خدا سے لینے کا، یہ کیسا سبب ہے۔ بہر حال

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جو ہم جیسے ضعیف الہمت ہوتے ہیں ان کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ اسباب کو ترک نہ کرو۔ اب یہ شوکت صاحب ہیں حاجی اسلم کے بھائی انھوں نے چار مہینے دیے اور اس کے بعد یہاں سے حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ میں ملازمت چھوڑتا ہوں اور رائے ونڈ میں پڑ جاتا ہوں۔ حضرت نے اجازت نہیں دی۔ یہ بشیر صاحب ہیں ان کے بیٹے مولوی احسان ہیں، انجنیئر ہیں، کئی مرتبہ انھوں نے حضرت جیؒ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں نوکری چھوڑ دوں، حضرت نے اجازت نہیں دی۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کرنے والا ہوتا ہے وہ اجازت نہیں لیا کرتا، اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ مجبوراً چھوڑ دیتا ہے۔

ع من نمی گویم یار می گوید بگو

وہ تو خود نہیں کہتا خدا ہی کرواتا ہے، مجبور ہو جاتا ہے کیسے نہ کرے۔ ایک توکل وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ غیبی راستے سے دیتا ہے وہ قوی الہمت لوگوں کے لیے ہے۔ اگر ہم جیسے ضعیف الہمت لوگوں کو کہو گے کہ ہر چیز کو چھوڑ کر آ جاؤ تو پشاوری محاورہ ع

چڑھ جا بیٹا سولی اللہ بھلی کرے گا

بیوی کو طلاق دے دو، دکان کو نیلام کر دو، ملازمت کو چھوڑ دو اور بن جاؤ بزرگ، تو یہ شریعت میں جائز نہیں ہے۔ دیکھو مثال کے طور پر بیوی غریب کو تم کیوں طلاق دو گے؟ کیا اس کے حقوق تم پر واجب نہیں؟ تم جا کر جنگل میں بیٹھ گئے، تم تو بن گئے بزرگ اور اس غریب کی بیخ نکال دی۔ تمہارے ماں باپ کے تم پر حقوق ہیں ان حقوق کو تم نے تباہ کر دیا، بہن کے حقوق ہیں بھائی کے حقوق ہیں ان سب کا ستیا ناس

کر دیا اور بن گئے بزرگ۔ حقیقت یہ ہے کہ دین نام ہے اعتدال کا اور حقوق کی ادائیگی کا، حقوق کے توڑنے کا نام دین نہیں ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعضے اسباب کو تم ترک کر سکو گے بعضوں کو نہیں ترک کر سکو گے، بعضوں کو اختیار کر سکو گے بعضوں کو نہیں اختیار کر سکو گے۔ اب قوی الہمت کے لیے جہاں ترک اسباب جائز ہو گا تمہارے لیے ناجائز ہو گا۔ اسی طور پر یہ جو عمومی طور پر دعوت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے وہ تو اپنی سطح سے جو دینے والے ہیں وہ دے دیتے ہیں، ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ آیا ہم اس پر چل بھی سکتے ہیں یا نہیں چل سکتے۔ بہر حال میں مختصر لفظوں میں بات کو ختم کرتا ہوں۔ جن اسباب کا اختیار کرنا واجب ہے انھیں لازمی طور پر اختیار کرو، جن کا ترک جائز نہیں ہے انھیں تم ترک نہیں کر سکتے۔ اب بعضے ایسے اسباب ہیں مثال کے طور پر تمہارے دل میں آتا ہے کہ میں جاؤں گا صدر صاحب سے بات کروں گا، فلاں سفارش کرواؤں گا تو یہ کام ہو جائے گا یہ ظنی چیز ہے چاہو تو چھوڑ دو۔

بعضے اسباب ایسے ہیں جو حرام کے رُخ پر ہیں، اگر ہم انھیں اختیار کرتے ہیں تو ہم حرام میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر رشوت ہے، ناجائز چیز کا کمانا ہے یہ بھی اسباب ہیں لیکن اگر انھیں اختیار کیا جائے تو حرام میں مبتلا ہوتے ہیں لہٰذا انھیں چھوڑنا پڑے گا۔ مباح چیزوں کے اسباب کا اختیار کرنا مباح ہے، جو چیزیں فرض کے درجے میں ہیں ان کا فرض، جو واجب ہیں ان کا واجب اور جن کا ترک ضروری ہے ان کا ترک ضروری۔ تو مختلف (Stages) اور مختلف مدارج ہیں۔

ان دو موٹی چیزوں کو ذہن میں رکھو۔ توکل کے نتیجے پر اسباب کا اختیار اور

اسباب کا ترک دونوعیّتوں سے ہوگا۔ پہلی نوعیت یہ ہوگی کہ اسباب کے مدارج کو دیکھا جائے گا کہ آیا فلاں سبب واجب ہے یا مستحب، فلاں مسنون ہے یا مباح۔تو اب جس درجے کا سبب ہوگا اس کے مطابق ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا کہ اسے اختیار کرنا چاہئے یا ترک کرنا چاہئے۔ پھر دوسری صورت یہ ہوگی کہ شخصِ متعلق کو دیکھا جائے گا، جس شخص کے متعلق معاملہ ہے کہ آیا وہ شخص اس سبب کو ترک کردے تو اس کے ایمان میں زیادتی آئے گی یا کمی آئے گی، وہ خدا سے ٹوٹے گا یا خدا سے جڑے گا، ایسی حالت میں اسباب مستحبہ کے ترک کرنے کا ضعیف الہمت کو کبھی بھی مشورہ نہیں دیا جائے گا اور قوی الہمت کو کہا جاسکتا ہے کہ بھئی اگر تم برداشت کرسکتے ہو تو ترک کرنے کو اختیار کرلو۔ لیکن جیسے مولاناؒ نے فرمایا ہے جتنی کہ جانور کی طاقت ہے اس کے بقدر اس پر بوجھ ڈالو، جتنا وہ برداشت نہیں کرسکتا تو تم کیسے اس پر بوجھ ڈالتے ہو۔ اسی طور پر دیکھو آپ کہتے ہیں کہ بھئی بعضے بزرگوں نے دوائی کا ترک کردیا ہے۔ اب یہ حال کی بات ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ طبیب نے مجھے بیمار کیا ہے اور میں طبیب کو بتا چکا ہوں اور طبیب نے مجھے یوں کہا ہے کہ میں جو چاہتا ہوں کردیتا ہوں۔ یا حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کہا کہ

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ ۝ (الشعراء:۸۰)

ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں (جس کے بعد شفا ہوجاتی ہے) تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

تو اس میں دو نوعیتیں ہوں گی، یا تو ان کا حال مستحکم ہے اور وہ ہیں قوی الہمت ان کے لیے توحید افعالی حال کا درجہ اختیار کرچکی ہے اور خداوند قدوس ان

کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے جیسا ان کا حال ہے، ہم جب ویسے نہیں ہیں تو ہم جب اس چیز کو اختیار کریں گے اور ہمارے دلوں میں چونکہ وسوسہ سا ہوگا پتہ نہیں کرتا ہے یا نہیں کرتا، تو جب تھوڑا سا بال کے برابر بھی فرق ہوگا تو یہ مدد میں رکاوٹ کا سبب بن جائے گا۔اسی کے متعلق مولاناؒ نے فرمایا

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام

پس سخن کوتاہ باید والسّلام

ترجمہ: کوئی بھی خام (ناپختہ اور حقیقت ناآشنا) کسی پختہ اور حقیقت شناس کی حالت سے واقف نہیں، اس کی صحیح کیفیت نہیں سمجھتا۔

کامل کا حال مجھ جیسا کیسے اختیار کر سکے۔ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر سبب کا اختیار کرنا واجب ہے، نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر سبب کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ہر سبب کو اس کے درجے پر دیکھو، پہلے اپنے دل کی طرف جھانکو اور دل کو جھانکو تو جو اسباب مستحبہ ہیں ان کے متعلق ترک اور عدم ترک کا سوال اٹھے گا، جو کہ واجب والے اسباب ہیں انھیں تم نہیں ترک سکتے ہو۔



''اللہ کی معرفت اور عبدیت''

(دارالعلوم اتمان زئی میں بیان)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَشَفِیْعَنَاوَحَبِیْبَنَاوَمُرْشِدَنَا مُحَمَّدً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍوَ اٰلِہٖ وَاَصْحٰبِہٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط ھُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ o اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی حَبِیْبِکَ وَرَسُوْلِکَ مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ مُزَکِّیِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْکِرَامِ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

میرے بزرگو، عزیزو اور دوستو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمارے آقا سید المرسلین حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کائنات میں اپنا سب سے بڑا پیغمبر، سب سے بڑا رسول اور اپنی طرف سے اپنی پہچان کے پیدا کرنے والا اور اپنی ذات کا لوگوں کو بتانے والا سب سے بڑا بنا کر بھیجا۔ دوستو! اس دنیا میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس عالم میں آکر اپنے خالق کو بھلا دیتا ہے۔ انسان ہر چیز کو جانتا ہے خدا کو نہیں جانتا، انسان

ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اپنے حقیقی نفع وضرر کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ انسان یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کہاں سے آیا، کیوں آیا، کس لیے آیا اور کہاں جائے گا، اور آگے جا کر اس کے آگے کون کون سی منازل آرہی ہیں اور کل موت کے بعد کی زندگی میں اسے کن کن چیزوں نے فائدہ دینا ہے اور کن کن چیزوں نے نقصان دینا ہے، انسان اس کو نہیں سمجھتا۔ انسان اس دنیا میں آکر ایسا مدہوش اور بیہوش ہو جاتا ہے کہ سوائے اس دنیا کے جاننے کے اس کے سامنے کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہتی۔ انسان اپنی طرف سے اپنے بھلے اور برے کو نہیں جانتا، وہ اپنے نقصان کو اپنا فائدہ سمجھتا ہے اور اپنے فائدے کو اپنا نقصان سمجھتا ہے، وہ اپنی زندگی صرف اس رُخ سے گزارنا چاہتا ہے کہ وہ تھوڑا سا فائدہ جو اسے اس آتی جاتی دنیا میں دکھائی دیتا ہے، ماں کے پیٹ سے پیدائش کے بعد اور قبر میں جانے سے پہلے تک کا جو زمانہ ہے، انسان کی محنت سمٹ کر صرف اسی چیز پر آجاتی ہے، انسان حق سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور وہ صرف اس تھوڑی سی محنت میں اپنی تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے، جو صلاحیتیں کہ اللہ نے انسان کے اندر اس لیے رکھی تھیں کہ انسان ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے ایک طرف خدا کا جاننے والا بنے اور دوسری طرف اپنی موت کے بعد کی ابدالاباد کی زندگی کا سنوارنے والا بنے۔ انسان اس لیے نہیں آیا تھا کہ وہ یہاں تھوڑی سی چیزوں کو حاصل کرے، تھوڑے سے مادے کو حاصل کرے، تھوڑی سی اشیاء کو لے لے اور تھوڑی سی چیزوں پر قناعت کر لے، انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہرگز ہرگز اس چیز کے لیے پیدا نہیں کیا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت اونچے پیمانے پر اُٹھایا اور بہت اونچی صلاحیتیں عطا فرمائیں اور انسان کو خداوند قدوس نے ہر مخلوق سے اونچا کر

کے ہر مخلوق کو اس سے نیچا کیا۔ انسان کے اوپر ایک خدا کی ذات ہے اور اُس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا۔ اس کی پوری کی پوری محنت کا مدار اور اس کی پوری کی پوری محنت صرف اس لیے ہوگی کہ وہ خدا کو پہچانے، کہ خدا کی صفات کیا ہیں، خدا کی ذات انسان کو کیا دیتی ہے، انسان خدا کے تعلق کے بعد کیا حاصل کر سکتے ہیں اور خدا کو چھوڑ کر انسان کس طور پر برباد ہو جاتے ہیں۔ انسان معرفت حق کے لیے پیدا کیا گیا ہے، انسان موت کے بعد کی زندگی کو سنوارنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ دنیا تو ایک آتی جاتی منزل ہے، یہ دنیا ایک رہگزر ہے، یہ ٹھکانہ نہیں ہے، یہ مستقر نہیں ہے، یہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں انسان آ کر اپنی تمام صلاحیتوں کو اور اپنی تمام کاوشوں کو صرف اس لیے صرف کر دے کہ یہاں کی دنیا کی چند دن کی زندگی بن جائے۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد:

دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر زمانے میں انسان پر رحم کھاتے ہوئے اور انسانوں کے حالات کو سنوارنے کے لیے انبیاء علیھم السلام مبعوث کیے۔ انبیاء علیھم السلام آ کر سب سے پہلے ایک چیز انسانوں کے سامنے رکھتے ہیں اور وہ چیز ہر چھوٹے سے چھوٹے انسان کے لیے اور ہر بڑے سے بڑے انسان کے لیے اور بڑے انسان سے میری مُراد انبیاء علیھم السلام کی ذواتِ عالیہ سے ہے، انبیاء علیھم السلام کی ذوات عالیہ بھی سب کی سب اس عالم میں جو آئیں تو ان کا اس دنیا میں آنے کا جو مقصودِ اصلی تھا وہ خداوند قدوس کی معرفت کو بدرجۂ اتم حاصل کرتے ہوئے اسے انسانوں تک پہنچانا تھا۔ انبیاء علیھم السلام اس دنیا میں اس لیے نہیں آئے تھے کہ وہ اس دنیا کی مادیت کی ترقیوں کو تمہارے سامنے مزید اجاگر کرتے چلے

جائیں اوراس دنیا کی جو چیزیں ہیں انھیں بنا بنا کراور سنوار سنوار کرتمہارے آگے رکھتے چلے جائیں ۔انبیاء علیھم السلام اس دنیا میں اس لیے نہیں آئے تھے ۔انبیاء کی بعثت کا واحد مقصد صرف اتنا تھا جیسا کہ انبیاء کی زبان سے قرآن نے بار بار کہا

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا للّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

ترجمہ: اورہم ہرامت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرواورشیطان کے رستہ سے بچتے رہو۔

دو چیزوں کی دعوت دی ، رب تعالیٰ کی بندگی اور طاغوت (شیطان) سے بچنا۔

معرفت کیا ہے؟

ربّ کی بندگی کیا ہے؟، عبدیت کیا ہے؟اور طاغوت سے بچنا کیا ہے؟ میں مختصرلفظوں میں ان دو باتوں پر کچھ انشاء اللہ عرض کروں گا۔ دوستو! عبدیت انسان کی زندگی کا حاصل ہے ۔عبدیت کہتے ہیں کہ انسان خدا کو پہچانے اس کی عظمت کے ساتھ اوراپنی ذات کو پہچانے اپنی انکساری کے ساتھ، اپنی ذلت کے ساتھ ،اپنی عاجزی کے ساتھ اوراپنے فقر کے ساتھ کہ تیری حیثیت اپنی ذات کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ جب تک کہ تیراتعلق خالق کی ذات کے ساتھ نہیں ہوگا، جب تک خدا کا تو جاننے والا نہیں بنے گا ، جب تک کہ خدا کے پہچاننے والا نہیں بنے گا، تیرے تمام کے تمام معاملات بیکار رہ جائیں گے ۔ تیری کامیابی صرف خدا کے تعلق کے ساتھ ہے اورخدا سے ہٹ کر تیری کوئی کامیابی نہ اس دُنیا میں ہوسکتی ہےاور نہ موت کے بعد ہو

سکتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جسے آپ اور ہم بار بار نماز کی ہر رکعت میں صرف فرائض و واجبات میں روزانہ بیس دفعہ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں

اِیَّاکَ نَعۡبُدُوَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ O (الفاتحۃ:۴)

ترجمہ: ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں۔

یعنی انسان کی راہ عبدیت اور استعانت من اللہ کی راہ ہے۔ انسان کی راہ کیا ہے؟...... بندہ بننے کی راہ اور خدا کی مان لینے کی راہ۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ انسان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ عبدیت پیدا کرنا چاہتا ہے، انسان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ دُعاء کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اب عبدیت کیا ہے اور دعاء کیا ہے؟...... خدا کی معرفت کے حصول کے نتیجے پر دعاء میں جان آتی ہے اور عبدیت تب انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے جب انسان اس چیز کا جاننے والا بن جائے اور اچھی طرح پہچاننے والا بن جائے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ۔ خداوندقدوس کی جب تک معرفت نصیب نہیں ہوگی عبدیت کا کمال نصیب نہیں ہوگا، عبدیت اور معرفتِ حق لازم وملزوم ہیں۔ اسی بناء پر حضرت مجاہدؒ نے آیت

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ O (الذاریات:۵۶)

ترجمہ: ہم نے نہیں پیدا کیا انسانوں اور جنوں کو مگر اس بات کے لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔

کی تفسیر کی ہے اِلَّا لِیَعۡرِفُوۡنَ یعنی کہ ہم نے جنات اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کے حاصل کرنے والے بن جائیں۔ معرفتِ ربّ کا

نتیجہ عبدیت کا کمال ہے۔ جتنی معرفت کامل ہوگی اتنی عبدیت کامل ہوگی اور جتنی عبدیت کامل ہوگی اتنی معرفت حق کامل ہوگی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا لازمہ ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہیں۔ اگر عبدیت قائم نہیں ہوتی تو معرفت قائم نہیں ہوتی اور معرفت قائم نہیں ہوتی تو عبدیت قائم نہیں ہوتی۔

<u>معرفت کا بیج ازل میں ہی دلوں میں ڈال دیا گیا تھا:</u>

اب دوستو! ہم اس دنیا میں آتے ہیں اور آنے کے بعد ہماری حالت بالکل بدل جاتی ہے حالانکہ آپ سب جانتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہم عالمِ ارواح میں تھے، ہم میں سے کسی کو یاد ہو یا نہ ہو، بہت سارے عارفین ایسے بھی گزرے ہیں جنھیں اچھے طور پر یہ معلوم تھا اور اچھی طرح یاد تھا کہ کوئی زمانہ تھا اور کوئی عہد تھا جس میں خداوند قدوس کی تجلی ان پر ہوئی تھی اور خدا نے یوں کہا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) اور انھوں نے بے اختیار پکارا تھا قَالُوْا بَلٰی (سب نے جواب دیا کیوں نہیں)۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور پچھلے دور میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت خدا نے ہم سے عالم ارواح میں پوچھا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ تو ہم نے اس کا جواب دیا تھا بَلٰی شَھِدْنَا یعنی اے اللہ تعالیٰ صحیح بات یہ ہے کہ تو ہی ہمارا پروردگار ہے اور اس پر ہم گواہی دیتے ہیں، حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے۔ تو گویا ایک وہ زمانہ تھا جس میں کہ خداوند قدوس کی صفات کی اجمالی تجلی ہم پر ہوئی اور ہم

نے خود بخود فطرۃً اپنی فطرت کے لحاظ سے پکارا اور یوں کہا کہ اے اللہ بیشک تو ہمارا ربّ ہے۔ ہم جب اس دُنیا میں آئے تو اس معرفتِ ربّ کو اپنے اندر لے کر آئے اور غالبًا اس حدیث کے یہی معنیٰ ہیں جس کے اندر یوں فرمایا ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے

اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِیْ جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: دین کی امانت انسانوں کے دلوں کی جڑوں کے اندر ڈالی گئی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازل میں ہدایت کا بیج، ایمان کا بیج اور معرفتِ حق کا بیج ہر انسان کے دل کے اندر بکھیر دیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے سے ناآشنا کر کے اس عالم میں بھیجا۔ اللہ نے شروع ہی میں اپنی تجلّی ہمیں دے دی تھی اور اپنا تعارف شروع ہی میں کرا دیا تھا، پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کل دنیا میں جا کر یا کل قیامت کے دن انسان یوں نہ کہہ دیں کہ ہم خدا کو پہچاننے والے نہیں تھے، اے اللہ ہم تو جانتے ہی نہیں تھے کہ تو کون ہے، تیری ذات کون ہے، ہم کہاں سے آئے، کس طور پر آئے ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ازل میں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی مہر ہر ایک کے قلب پر ثبت کر دی تھی کہ جب تک انسان انسانیت کے دائرے میں رہے اور انسان انسان کی حیثیت میں باقی رہے وہ ربوبیت الٰہیہ کا ہر صورت سے اقرار کرتا رہے وہ رَبُّنَا اللّٰهُ، رَبُّنَا اللّٰهُ پکارتا رہے جیسے کہ ہمارے قاری صاحب نے تلاوت کی

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ

تُوۡعَدُوۡنَ ٥ (حم:۳۰)

ترجمہ: جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا پروردگار ہے یہ انسان کے دل کے اندرون کی پکار ہے۔ یہ روزِ اَلست کا وہ وعدہ ہے اور یہ روزِ الست کی وہ حقیقت ہے جو ہر انسان کے دل کے اندر ازل میں سمودی گئی تھی۔ اور ازل میں اللہ نے انسانوں کے دلوں میں اس چیز کو ڈال دیا تھا۔ انسان اس عالم میں آکر خدا کے ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے ہوں، فرعون جیسا منکر ہو تو وہ بھی جیسے کہ قرآن کہتا ہے کہ حقیقت کے لحاظ سے وہ یقین کر چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جس پیغام کو لے کر آئے ہیں وہ ایک حقیقت ہے لیکن اپنی دنیاوی وجاہتوں کی بناء پر، علو کی بناء پر اور ظلم وزیادتی کی بناء پر وہ انکار کر بیٹھا، ورنہ ہر شخص کے دل کے اندر کی پکار کیا ہوتی ہے؟...... یہی ہوتی ہے رَبُّنَا اللّٰهُ رَبُّنَا اللّٰهُ ہمارا پروردگار اللہ ہے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔......اسی معنیٰ کے لحاظ سے میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

مَامِنۡ مَوۡلُوۡدٍ اِلَّا یُوۡلَدُعَلَی الۡفِطۡرَةِ

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، فطرت سے مراد ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے توحید الٰہی ہے۔ انسان کا ہر بچہ اللہ کی توحید ساتھ لے کے پیدا ہوتا ہے، وہ ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ناآشنا ہو۔ یہ خدا سے ناآشنائی اور خدا سے ناواقفیت اور اللہ کو بھول جانا جو ہوتا ہے وہ اس دنیا میں آکر ہوتا ہے، اس دنیا سے پہلے نہیں ہوتا۔

بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تب بھی وہ اسلام کی حالت میں ہوتا ہے اور جس وقت وہ پیدا ہوتا ہے وہ اسی فطرت کی حالت میں ہوتا ہے پھر بعد میں اس کے ماں باپ اسے کبھی یہودی بنا دیتے ہیں کبھی نصرانی بنا دیتے ہیں اور کبھی مجوسی بنا دیتے ہیں، حدیث پاک میں ہے

مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ اَوْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام (بخاری)

ترجمہ: کوئی بچہ ایسا نہیں ہوتا جو فطرت (دین توحید) پر پیدا نہ ہو لیکن ماں باپ اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

یعنی بچہ جس ماحول میں آتا ہے اس ماحول کے اثرات لیتے لیتے خدا سے غافل ہوتا جاتا ہے اور غیر اللہ میں شاغل ہوتا جاتا ہے، خدا کو بھولتا جاتا ہے اور دنیا کی چیزوں میں اٹکتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اشیاء اور غیر اللہ اس کا مقصود ہو جاتا ہے، خدا کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کا تعلق اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ جس نے پیدا کیا تھا اس کو تو نہیں جانتا اور باقی ہر غیر کو جانتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد ہے خدا کو جان لینا وہ انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور انسان اپنے نفع اور نقصان کو بھلا دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے

وَ لَاتَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ ط (الحشر:۱۹)

ترجمہ: اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی سو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پروا بنا دیا۔

انسان جب خدا تعالیٰ کو بھلا دیتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفسوں کو بھی

بھلا دیتے ہیں، اپنے نفس کا نفع اور ضرر نگاہوں کے سامنے نہیں رہتا۔ اگر اپنا صحیح نفع اور ضرر انسان کی نگاہ کے سامنے ہو اور انسان اپنے نفس کا پہچاننے والا ہو تو وہ خدا کا پہچاننے والا ہوگا اور اگر اپنے نفس کو نہیں پہچانتا تو خدا کو نہیں پہچانے گا۔ خدا کو جانے گا تو نفس کو جانے گا اور نفس کو جانے گا تو خدا کو جانے گا۔ اسی کے متعلق بعض عارفین نے کہا ہے

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

ترجمہ: جنھوں نے اپنے نفس کو جانا انھوں نے خدا کو پہچانا۔

نفس کی پہچان سے خدا کی پہچان آتی ہے، اور خدا کی پہچان سے انسان اپنے بھلے اور برے کو جاننے والا بن جاتا ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس دنیا کا ماحول انسان کو خدا ناآشنا بنا دیتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس لیے ہوتی ہے کہ یہ غافل انسان جو کہ دنیا کے شکنجوں میں پھنس کر اور دنیا کی چیزوں میں اٹک کر اور دنیا کی زیب و زینت میں اُلجھ کر بچوں کے چکر میں آ کر، اولادوں کے چکر میں آ کر، مال و دولت، کے چکر میں آ کر اللہ سے اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، اس کی اس غفلت کو دور کیا جائے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ (آل عمران:۱۴)

ترجمہ: خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر (یعنی

نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

دنیا کی مختلف چیزیں انسان کو خدا سے غافل کرتی ہیں لیکن جو انسان خدا میں شاغل ہوتا ہے اس شاغل انسان کو یہ اشیاء خدا سے غافل نہیں کرسکتیں۔ خدا والوں کو دنیا کی ہر چیز میں خدا کا کمال دکھائی دیتا ہے، وہ اشیاء میں نہیں اُلجھا کرتے، وہ چیزوں میں رہتے ہوئے خدا میں مشغول ہوتے ہیں لیکن یہ اُن کے لیے ہے جنھوں نے ایک دفعہ اپنے دل کو غیر اللہ سے فارغ کرلیا۔ اور جو غیر اللہ میں اٹکا ہوا ہے اور جس کے دل میں غیر سمایا ہوا ہے وہ جس حال میں اور جس چیز میں بھی ہوگا، میری طرح نماز میں بھی آئے گا تو اس کی نماز نماز نہیں ہوگی، نماز پڑھے گا لیکن اس کی نماز نماز نہیں ہوگی، نماز کی تکبیر تحریمہ کہہ دے گا، اللہ اکبر کہہ لے گا لیکن اللہ اکبر تو اس کی زبان پر ہوگا لیکن اس کے دل میں وہ چیزیں ہوں گی جنھیں دل کے لحاظ سے وہ بڑا سمجھتا ہے۔ زبان سے کہہ رہا ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے لیکن دل کے اندر وہ چیزیں اٹکی ہوئی ہیں جنھیں حقیقت کے لحاظ سے اس کا دل بڑا سمجھتا ہے۔ ہم نماز کی حالت میں چیزوں کو سوچتے ہیں یا نہیں؟ خیالات آتے ہیں یا نہیں آتے؟ اگر ہم خدا کو اکبر (سب سے بڑا) کہتے ہیں تو پھر ان اَصاغر (چھوٹوں) کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے، ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ذہن میں آنے کی جگہ کہاں رہتی ہے۔ بات یہ ہوتی ہے کہ زبان پر اللہ اکبر ہوتا ہے اور دل میں یہ ہوتا ہے کہ جتنی بھی چیزیں ہیں یہ سب بڑی ہیں۔ اگر ہمارے خیال میں یہ چیزیں بڑی نہ ہوتیں تو ہماری نگاہ ان کی طرف کیوں جاتی۔

دوستو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انسان اگر خدا میں شاغل ہوگا تو یہ پورا کا پورا عالم بلکہ میں یوں کہہ دوں کہ یہ دونوں عالم اس کی نگاہ کے سامنے آجائیں تو یہ ان میں مشغول نہیں ہوگا بلکہ یوں کہہ دے گا۔

دیوانۂ خود کنی و ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

ترجمہ: اپنا دیوانہ بناتا ہے اور اسے ہر دو جہان دیتا ہے تیرا دیوانہ دو جہانوں کو کیا کرے گا۔

خدا کا جو ہوتا ہے اس کے لیے اشیاء مضر نہیں ہوتیں، نقصان نہیں دیتیں، وہ چیزوں میں اَٹکتا نہیں۔ وہ چیزوں کا استعمال کرتا ہے مرادِ حق کے مطابق اور حکمِ حق کے مطابق۔ وہ اپنے نفس کی چاہت کے ساتھ، وہ اپنے دل کی لگن کے ساتھ اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں کے ساتھ چیزوں کو استعمال نہیں کیا کرتا۔ وہ اگر استعمال کرتا ہے تو صرف اس لیے استعمال کرتا ہے کہ اس کا خدا کہتا ہے کہ میں نے تجھے یہ چیزیں دی ہیں ان چیزوں کو اُن راہوں پر لگاؤ جن راہوں پر میں چاہتا ہوں کہ تم انھیں لگا دو۔ اشیاء کا استعمال اگر اَحکام کے مطابق ہے تو وہ خدا کا دِلانے والا ہے، اور اشیاء کا استعمال اگر خدا کے احکام سے ہٹا ہوا ہے تو یہ انسان کو خدا سے ہٹانے والا ہے، خدا سے دور کرنے والا ہے۔ چیزیں انسان کو خدا تک بالذّات نہیں پہنچاتیں، بلکہ چیزوں کا استعمال اگر صحیح رخ کا ہے تو وہ انسان کو خدا تک پہنچا دیں گی اور اگر صحیح استعمال نہیں ہوگا تو انسان کو خدا سے دور کر دیں گی۔ دیکھو! نماز بہت بڑی عبادت ہے لیکن آپ سب جانتے ہیں کہ اگر ایک شخص آتا ہے اور نماز پڑھتا ہے لیکن خدا کی

رضا کے لیے نہیں پڑھتا بلکہ اس لیے پڑھتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ نمازی ہے تو اس کی نماز اسے خدا تک پہنچائے گی یا جہنم تک پہنچائے گی؟ وہ نماز جس کا مقصد خدا کی رضا نہیں ہوگا بلکہ رضائے خلق ہوگا، لوگوں کو خوش کرنا ہوگا وہ نماز خدا کو نہیں دلائے گی بلکہ جہنم تک پہنچائے گی۔ اسی طور پر ایک شخص ہے حج جیسے عمل پر جاتا ہے، حج بہت بڑا عمل ہے لیکن اگر حج کا عمل اخلاص کے ساتھ نہیں اور صرف اس لیے ہے کہ میں دنیا میں بڑا حاجی کہلایا جاؤں اور لوگ سمجھیں کہ یہ بہت بڑا حج کر کے آ گیا ہے، بہت بڑا الحاج ہے اور مقصود خدا کی رضا نہیں ہے، اس حج کے اندر صرف شہرت ہے، صرف نمود ہے، صرف دکھاوا ہے تو یہ حج اسے خدا تک نہیں پہنچائے گا بلکہ اسے خدا سے دور کرنے والا ہوگا۔ تو دوستو! اتنی بڑی بڑی عبادات اگر ان کے اندر اخلاص نہیں ہوتا اور وہ خدا کے لیے نہیں ہوتیں تو وہ انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں۔ دیکھئے علم ہے، علم بہت بڑی چیز ہے، علم خدا کی صفات میں سے ہے، اور قرآن کریم کہتا ہے

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر:۲۸)

ترجمہ: (اور) خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔

اِنَّـمَـا حصر کا صیغہ ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ حقیقت میں اگر کوئی اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے تو وہی شخص ہوسکتا ہے جو عالم ہوتا ہے، اگر علم والا نہیں ہوگا تو وہ خدا سے صحیح معنیٰ میں ڈرنے والا نہیں ہوگا۔ اب علم کے دو رُخ ہیں ایک علم وہ ہوتا ہے جو کہ انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے اور انسان کو ربّانی بنا دیتا ہے اور ایک علم وہ ہوتا ہے جو کہ انسان کے دل میں آ کر قساوت پیدا کر دیتا ہے۔ اور حدیث میں آتا ہے، نبی

پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا خدا سے سب سے دور جو دل ہوتا ہے

اَلْقَلْبُ الْقَاسِتُ اَبْعَدُ مِنَ اللّٰه

ترجمہ: سخت دل سب سے زیادہ خدا کی ذات سے دور ہوتا ہے۔

اب علم ہے اور علم کے آنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟......خدا والا جو علم ہوگا میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَنَا اَتْقٰکُمْ لِلّٰهِ وَ اَعْلَمُکُمْ بِحُدُوْدِ اللّٰهِ (مسند احمد)

ترجمہ: میں تم سب سے زیادہ خدا کا جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں۔

جب علمِ الٰہی آئے گا تو خشیت الٰہی آئے گی اور شرعی خشیت جسے کہتے ہیں اس کے متعلق ایک حدیث کی دعاء میں آتا ہے میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِکَ مَا يَحُوْلُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْکَ (ترمذی)

ترجمہ: اے اللہ ہم تیری ایسی خشیت کو چاہتے ہیں جو کہ حائل ہو جائے ہمارے اور گناہوں کے درمیان۔

یعنی جب خشیت آئے گی تو انسان سے گناہ نہیں ہوں گے اور خشیت تب آئے گی جب علم الٰہی آئے گا۔ اب علم الٰہی اگر صحیح معنیٰ میں علم الٰہی ہے تو جتنا بڑا عالم ہوگا وہ اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوگا، اس کے اندر ربّانیت ہوگی اس کے اندر خدا کا خوف ہوگا، اس کے اندر خدا کا ڈر ہوگا۔ جتنا علم آئے گا معرفتِ حق بڑھتی جائے گی

اور جتنی معرفتِ حق بڑھتی جائے گی اتنا خدا کا تعلق بڑھتا جائے گا اور جتنا خدا کا تعلق بڑھتا جائے گا اتنا انسان کے اندر خشیت الٰہی پیدا ہوتی جائے گی ...... خدا کی خشیت عام لوگوں کے ڈر اور خوف کی طرح نہیں ہوتی بلکہ خدا کی خشیت خدا کی معرفت کے ساتھ مطلوب ہوتی ہے، خدا کی ذات انتہائے جمال والی ہے، خدا کی ذات انتہائے کمال والی ہے، خدا کی ذات انتہائے رحمت والی ہے، خدا کی ذات انتہائے محبوبیت والی ہے تو جو خدا کو جانے گا وہ خدا کو چاہے گا بھی۔ خدا کی محبت ان دلوں میں آئے گی جو علم الٰہی والے ہوں گے جن کے دلوں میں خدا کا علم ہوگا وہ جس طور پر خدا سے ڈرنے والے ہوں گے وہ اسی طور پر خدا سے محبت کرنے والے بھی ہوں گے ...... دو بنیادی چیزیں ہیں جو صحیح علم کے نتیجے کے طور پر ایک عالم کے دل میں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ہیں خشیت الٰہی اور محبت الٰہی اور یہ دونوں لازمے ہیں خدا کی معرفت کے، جب جلالی صفات کا ظہور ہوتا ہے تو انسان خدا سے ڈرنے لگتا ہے، خشیت بڑھتی ہے اور جب جمالی صفات کا ظہور ہوتا ہے تو انسان کے اندر خدا کی محبت آتی ہے، خدا کا پیار آتا ہے اور خداوند قدوس کی ذات کے ساتھ ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک عاشقِ صادق کا اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ علم کو لیجئے، ایک طرف تو علم سے بڑھ کر کوئی بڑی نعمت نہیں اور دوسری طرف جیسا کہ احادیث میں آتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی مشہور روایت ہے جس میں انھوں نے تین شخصوں کے متعلق کہا تھا اور جس حدیث کو بیان کرنے کے دوران وہ تین مرتبہ بیہوش ہو کر گرے تھے اور آخر میں کہا تھا کہ کل یعنی قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ تو نے میرے لیے

دنیا میں کیا کام کیا؟...... وہ کہے گا اے اللہ میں نے تیرے کلام کوسیکھا تیری کتاب کو سیکھا میں قاری تھا، میں علم والا تھا۔...... پہلے جو دورِ صحابہ ہے اس میں قاری نرا آج کی طرح قرأت کا پڑھنے والا نہیں ہوتا تھا، صرف قرآن کی قرأت کر لینے والے کا نام قاری نہیں تھا بلکہ دورِاوّل میں جو قاری کہلاتا تھا وہ قرآن کے مَالَہٗ وَمَاعَلَیْہِ تمام علوم کا جاننے والا بھی ہوتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اور تابعین کے زمانے میں قرآن کو جیسے پڑھتے تھے اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت ہے اور مجاہدؒ سے بھی روایت ہے، کہتے ہیں جب ہم قرآن کی دس آیتیں پڑھ لیتے تھے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک اس کے جملہ مسائل کوسیکھ کر اس پر عمل کرنے والے نہیں بن جاتے تھے۔ تو اس دور میں قاری نِرا پڑھنے والا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس زمانے میں قاری جو ہوتا تھا وہ عالم باعمل ہوا کرتا تھا، ایسے نہیں ہوتا تھا کہ قرأت آگئی، زبان سے قرآن کے الفاظ جاری ہوگئے لیکن حقیقت قرآنیہ دل کے اندر نہیں آئی۔ اگر انسان اخلاص کے ساتھ قرآن کا پڑھنے والا ہوگا، تو یہ قرآن خدا کا نور ہے، قرآن خدا کا کلام ہے، یہ خدا کا نور انسان کے قلب کے اندر اترتا ہے، دل کے اندر جا کر جگہ پکڑتا ہے اور سب سے پہلے قرآن کا تأثر دلوں کے اوپر ہوا کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی سب سے پہلے دل کے اندر یہ قرآن اترا اور آپ ﷺ کے دل نے اسے اپنایا ہے اور اس کی نورانیت حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آئی اور آپ ﷺ کا دل اس قرآن سے نورانی بنا، جتنا جتنا قرآن حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اترتا چلا گیا قرآن اپنی نورانیت کو حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں ڈالتا چلا گیا، آپ ﷺ کا سینہ قرآن کے علوم کا گنجینہ بنتا چلا گیا۔ صرف یہی بات

نہیں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک قرآن کے لفظوں کا ٹھکانہ تھا بلکہ قرآن کی حقیقت کا بھی ٹھکانہ تھا۔ قرآن کے علوم کا عملاً اور معناً اور حقیقتاً جو تحقق سب سے پہلے ہوا وہ سینۂ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا۔ آپ ؐ کا سینہ تھا جس میں کہ قرآن کے علوم آئے، آپ کا سینہ تھا جس نے کہ قرآن کے علوم کو سمجھا، آپ کا سینہ تھا جس پر کہ قرآن کے ایک ایک حرف، ایک ایک شوشے اور ایک ایک بات کی حقیقت کھلی اورقرآن کے انوارات پوری حقیقت کے ساتھ متجلی ہوئے یہاں تک کہ آپ ؐ کا سینہ حقیقت میں انوارِقرآن کا گنجینہ بن چکا تھا۔ جیسے لوحِ محفوظ میں قرآن کے انوارات جگمگاتے ہیں اسی طور پر وہ تمام کے تمام انوارات سینۂ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں۔ عارفین اپنی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کشفاً دیکھتے ہیں کہ جو لوح محفوظ پر علوم قرآنیہ کا نور ہے وہی نور سینۂ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، دونوں کے انوار میں اختلاف نہیں پایا جاتا، دونوں ایک رنگ کے دکھائی دیتے ہیں، جو تجلیٔ قرآنی لوحِ محفوظ پر ہے وہی تجلیٔ قرآنی سینۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو قرآن لوحِ محفوظ میں لایا ہی اس لیے گیا تھا کہ اس نے سینۂ محمدیہ میں آنا تھا۔ اصل مقصود تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی، لوحِ محفوظ تو ضمناً مقصود قرار دی گئی تھی، حقیقتاً تو لوح محفوظ مقصود نہیں تھی۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سینۂ محمدیہ میں قرآن آیا اور اپنے پورے نور کو لے کر آیا، اپنی پوری حقیقت کو لے کر آیا اور اپنے پورے تأثر کو لے کر آیا۔ اب یہ قرآن جس کے دل میں آئے گا اس کا جسم قرآن سے خالی نہیں رہے گا۔ بلاتشبیہ عرض کروں، یہ آواز کا آلہ ہے اس میں اگر بجلی آئی ہوئی ہو اور میں ہاتھ لگا دوں تو ایکدم میرے تمام جسم میں وہ بجلی دوڑ جائے گی اور

میرے پورے کے پورے خون کو سکھا دے گی، ہائے کیا قیامت!...... کہ قرآن کی تجلی ہوتی ہے دِلوں کے اوپر، قرآن کے لفظ آتے ہیں زبانوں کے اوپر، لیکن نہ ہمارا دِل بدلتا ہے اور نہ ہمارا جسم بدلتا ہے، نہ ہمارا اخلاق بدلتا ہے نہ ہمارا کردار بدلتا ہے، نہ ہمارے اعمال بدلتے ہیں، نہ ہمارا ظاہر بدلتا ہے نہ ہمارا باطن بدلتا ہے۔ اگر نہیں بدلتا تو سبب کیا ہے؟...... سبب یہ ہے کہ الفاظ قرآنیہ تو آرہے ہیں، لیکن خول آرہا ہے حقیقت نہیں آرہی۔ بقول امام غزالیؒ تو قرآن کے لفظوں کو زبان سے ادا کرتا ہے، جس طور پر آگ کہہ لینا زبان سے آگ کا لفظ ادا کر دیتا ہے، لیکن اگر آگ زبان پر آجاتی تو تیری زبان جل جاتی۔ آگ کہہ دینے سے آگ زبان پر نہیں آتی، آگ کے لفظ آتے ہیں، جب تک لفظ ہوں گے تیری زبان نہیں جلے گی لیکن جب اس کی حقیقت آئے گی تو زبان جل جائے گی۔ اسی طور پر الفاظِ قرآنیہ، بھی بہت برکت والے ہیں میں نہیں کہتا کہ برکت والے نہیں، لیکن جب ان کی حقیقت آئے گی تو جیسے ایک دیوانہ تھا منصور حلاجؒ وہ کہتا ہے میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ کیسے پورا قرآن پڑھ جاتے ہیں میں نے تو دو بول لا الہ الا اللہ کے کہے تو قابو میں نہیں رہ سکا، یہ پورے کے پورے قرآن کو کیسے اپنے اندر سمو گئے۔

قلندر جز دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہ شہر قارن ہے لغت ہائے حجازی کا

اگر قرآن کے دو بول بھی دل کے اندر اتر جائیں تو دل کی زندگی بدل جاتی ہے۔ حضرت جبیرؓ ابن مطعم کہتے ہیں، بخاری کی روایت ہے کہ میں گزر رہا تھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے میں نے قرآن کے کچھ الفاظ سنے غالباً یہ

الفاظ تھے

وَالطُّوْرِ o وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ o (الطّور:۱،۲،۳)

ترجمہ: قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے۔

یہ لفظ سنے تو کہتے ہیں کَاَنَّ قَلْبِیْ یَطِیْرُ گویا کہ میرا دل اڑ رہا ہے۔ میرے دل کی وہ حالت نہیں رہی جو پہلی حالت تھی۔تو جو بات آ رہی تھی وہ صرف کان پر نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ دل پر آ رہی تھی اور دل کی دنیا بدل رہی تھی، اور جب دل کی دنیا بدلتی ہے تو جسم کی دنیا بدل جایا کرتی ہے۔انسان کا جسم دل کے تابع ہے میرے آقا سید الانبیاء حبیب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَلَاوَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ (بخاری)

ترجمہ: دیکھو! تمہارے جسموں کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو گیا تو تمام جسم درست ہو جائے گا اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام جسم بگڑ جائے گا اچھی طرح جان لو کہ وہ دل ہے۔

اگر دل درست ہوگا تو جسم درست ہو جائے گا اور اگر دل بگڑے گا تو پورا کا پورا جسم بگڑ جائے گا۔ جیسے آجکل ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دل تمام جسم کو خون دیتا ہے اور اگر دل کی طرف سے خون کی روانی بند ہو جائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔اسی طور پر خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم یوں کہتا ہے کہ تمہارا دل اللہ کی طرف سے ھدایت کو لیتا ہے اور ھدایت کے نور کو تمہارے ایک ایک جز تک پہنچاتا ہے۔تمہاری آنکھ تک ھدایت کا نور پہنچے گا تو تمہاری آنکھ بے وقت بے جگہ استعمال نہیں ہوگی، اگر ھدایت

کا نور تمہارے کانوں تک پہنچے گا تو تمہارے کان غلط بات کو سننے والے نہیں ہوں گے ، اگر ھدایت کا نور تمہاری زبانوں تک پہنچے گا تو تمہاری زبان غلط بات کو کہنے والی نہیں بنے گی ، اگر تمہارے جسم تک پہنچے گا تو تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ ھدایت کے رخ پر آئے گا اور وہ غلط کام کا کرنے والا نہیں ہوگا بلکہ وہ صحیح کام کا کرنے والا ہو گا ۔سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ نبیؑ پاک سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق کیا تھا؟ فرمایا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ (مسند احمد) آپ ﷺ کا خُلق سراپا قرآن تھا۔قرآن کی ایک ایک سطر کو پڑھتے چلے جاؤ بائے بسم اللہ سے لے کر سینِ ناس تک ، ......انسان کے لیے یہ بس جو ہے کافی ہے ''ب'' ''س'' سے بس بنتا ہے ناں ، بائے بسم اللہ سے لیکر سینِ ناس تک کافی ہے انسان کے لیے ......فرمایا آپؐ کا خُلق قرآن ہے ۔یعنی بائے بسم اللہ سے لیکر سینِ ناس تک دیکھتے چلے جاؤ ، جو قرآن میں تمھیں دکھائی دے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دکھائی دے گا ۔ وہ نور جو قرآن میں خدا کے کلام کی صورت میں ہویدا تھا وہی نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اعمال کی صورت میں مجسد ہوا ، مکمل ہوا ، صورت پذیر ہوا ، مصور ہوا جسے کہ آپ کہتے ہیں اعمالِ محمدیہ ۔اب اسوۂ نبویہ کیا ہے؟ ......قرآن کی عملی تشکیل کا نام اسوۂ نبویہ ہے ، قرآن کی عملی تفسیر کا نام سنت نبوی ہے ، قرآن کی عملی تشکیل کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے ......قرآن کی حقیقت جب پورے طور پر وجود میں آتی ہے اور مجسد بنتی ہے اور ایک صورت کو لے لیتی ہے تو اس صورت پذیر چیز کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ عالیہ ہے ۔اگر قرآن کو آپ لینا چاہیں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر قرآن نہیں مل سکتا ۔جیسے قرآن قرآنِ

صامت ہے، خود نہیں بولتا بلکہ بلوایا جاتا ہے، ویسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرآنِ ناطق ہے، بولنے والا قرآن ہے۔ آپؐ کے جسم سے نکلنے والا ہر عمل قرآن کا نمونہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بناء پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کو چھوڑ کر دین نہیں مل سکتا۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو چھوڑ دیا جائے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے ہٹ جایا جائے تو ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ پانچ کروڑ سال تک اگر اسے کروڑوں زندگیاں بھی ملتی چلی جائیں تو وہ خدا تک نہیں پہنچے گا۔ خدا تک پہنچنے کا واحد راستہ جو کہ خدا کی مشیت نے چاہا ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اپنایا جائے۔ ہمارے نزدیک قرآن کی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے ......بس۔ قرآن کس کی طرف بلاتا ہے؟......قرآن خدا کی طرف بلاتا ہے اور خدا کی طرف آنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے ہے، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ مُحَـمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط لازم وملزوم ہے۔ ایک بہت بڑے موحد عالم گزرے ہیں جو کہ توحید کے لحاظ سے بہت مشہور تھے علامہ ابن قیمؒ، ''مدارج السالکین'' ان کی ایک کتاب ہے اس میں لکھتے ہیں کہ جب بھی تم لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہو تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ یہ بات نہیں ہوتی کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نہیں ہوتا ہر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے اندر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ مرتسم (مہر کیا گیا) ہے۔ یعنی خدا کا لینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر خدا نہیں مل سکتا۔ زندگی کا اصل مقصد خدا تک پہنچنا، خدا تک رسائی، خدا کی معرفت اور اپنی عبدیت کا کمال ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سب سے بڑے جاننے والے ہیں، اعرف النّاس ہیں، اور خدا کی بندگی میں آپؐ سے بڑا بندہ کوئی بھی تو اس دنیا میں نہیں

آیا، جتنی بندگی آپؐ نے کی ہے کسی دوسرے نے اتنی بندگی نہیں کی۔ خداوند قدوس جس وقت ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص کمال بیان کرنا چاہتا ہے تو اس وقت آپؐ کو عبد کے نام سے یاد کرتا ہے، یہ آپؐ کی عبدیت کا کمال ہے۔ اصل میں دیکھیں ایک تو عبد ہوتا ہے مجھ جیسا، میں بھی بندہ ہوں لیکن کمالِ گندہ۔ میں بندہ ہوں لیکن نفس کا بندہ، ایک ہوتا ہے عبد النفس اور ایک ہوتا ہے عبد الرّب۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے انتہائی کمال کے ساتھ عبد الرّب تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت کے انتہائی اوج پر فائز تھے

عبد دیگر عبدہٗ چیز دیگر

ایں سراپا انتظار او منتظر

ترجمہ: بندہ کچھ اور چیز ہے اور اُس کا بندہ کچھ اور چیز ہے۔ یہ تو سراپا انتظار ہے اور اُس کا بندہ وہ ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

عبد ابتداء کی حالت میں طالب ہوتا ہے، وہ راہ پر چلنے والا ہوتا ہے اور جو عبدہٗ ہوتا ہے وہ اُس کا مراد بن جاتا ہے، وہ اُس کا مطلوب بن جاتا ہے، وہ اُس کا محبوب بن جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مرادیت حق کے اس مقام پر تھے کہ جس کے متعلق قرآن نے کہا

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى O (الضحیٰ۔۵)

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تجھے اتنا دے گا کہ تجھے راضی کر دے گا۔

عبدہٗ کے مقام پر جو فائز ہوتا ہے، جو اس کا بندہ ہوتا ہے اس کا خدا خود طالب بن جاتا ہے اور خداوندِ قدوس اس کی آرزوؤں کو پورا کیا کرتا ہے، اس کی

مرادوں کو بر لایا کرتا ہے۔قرآنِ کریم میں کئی واقعات آتے ہیں وقت نہیں ہے کہ میں تفصیل سے بیان کروں۔ایک موقع پر فرمایا

قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ (البقرۃ:۱۴۴)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم تیرے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔

پس کیا ہوگا؟......

فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا (البقرۃ:۱۴۴)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم تجھے اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب انسان عبدیت کے کمال پر آتا ہے تو وہ محبوبیتِ ربّ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم صرف محبوب خدا ہی نہیں تھے بلکہ آپؐ سید المحبوبین تھے۔صرف سید المحبوبین ہی نہیں تھے بلکہ کیا تھے؟......محبوب گر تھے......آپؐ نے خدا کے محبوبوں کو وجود بخشا ہے۔خدا نے خود یوں کہا ہے

اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ (اٰل عمران۔۳۱)

ترجمہ: اگر تم کو خدا سے محبت ہے،تو میری اطاعت کرو،اللہ تم سے محبت کرینگے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو!اے لوگو! جو میری محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور یوں کہتے ہو کہ ہم ایمان لے آئے،تو تم میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کا اتباع کرو، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اپنا محبوب بنا لے گا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں محبوبیتِ حق کی تاثیر ہے، جو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ پر چلے گا وہ خدا کا بن جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ امام الانبیاء اور امام المحبوبین ہیں اور جو امام المحبوبین کا اتباع کرے گا وہ خود محبوب بنتا چلا جائے گا۔ کسی نے اچھا کہا ہے ؎

قہر ہو یا مہر ہو یا کچھ بھی ہو

ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں میں محبوبیت نہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ کس کی اداؤں میں محبوبیت ہے؟ میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت پر تو حیوان اور پتھر تک قربان ہوتے تھے۔ ایک مشہور روایت ہے آپ نے سنا ہوگا کہ جس وقت نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے اونٹوں کو ذبح کر رہے تھے، تریسٹھ اونٹ آپؐ نے اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور اونٹوں کا اور اونٹنیوں کا یہ حال تھا کہ ہر ایک اونٹنی خود آ کے اپنے سر کو پیش کرتی تھی، آگے بڑھتی تھی کہ تیرے ہاتھ میں خنجر ہے تو میری ہی گردن پر کیوں نہ چلے۔ کسی نے کہا ہے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف

بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

ترجمہ: جنگل کے تمام ہرن اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے ہوئے ہیں کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ تو شکار کے لیے آئے گا اور تیرا تیر ہم کو جا لگے گا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا خدا رسا ہے، جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو لے لیا اس نے خدا کو لے لیا، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو چھوڑ دیا تو خدا کی قسم اسے کروڑوں سالوں تک خدا نہیں ملنے کا، ابد الاباد تک نہیں ملنے کا۔ اب خدا تک پہنچنے کی ایک واحد سبیل ہے، ایک واحد راستہ ہے، مرتکز کر دیا گیا، منحصر کر دیا گیا اور وہ کونسا راستہ ہے؟...... وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خیر العابدین ہیں، سب سے بڑھ کر خدا کے بندے ہیں اس بناء پر عبدیت کا کمال نصیب ہوگا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر آکر، خدا کی معرفت میسر آئے گی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر آکر۔ اور میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دوستو! دو چیزوں کو انسان اس عالم میں آکر بھول جاتا ہے خدا کا پہچاننا اور اپنے نفس کا پہچاننا، ان کو حاصل کرنے کا بس ایک طریقہ ہمارے سامنے رہ گیا، خدا کو جاننا چاہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر آجاؤ، اپنے نفس کو جاننا چاہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر آجاؤ۔ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ترجمہ: اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ کیونکہ سارا دین وہی ہیں اگر ان تک نہ پہنچے تو پھر سب کچھ ابولہبی (یعنی باطل ہی باطل) ہے۔

ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے جو معرفت حق کو بھی کھولتا ہے اور انسان کے اپنے فائدہ وضرر کو بھی کھولتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ایسا طریقہ نہیں جو تمھیں جنگل میں لا کر بٹھا دے، ایسا طریقہ نہیں جو چودہ سو سال پہلے تو چالو ہو

سکتا تھا اور آج نہیں ہو سکتا۔ میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمانے سے آگے ہیں، کوئی زمانہ آپؐ کی گردِ پا کو نہیں پا سکتا۔ بیوقوف لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ چودہ سو سال کا عرصہ گزر گیا اب تو زمانہ آگے بڑھ گیا، زمانہ کہاں آگے بڑھا؟ میرے آقا ﷺ کا تو ایک ایک قدم وہاں پہنچا تھا، معراج کی روایات میں آتا ہے کہ جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی وہاں تک براق کا قدم پہنچتا تھا، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ایک ایک قدم وہاں ہے جہاں کہ زمانے والے سوچ بھی نہیں سکتے۔ عبدالرحمان بابا نے کہا ہے

په یو قدم ترعه عرشه پورے رسی

مالیدلے دے رفتار ددرویشانو

جب درویشوں کا ایک ایک قدم عرش تک پہنچ جاتا ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم کہاں تک پہنچتا ہوگا۔ یہ تو دیوانے ہیں جو کہتے ہیں بیسویں صدی ہوگئی۔ او اللہ کے بندو! بیسویں صدی ہوگئی تو کیا کمال ہوگیا، جہالت کا کمال ہے، پہلے ایک دورِ جاہلیت جاہلیت اولیٰ تھا اب جاہلیت ثانیہ آگیا۔ وہی بے حیائی، وہی بے سری، وہی خدا سے غفلت، جو پہلے دورِ جاہلیت میں تھا وہی آج کی جاہلیت میں بھی ہے۔ اس وقت دنیا میں انسان کے سامنے دو چیزیں آگئیں اور دو چیزوں کی تلاش میں ہے اور دل کی دو چیزوں سے غافل ہوگیا، اس وقت انسان نہ تو خدا کو تلاش کرتا ہے اور نہ اپنے نفس کو تلاش کرتا ہے، انسان اپنی حقیقت کی تلاش نہیں کرتا، اس زمانے میں انسان خدا کا متلاشی نہیں ہے، اپنی حقیقت کا متلاشی نہیں ہے، اپنی روح کا جاننے والا نہیں ہے، اس زمانے میں یہ دونوں چیزیں بالکل گم ہوگئیں، دل مر گئے، روحیں ختم ہو

گئیں، روحانیت کا جنازہ نکل گیا، یہ زمانہ روح کی پرورش کا زمانہ نہیں یہ زمانہ دل کی زندگی کا زمانہ نہیں، یہ خدا تک پہنچنے کا زمانہ نہیں۔ اقبال نے یورپ کے متعلق کہا ہے کہ ان کے سامنے نہ خدا ہے، نہ رسول، نہ حقیقتِ آخرت، کچھ بھی نہیں ہے، ان کے سامنے فقط دو چیزیں ہیں ایک اپنا بطن اور ایک نفس۔ اشیائے دنیوی، آسمان و زمین کے دائرے کے اندر کائنات میں جو کچھ بکھرا ہوا ہے اس کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ پیٹ بھر جائے ...... اور بس۔ نفسانی تقاضے پورے ہوں ...... تمام محنت اس کے لیے ہے۔ چاند تک پہنچتے ہیں، سورج تک جاتے ہیں، ستاروں کو لیتے ہیں، چیزیں بناتے ہیں، بہت کچھ کرتے ہیں لیکن ان سب کا حاصل کیا ہے؟ ...... ایک لفظ میں ہم یوں کہیں گے کہ ہماری دنیاوی زندگی بن جائے۔ اور یہ دنیاوی زندگی ہے کتنی بڑی؟ ...... نہ کل کی خبر نہ پل کی خبر، نہ بچپن والا جانے نہ پچپن والا جانے، نہ بچہ جانتا ہے نہ بڑا جانتا ہے، مجھے پتہ نہیں کہ میں زندگی کی حالت میں یہاں سے اٹھوں گا یا نہیں، کوئی کہہ سکتا ہے آپ میں سے؟ پوری کی پوری زندگی آناً فاناً ایسے ختم ہو جاتی ہے کہ اس کا پتہ نہیں ہوتا ساری دوڑ دھوپ ستاروں تک اور سورج تک اور چاند تک صرف اس زندگی کو بنانے کے لیے ہے جس کے ایک پل کی خبر نہیں۔ اس زمانے کا ایک بہت بڑا دجال اور اس زمانے کا ایک بہت بڑا شیطان کنیڈی نام سنا ہوگا آپ نے، لوگ تو بڑی تعظیم کرتے ہیں ہمارے لیے یہ اَئمۃ الکفر ہیں، یہ کفر کے امام ہیں جو کہ کفر کی طرف دعوت دیتے ہیں، ہمارے واسطے ہماری نگاہ میں خدا کی قسم ان کی قدر ایک مچھر کے پر کے برابر نہیں، چاہے وہ خروشیف ہو یا جانسن ہو یا روس کا کوسیگن ہو یا اور کوئی بلا ہو۔ جس کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ آگیا وہ ان گدھوں کو نہیں

دیکھے گا، جس کے سامنے سورج آ جائے وہ بجھی ہوئی شمع کی طرف کیا نگاہ کرے گا۔
جس کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ ہوگا، نمونہ ہوگا، دین ہوگا، اس کے سامنے
یہ شیاطین کچھ بھی نہیں۔ میں تو یوں کہوں بلاتشبیہ عرض کرتا ہوں بفرضِ محال اگر حضور
انور سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت یہاں آ جائیں اور منبر پر کھڑے
ہو جائیں اور ایک طرف جانسن کھڑا ہو امریکہ والے کھڑے ہوں اور ایک طرف
یورپ والے کھڑے ہوں اور ایک طرف ہمارے اس زمانے کے ڈاکٹر فضل الرحمٰن
اور پرویز کھڑے ہوں جو کہ دین کو بدلتے چلے جا رہے ہیں، ایک آواز دے کہ آؤ
میری طرف میں تمھیں جہنم تک پہنچاتا ہوں، وہ تو کہیں گے جنت تک پہنچاتا ہوں، ہم
کہیں گے جہنم تک پہنچاتے ہیں، دوسرا کہے میری طرف آؤ، اب سب طرف سے
آوازیں آ رہی ہوں، اور ایک طرف آقائے رُسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما
رہے ہیں

هَلُمُّو اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ، هَلُمُّوْ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ

ترجمہ: اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ، اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔

تم یہ سچ سچ بتاؤ کہ تم میں سے کوئی ایک پل کے لیے بھی سوچے گا کہ کسی
دوسری طرف جائے۔ پروانوں کی طرح حضور ﷺ کے قدموں پر آ کے گرو گے یا
نہیں گرو گے؟ میری مثال سمجھے یا نہیں سمجھے۔ میں نے کہا کہ اگر یورپ ایک
دروازے پر کھڑا ہے، امریکہ دوسرے دروازے پر ہے، روس تیسرے دروازے پر
اور دنیا کے یہ تمام نظام اور دنیا کے تمام پروفیسر اور ڈاکٹر جو کہ دین میں تحریف کر کر
کے سامنے آ رہے ہیں یہ سب ایک دروازے پر کھڑے ہوں اور ہر ایک بلاتا ہو کہ

ادھر آؤ تمہاری کامیابی اس میں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط** فلاح کی طرف آؤ فلاح کی طرف آؤ، میری طرف آؤ میری طرف آؤ، تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک لمحے کے لیے بھی آپ سوچیں گے کہ اِس خبیث کی طرف چلے جائیں یا اُس کی طرف چلے جائیں۔ مجھے بتاؤ، کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے تو خدا کی قسم وہم تک بھی نہیں لائے گا کہ ان کی آواز بھی سن لے...... محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی جائے گا۔ جائے گا یا نہیں جائے گا؟ ......تو آج کیا بات ہے؟ ذرا سوچو ایک منٹ کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی پکار ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں کوئی فرق آ گیا؟ ...... جو قرآن آپ ﷺ نے دیا تھا وہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں نے ابھی ہمارے سامنے پڑھا، اور بڑے قاری صاحب نے پڑھا، یہ وہی قرآن ہے جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا یا دوسرا قرآن ہے؟ ...... وہی قرآن ہے، وہی اس کی دعوت ہے...... اور یہ جو ہمارے مولوی صاحبان احادیث کی دعوت دیتے ہیں اور آپ کو مسائل بتاتے ہیں، یہ وہی حدیثیں ہیں جو نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائیں یا دوسری ہیں؟ ...... یقیناً وہی ہیں ...... جب یہ وہی ہیں تو کیا بات ہے؟ ...... اب دیکھو سپیکر سے میری بات کسی کے کان تک پہنچتی ہے اور میں وہاں دکھائی نہیں دیتا تو وہ شخص کہے کہ بھئی یہ تو میں لاؤڈ سپیکر کی آواز سُن رہا ہوں، اشرفؔ کی آواز نہیں ہے۔ تو کہیں گے ارے پگلے! یہ تو ڈبہ ہے اور ڈبے کی کیا حقیقت ہے آواز تو پیچھے سے کسی اور کی آرہی ہے۔ اسی طور پر آج جو عالم، صحیح عالمِ ربّانی کے متعلق کہہ رہا ہوں، وہ عالم نہیں جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اور ان کو

خریدنے کے لیے آج کل بڑی بڑی دکانیں لگی ہیں۔ ایسے خریدتے ہیں کسی کو نالیاں صاف کرنے کے لیے خرید رہے ہیں، کسی کو ایجنسی لگوانے کے لیے خرید رہے ہیں، کسی کو مرغیاں پالنے کے لیے خرید رہے ہیں۔ وہ عالم جو کہ امام ہوا کرتے تھے، مسجد کا سنبھالنے والا، مسجد تو خدا کا گھر ہے، جس نے خدا کے گھر کو سنبھالا اس نے پورے عالم کو سنبھالا۔ پتہ نہیں آجکل عقلیں مسخ کیسے ہوگئیں۔ حجاج بن یوسف امت کا ظالم ترین شخص کہلاتا ہے، سب سے زیادہ ظالم شخص تھا، لیکن وہ اپنے حکام کو خط میں اس طرح لکھتا ہے کہ دیکھو نمازوں کو اچھی طرح سنبھالنا، تم میں سے جو نمازوں کا ضائع کرنے والا ہوگا وہ مملکت کے معاملات کو نہیں سنبھال سکے گا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج ہمارے لیے نجات کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے، ہم اگر خدا کو پانا چاہتے ہیں، عبدیت کے مقام پر آنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ کونسا؟...... سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ۔ آپ کہیں گے ہم تو یہ سب پہلے دن سے جانتے ہیں، تم نے آکر کونسی نئی بات سنا دی، اتنی دور سے چل چلا کر آیا اور اتنی سی بات کہہ دی، یہ کونسی نئی بات ہے؟...... ہائے دوستو! ہوتی تو پرانی بات ہے لیکن پرانی بات جب تک کہ دل کو لگے نہیں، تب تک دل کی لگی لگی نہیں ہوتی دل لگی ہوتی ہے۔ یہ اردو کا محاورہ ہے، دل لگی اردو میں مذاق کو کہتے ہیں اور دل کی لگی اسے کہتے ہیں کہ دل میں کوئی چیز لگ جائے، زخم پڑ جائے۔

لگی ہو نہ جب تک کسی دل میں آگ
پرائی لگی دل لگی سوجھتی ہے

جب تک کسی کے دل میں آگ نہ لگے تو دوسرے کی لگی کو کہتے ہیں کہ یہ مذاق کی بات ہے۔ پشتو میں کہتے ہیں زرے حقعہ پوہیگی چر تہ چہ اور پلیگی یعنی جہاں آگ جلتی ہے جلن کا اس کو پتہ چلتا ہے۔ جب تک کہ، دل میں آگ لگے گی نہیں تو بات بنے گی نہیں۔

تو ہم جانتے ہیں، ہم مانتے بھی ہیں لیکن بات اندر جا کر دل کو نہیں لگی۔ دل کو لگ جائے کہ میری نجات اسی میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر یا باطن کے لحاظ سے جو حکم بھی دیا ہے میری جان چلی جائے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو نہیں چھوڑوں گا۔ صحابہ کا کمال کیا ہے؟...... صحابہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آگ میں اور جلتے ہوئے تیلوں میں ڈال دیے گئے لیکن انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو نہیں چھوڑا۔ ہر حال میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اپنایا۔

آخری بات کہتا ہوں اور اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ دوستو! حضور نبی کریم سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم معرفت حق اور عبدیت کا جو نسخہ لے کر آئے وہ نسخہ اگر نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات تک رکھتے اور اپنے صحابہ کو نہ بتلاتے تو کیا وہ صحابی بن جاتے؟ دین والے بن جاتے؟ ایمان والے بن جاتے؟ آپؐ نے یہ نسخہ تقسیم کیا، تو کیا میری طرح لاؤڈ سپیکر میں آ کر بیان کیا؟ بلکہ لوگوں تک پہنچے، ابوجہل کے پاس گئے، ابولہب کے پاس گئے اور پتہ نہیں کس کس کے پاس گئے، کہیں پتھر کھائے، کہیں گالیاں دی گئیں، کہیں چوٹیں کھائیں پتہ نہیں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں میرے آقا نے جس نے کہ خود فرمایا کہ میں اللہ کے راستے میں ایسے اذیتیں

دیا گیا ہوں کہ کسی اور کو ایسے اذیت نہیں دی گئی۔ سب سے زیادہ مشقتیں اٹھائیں، دل گھلتا تھا، جلتا تھا، دکھتا تھا۔ قرآن کہتا ہے، قرآن کو پڑھتے ہو لیکن اس کا حق نہیں ادا کرتے، قرآن آئے اور زندگی کو نہ بدل دے، آگ لگے اور جلائے نہیں وہ کونسی آگ ہے جو کہ لگ جائے اور جلائے نہیں، آگ تو وہ ہے کہ جو جہاں لگ جائے تو بھسم کر کے رکھ دے۔ قرآن آئے اور زندگیوں کے نقشوں کو نہ پلٹے، قرآن کو پڑھ لیں اور زندگی نہ بدلے، سنت کو پڑھ لیں اور سنت ہمارے اندر نہ آئے، طریقۂ محمدیہ کو ہم دیکھیں اور وہ طریقہ ہم کو اپیل نہ کرے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا دوستو! کہ میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن نے بار بار کہا

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ○ (الشعراء:۳)

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس افسوس میں جان دے دو گے کہ یہ لوگ اس بات کو دل سے نہیں مانتے۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (الکھف:٦)

ترجمہ: (اور آپ جو ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) سو شاید آپؐ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

کہیں کیا کہا گیا، کہیں کیا کہا گیا۔ قرآن میں بار بار دیکھو تو یہی ملے گا کہ اللہ میاں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج پر رحم آتا ہے۔ بار بار آتا ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ (النحل:۱۲۷) اتنا غم نہ کھا، کیوں غم کھا کھا کر اور گھل گھل کر جان دیتا ہے، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جان چلی جائے گی۔ آپؐ کیوں ان کفار کے لیے روتے تھے،

کیوں اتنا گھلتے تھے؟ لیکن دوستو! مجھے بتاؤ تو سہی ایک شخص ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں آگ جل رہی ہے اور ایک چھوٹا سا بچہ اٹھتا ہے اور اس آگ میں جا کر چھلانگ لگاتا ہے، اگر میں اتنی موٹی موٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتے ہوئے نہ روکوں تو کیا میں ظلم نہیں کر رہا۔



یوم نزول قرآن

(جمعہ ۱۸ صفر ۱۳۸۸ ہجری)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ!

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ o وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ط وَهُوَالْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ o ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ o اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی حَبِیْبِکَ وَرَسُوْلِکَ مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ مُزَکِّی الْکَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الْکِرَامِ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میرے بزرگو، عزیزو اور دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا فرما کر اس کائنات میں جیسے ایک ظاہری نظام کو قائم فرمایا اسی طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے باطنی نظام کو قائم فرمایا، اس باطنی نظام کا نام ہم نظامِ ھدایت رکھ سکتے ہیں۔ جسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا فرمایا یہ دنیا جو ہمیں دکھائی دیتی ہے اور یہ لیل ونہار اور یہ شب و روز اور دنیا کی گردشیں اور دنیا کی یہ ظاہری مادی ترقیات، ان سب کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ یہ دنیا مادی لحاظ سے ترقیات میں آگے سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا

مقصد اس دنیا کے قائم کرنے سے یہ نہیں تھا کہ صرف ظواہر کے لحاظ سے ترقی کی جائے اور دنیا والے مادہ پرستی میں اور ظاہرداری میں اور دنیا کے نقشوں کو چمکانے میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عالم کو خاص وجوہ کے تحت پیدا کیا اور ان وجوہ میں سب سے بڑی وجہ اور اس عالم کو پیدا کرنے کا مقصد انسان کی پیدائش ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ انسان آئے اور اس دنیا کو استعمال کرے اور اس دنیا کی چیزوں سے انتفاع کرے، فائدہ اٹھائے اور چند دن اس دنیا میں گزارے اور یہاں سے چلتا بنے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حاشا وکلا عالم کو اس لیے قطعاً پیدا نہیں فرمایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بار بار قرآن کریم میں مختلف انداز سے ایک خاص چیز کو کھولا اور بیان فرمایا اور وہ بات یہ تھی کہ ہم نے اس عالم کو جو قائم فرمایا وہ اس لیے قائم فرمایا ہے

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاط (الملک۔۲)

ترجمہ: جس نے بنایا مرنا اور جینا تا کہ تم کو جانچے کون تم میں سے کرتا ہے اچھا کام۔

اور اسی مقصود کو دوسرے رخ پر یوں بیان فرمایا گیا

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ O (الذاریات۔۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو۔

ہم نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو سوائے اس چیز کے کہ وہ ہماری بندگی کے نقشوں کو قائم کریں، ہماری بندگی کے طریقوں کو اختیار کریں، اور ہمارے بندے بن کر رہیں۔ بندگی کیا ہے؟ بندگی کے طریقے کیا ہیں اور انسان خدا کا بندہ بن

کرکس طور سے زندگی گزار سکتا ہے اسی کو ھدایت کہتے ہیں اور یہ ھدایت خدا کی طرف سے آتی ہے۔اسی بناء پر جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے باپ سیدنا آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوۃ والسلام کو پیدا فرمایا اور جس وقت کہ دنیا میں بھیجا جارہا تھا اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کہہ دیا تھا

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ:۳۸)

ترجمہ: دیکھوتمہارے پاس ہماری طرف سے کوئی ھدایت آ پہنچی تو جو شخص ھدایت کا اتباع کرے گا اسے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا۔

ایک مقام پرنہیں قرآن کریم نے مختلف انداز سے تین مقام پر پہلے سورۂ بقرہ میں پھر سورۂ اعراف میں اور پھر آخر میں سورۂ طٰہٰ میں اسی مفہوم کومختلف صورتوں میں بیان فرمایا ہے اور مدعا یہ تھا کہ ہم نے دنیا کے جھمیلے کو اس لیے پیدا نہیں کر دیا کہ یہ دنیا اسی طور پر قائم رہے گی اور آتی جاتی جو زندگی ہے اسے تم اپنے مقاصد اور اپنے نظریات کے مطابق گزارتے چلے جاؤ گے بلکہ تمھیں بھیجا گیا ہے اور تم پر پابندی لگا دی گئی ہے

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ:۳۸)

ترجمہ: پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ھدایت سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ھدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

کہ جب کبھی بھی تمہارے پاس ہماری طرف سے ھدایت آئے تم میں سے جوشخص اس ھدایت کا اتباع کرنے والا بنے گا اس کو نہ تو کوئی غم ہوگا اور نہ کوئی خوف ہوگا۔ نہ تو اس دنیا میں اس کی زندگی خراب ہوگی اور نہ آخرت میں اس کی زندگی خراب ہوگی۔ اب یہ ھدایت اس طور پر آتی تھی کہ اس ھدایت کے لانے والے انبیاء علیھم السلام ہوتے تھے اور ان کی زندگیاں ھدایت کا نمونہ ہوتی تھیں اور وہ جس پیغام کو لے کر آتے تھے وہ پیغام ھدایت ہوتا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے وعدے کے تحت ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، ہر علاقے میں انبیاء کو بھیجا، رسولوں کو بھیجا۔ قرآن مختلف انداز سے فرماتا ہے

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ο (الرعد:۷)

ترجمہ: اور ہر قوم کے لیے ہادی ہوتے چلے آئے ہیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلٌ (یونس:۴۷)

ترجمہ: اور ہر ہر امت کے لیے ایک حکم پہنچانے والا (ہوا) ہے۔

مختلف نوعیّتوں سے اللہ نے اس بات کو واضح فرمایا کہ ہر امت کے لیے ہم نے ھدایت دینے والا بھیجا، ہر امت کے لیے ہم نے رسول بھیجا اور ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی نبی آیا۔ یہاں تک کہ جب انسانیت شباب تک پہنچی، انسانیت پوری کی پوری ایک گھرانے کی صورت میں آگئی، آج سے تقریباً چودہ سو سال بیشتر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُسے بھیجا جو آنے ہی کے لیے آیا تھا اور جو پیغام لایا وہ جانے کے لیے نہیں تھا، دائمی تھا، ابدی تھا اور جس کی ھدایات، جس کے انوار اور جس کے کمالات ہر زمانے کے لیے ساری وجاری، قائم ودائم تھے۔ وہ پیغام قرآن کریم کا پیغام تھا اور

وہ لانے والے ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔ اس سے پہلے جتنے بھی پیغام آئے وہ پیغام رہنے کے لیے نہیں تھے، اس بناء پر آج ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ دنیا کی کسی قوم میں، دنیا کے کسی ملک میں ایسا پیغام نہیں جس کے ماننے والے یہ دعوے سے کہہ سکیں کہ یہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے۔ وہ چار کتابیں جن کو ہم بھی خدا کی طرف سے کتاب الٰہی مانتے ہیں یعنی تورات، زبور، انجیل ان کو آپ اٹھا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ان تمام کی تمام میں اس طور پر الٹ پھیر کر دیا گیا ہے اور اس طور پر تحریفات کر دی گئی ہیں کہ ہر نیا ایڈیشن اپنے پرانے ایڈیشن کی مخالفت کرتا ہوتا ہے۔ اگر آج سے پچاس سال پہلے کی بائبل کو آپ پڑھیں تو اس کے الفاظ الگ ہوں گے اور جو بعد کی بائبل چھپی ہے اس کے الفاظ الگ ہوں گے۔ میرے اپنے مطالعے میں بائبل کے کئی تراجم انگلش کے بھی اور اردو کے بھی اور عربی کے بھی رہے لیکن اندازہ یوں ہے کہ ہر دس پانچ سال کے بعد ان میں کچھ نہ کچھ فرق آجاتا ہے۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کی جو بائبل کا انگلش کا ایڈیشن تھا اس کے بعد جو ایڈیشن نکلا ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس بات کو آپ جانے دیجئے کہ کیا تحریفات ہوتی ہیں، کیا بدلتے ہیں، کس نوعیت سے وہ تحریفات کرتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ آج دنیا میں کوئی شخص وہ چاہے امریکہ کا ہو، چاہے یورپ کا ہو چاہے وہ اس وقت کا پوپ ہی ہو کوئی بھی دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی وہ کما حقہ آج موجود ہے۔ یہاں تک کہ آپ ایک لطیفے کے طور پر اس بات کو سنیں گے اور محسوس کریں گے کہ یہ چار اناجیل جنھیں آج بہت عزت والی چیز سمجھتے ہیں ان کی

نوعیت یہ ہے کہ چاروں انجیلیں ایسی نہیں تھیں کہ ایک زمانے میں یہ چار ہی انجیلیں ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مختلف اناجیل وجود میں آچکی تھیں ہر ایک نے اپنا ورژن دینا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ سینکڑوں کی تعداد میں اناجیل اکٹھی ہوگئیں اور قسطنطین (Castentine) کے زمانے میں تقریباً حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تین سو سال بعد دنیا کے پادری اکٹھے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ یہ جو انجیلیں ہیں یہ سب ایک جگہ پر اکٹھی کر دی جائیں جو ان میں سے حق ہوں گی وہ (Altar) قربان گاہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ چار اناجیل تھیں جو آج انجیل کہی جاتی ہیں۔اب یہ چار انجیلیں جو تھیں وہ اس نوعیت سے چنی گئیں۔اب اگر ان کی صرف الحمد کو ہی دیکھ لیا جائے، چاروں انجیلوں کے پہلے باب (Chapter) کو ہی دیکھ لیا جائے تو ایک دوسرے سے نہیں ملتا، قطعاً نہیں ملتا، بچہ بھی اٹھا کر دیکھ لے تو جو یوحنا کی انجیل ہے وہ متیٰ سے علیحدہ ہے اور جو متیٰ کے مطابق ہے وہ مرقس سے علیحدہ ہے اور جو مرقس کے مطابق ہے وہ ان کی چوتھی انجیل لوقا کے خلاف آتی ہے۔اسی طور پر ایک نئی انجیل دریافت ہوئی برنباسؑ انجیل، وہ ان تمام اناجیل سے علیحدہ ہے۔قرآن کریم کے متعلق میں عرض کر رہا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جو کہ ہمیشہ کے لیے آئی۔اب یہ دلیل ہے اس چیز کی کہ اگر اناجیل باقی رہنے کے لیے ہوتیں تو ان میں ترمیم کیوں ہوتی۔اسی طور اگر آپ تورات کو دیکھیں، تورات کی پہلی کتاب کتاب پیدائش کو جس وقت آپ دیکھتے ہیں تو کتاب پیدائش اس رخ کی نہیں ہے جیسے خدا کی طرف سے کوئی بات آرہی ہو بلکہ ایک تاریخ ہے اور تاریخ کے طور پر ایک چیز پیدا ہوتی ہے، اسی طور پر اگر آپ زبور کو لیں تو زبور کے وہ نقشے نہیں ہیں،

حزقیل کے صحیفے کو لیں ، بائبل کے جتنے بھی صحیفے ہیں ہم دعوے سے کہتے ہیں اور ہم اس چیز کو چیلنج کرتے ہیں تمام دنیا کے عیسائیوں کو اور یہود کو کہ وہ ہمیں بتا دیں کہ ان میں سے کونسی بات حق ہے اور کونسی بات باطل ہے۔ یہاں تک کہ آج انگریزوں میں یعنی عیسائیوں میں خود یہ بحث چل پڑی ہے کہ انجیل تو علیٰحدہ بات ہے آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی بھی دنیا میں موجود تھی یا نہیں تھی۔

بہرحال یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ وہ چیزیں تھیں جو کہ آئیں اور جانے کے لیے آئیں لیکن ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لیے آئے ، آنے کے لیے آئے اور آپؐ کی ذات گرامی جس قرآن کو لے کر آئی آج بھی خالصتاً وہی قرآن ہے اور دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مخالف بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کریم کا کوئی شوشہ، کوئی حرف ، کوئی لفظ بدلا جا سکا یا اس میں کوئی تحریف ہو سکی ۔ ۱۹۱۴ء میں نبنا نا ایک مستشرق تھا اس نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں میں ایک چیز اٹھا دی جائے کیونکہ یورپ یہ چاہتا ہے کہ جیسے احادیث میں اس نے چکر چلایا اسی طور پر وہ چاہتا ہے کہ قرآن کے متعلق کوئی چکر چلائے ، انھوں نے ایک چیز چلائی کہ قرآنِ کریم کا ایک نیا صحیفہ ملا ہے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیفہ ہے لہٰذا اس میں شک پایا جاتا ہے۔ ہمارے اس زمانے کے علماء نے جب بات کو سنا اور اس کو چیلنج کیا تو خود اسے اعتراف کرنا پڑا کہ یہ میرا فریب اور دجل تھا کوئی نیا صحیفہ نہیں ملا۔ دیکھو قرآن کریم کی حقانیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ وہ صحیفۂ قرآنی جو کہ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود لکھوایا تھا اور جس قرآن کے صحیفے کے اوپر سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون گرا تھا آج تک ہماری تاریخ کی

کتابوں میں آتا ہے کہ جس وقت وہ شہید ہو کر گرے ہیں ان کی زبان پر قرآن کے جو لفظ تھے آگے قرآن کھلا ہوا تھا وہ پڑھ رہے تھے

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ (البقرہ:۱۳۷)

ترجمہ: سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ، اور وہی ہے سنتا جانتا۔

اب قرآن کریم کے جس صفحے پر خون کے قطرے گرے ہیں آج بھی وہ صفحہ اسی طور پر موجود ہے، پہلے لینن گراڈ کی لائبریری میں تھا آجکل ماسکو کی لائبریری میں ہے اور پیرس کے ہمارے ایک مسلمان بہت بڑے عالم ہیں علامہ حمید اللہ صاحب جو کہ پیرس میں انٹرنیشنل لاء کے چیئرمین بھی ہیں، انھوں نے استفسار کیا اور کیمیائی نکتۂ نظر سے ان لوگوں نے تصدیق کی کہ یہ خون انسانی ہے۔ اس نسخے میں اور آج کے قرآن میں ایک نقطے کے برابر بھی فرق نہیں۔ بہرحال ہم مسلمانوں کا تو یہ یقین اور ایمان ہے کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ○ (الحجر:۱۵،۹)

ترجمہ: اس نصیحت نامے کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

ہم نے قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے حفاظت کرنے والے ہیں، اس کے نہ تو کوئی معنی میں فرق کر سکے گا نہ اس کے ظاہر میں فرق آئے گا نہ اس کے باطن میں فرق آئے گا اور نہ اس کے الفاظ میں کوئی فرق ہوگا۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا اس امت پر ایک خاص احسان تھا کہ جس وقت کہ قرآن آیا تو قرآن کی حفاظت کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف صورتیں پیدا فرمائیں۔ آج آپ دنیا کی کسی قوم کو کہہ دیجئے، آج ہمیں دنیا میں ''وید'' کا کوئی حافظ نہیں ملے گا، اور ''وید'' کی

زبان آج کونسی دنیا میں موجود ہے؟ آج ہم کہیں گے کہ پچھلی قومیں جو کہ اپنے مذاہب کی کتابوں کو پیش کرتی ہیں، ان کے مذاہب کی کتابیں دنیا میں اصلی طور پر کونسی موجود ہیں؟ سب سے آخر میں انجیل آئی اور انجیل کے متعلق خود عیسائی علماء میں اختلاف ہے کہ آیا یہ آرامی زبان میں اتری یا عبرانی زبان میں تھی یا سریانی میں تھی۔ یعنی زبان کے متعلق اتنا اختلاف ہے اور جو کہ آخری نسخہ جس سے کہ دنیا کی موجودہ اناجیل کے تراجم کیے گئے یہ Greece کا نسخہ ہے، یونانیوں کا نسخہ ہے، اور یونانی زبان میں جو انجیل ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار سو سال بعد کا ترجمہ ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ ایک وہ کتاب جو کہ چار سو سال کے بعد ترجمے سے در ترجمہ ہو کر پہنچی ہے اس میں کتنی زیادہ تبدیلیاں ہوں گی، کتنے زیادہ فرق ہوں گے۔ ہمارا تو یہ دعویٰ ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر تمام جن وانس اور پوری کی پوری مخلوق اکٹھی ہو جائے تو قرآن کریم کے مماثل کوئی کتاب نہیں لا سکتے۔ اور دوسری جگہ پر فرمایا اگر چاہو تو تم پہلے پچھلے اکٹھے ہو جاؤ تو قرآن کریم کے مطابق ایک سورت نہیں بنا سکتے، ایک آیت نہیں لا سکتے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ قرآن کریم وہی قرآن ہے جو کہ عربی میں قرآن ہے، قرآن کے ترجمے کو آپ قرآن نہیں کہہ سکتے کیونکہ قرآن نے خود اپنی صفت فرمائی ہے

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ O (یوسف:۲)

ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھو۔

اب اس قاعدے کے مطابق یہ قرآن کی صفت واقع ہوئی ہے اور یہ صفت ایسی ہے جو قرآن سے جدا نہیں ہو گی، قرآن وہی ہو گا جو عربی میں ہو گا، جو عربی

میں نہیں ہوگا وہ غیر قرآن ہوگا وہ ترجمۂ قرآن ہوگا، وہ تفسیرِ قرآن ہوگا، وہ مفہومِ قرآن ہوگا، وہ عینِ قرآن نہیں ہوگا۔ عین قرآن وہی ہے جو کہ عربی میں ہے۔ اگر اس لحاظ سے آپ لیجئے تو جہاں قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کے مماثل کوئی کتاب لا نہیں سکتا اسی طور پر ہم یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا کما حقہ ترجمہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ قرآن کی ایک ہی آیت کا ویسا ترجمہ کر کے دکھا دے جو کہ قرآن کا حق ہے۔ قرآن میں جو بلاغت ہے، قرآن میں جو اعجاز ہے، قرآن کی جو گہرائی ہے، قرآن کے جو علوم عرفانیہ ہیں، قرآن کے جو حقائق ہیں وہ کون لائے گا کہاں سے لائے گا؟ وہی لا سکے جو کہ خدا کی زبان کو اپنے منہ میں ڈالے اور اس بات کو کہہ دے۔ اسی بناء پر دوستو! قرآن کریم کے جتنے بھی تراجم ہیں ہم انھیں ترجمۂ قرآن کہہ سکتے ہیں انھیں قرآن نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء یہ کہتے ہیں کہ دیکھو قرآن کریم کو اگر شائع کرو تو صرف ترجمے کو شائع نہ کرنا وہ ترجمۂ قرآن ہوگا وہ قرآن نہیں ہوگا، ساتھ متنِ قرآن کو رکھنا کیونکہ اگر قرآن کہتے ہو تو قرآن ساتھ ہونا چاہئے۔ آج بھی آپ دیکھئے اردو میں اس وقت قرآن کریم کے چار پانچ تراجم ہیں جو کہ مستند تراجم ہیں حضرت تھانویؒ کا ترجمہ ہے، حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ ہے، پہلے تراجم میں شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کا ترجمہ ہے، شاہ عبدالعزیزؒ کا ترجمہ ہے، پچھلے دور میں عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ ہے، اب ان سب تراجم کو سامنے رکھو تو ان تراجم میں کچھ نہ کچھ فرق پایا جاتا ہے، گو کہ یہ فرق لفظی ہے اور مفہوم اور مطلب پر سب متفق ہیں۔ اسی طور پر انگریزی کے تراجم کو لیجئے اس وقت ہمارے نزدیک انگریزی میں تین ترجمے ہیں جو کہ مستند تراجم ہیں ایک علامہ عبداللہ یوسف کا ترجمہ

ہے دوسرا عبدلماجد دریا بادی کا ترجمہ ہے اور تیسرا مارماڈیوک پکتھال کا ترجمہ ہے۔ باقی جو عیسائیوں کے ترجمے ہیں ان کی طرف ہم نگاہ نہیں ڈالتے، وہ سب کے سب اس میں اپنی خباثت ظاہر کرنے کی اور ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم تو یوں کہیں گے کہ بھئی ان کا قرآن کا علم صفر کی حد تک پہنچا ہوا ہے اگر وہ قرآن کو جانتے تو کافر نہ ہوتے۔ قرآن ایمان دیتا ہے، جس کے پاس ایمان نہیں پہنچا تو اس نے قرآن سے کچھ نہیں لیا۔ اسی طور پر فرنچ میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ترجمہ ہے اور اسی طور مختلف تراجم ہیں اگر ان ترجموں کو آپ سامنے رکھ کر دیکھیں مختلف تراجم میں آپ مختلف نوعیتیں پائیں گے۔ اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ دوستو! یہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے، خداوند قدوس نے اس قرآن میں جیسے میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا معجزہ دیا ہے جو کہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور اس معجزے کی بناء پر میں یوں کہتا ہوں کہ میرے متبعین آخرت میں سب سے زیادہ ہوں گے۔ وہ کونسا معجزہ ہے؟...... وہی معجزہ جسے قرآن کا معجزہ کہا گیا...... اور جس کے متعلق نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ﴿لَاتَنقَضِی عَجَائِبُهُ﴾ اس کے عجائبات کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے۔ قرآن کو جتنا پڑھتے چلے جایئے وہ پرانا نہیں ہوتا، نیا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی برکات، اس کے انوارات، اس کی تجلیات، اس کی خوبیاں اور اس کے معانی ہر اس شخص پر کھلتے چلے جائیں گے جو قرآن میں ڈوبتا چلا جائے گا۔ قرآن کو لینے کے لیے دو چیزوں کی شرط ہے ایک ایمان اور دوسرا تقویٰ۔ قرآن اسی کو ملے گا جو ایمان ویقین والا ہوگا، قرآن اسی پر کھلے گا جس کا تقویٰ زیادہ ہوگا جس طور پر کہ قرآن کے ظاہر کے متعلق

اللہ تعالیٰ نے فرما دیا

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ O (الواقعہ:۷۹)

ترجمہ: اسے پاک لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں چھو سکتا۔

اسی طور پر اس کے معانی تک جو پاک باطن ہوتے ہیں ان کے سوا کوئی دوسرا رسائی نہیں پا سکتا۔ قرآن کو لینے کے لیے پہلی شرط ایمان و تقویٰ کی ہے۔ اس لحاظ سے اگر قرآن سے ہم مستفید ہونا چاہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان دو شرائط کو پورا کرنا ہوگا۔ ایمان کیا ہے؟...... خداوند قدوس کی ان تمام باتوں پر یقین پیدا کر لینا جو قرآن نے ہمیں بتائیں کہ ان کو مان لو اور ان تمام چیزوں سے بچ جانا جن کے متعلق قرآن نے کہا کہ تم ان سے بچ جاؤ، اور اپنی زندگی کو قرآن کے مطالبے کے مطابق ڈھال لینا، اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ دل قرآن والا ہو جائے۔ سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق کیا تھا؟ فرمایا کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ (مسند احمد) یعنی آپ ﷺ کا خُلق سراپا قرآن تھا۔ اب قرآن کو ایک طرف دیکھتے چلے جاؤ الحمد سے لیکر والناس تک، ایک ایک سورت کو پڑھتے چلے جاؤ، ایک ایک آیت کو دیکھتے چلے جاؤ، ایک ایک شوشے کو دیکھتے چلے جاؤ، جو قرآن میں تمھیں الفاظ کی صورت میں نظر آئے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں عمل کی صورت میں نظر آئے گا۔ سینۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معانیٔ قرآن کا حامل ہے اور آپ ؐ کی ذات اعمال قرآنی کی حامل ہے، یا یوں کہیئے کہ قرآن کریم نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی پر اترا، قرآن نے خود کہا

قَدْ جَآئَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ O (المائدہ:۱۵)

ترجمہ: تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح (یعنی قرآن مجید)۔

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی اور ایک نور آیا۔ کتاب جو تھی وہ کتاب اللہ تھی اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ھدایت والا رخ تھا وہ نورانیت کا حامل تھا، وہ قرآن کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا، قرآن کو اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ یہ قرآن اس معنی میں نہیں آتا تھا کہ صرف الفاظ قرآنیہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو جاتے ہوں، بلکہ قرآن آتا تھا اور قرآن اترتا تھا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں الفاظ کے ساتھ اس کے انوارات مرتب ہوتے تھے اور اس کی حقیقت وجود میں آتی تھی اور پھر وہی انوارات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رگ رگ میں سرایت کرتے تھے۔ میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کروں کہ دیکھئے یوں مثال کے طور پر سمجھئے ایک خالص سونا ہے، زر خالص ہے اسے آپ ایک مشین میں ڈال دیتے ہیں اور مشین میں جا کر وہ بالکل پگھل جاتا ہے اور پھر وہاں ایک مرکزی برتن (Pot) ہے اور اس مرکزی Pot سے نکل کر مختلف چینلز Channels سے مختلف سمتوں میں جاتا ہے اور مختلف سمتوں میں جا کر مختلف مقامات پر طرح طرح کے پیالے بنے ہوئے ہیں اور طرح طرح کی صورتیں بنی ہوئی ہیں جس قسم کا پیمانہ ہے وہاں سے اس رُخ کا برتن نکل کر چلا آتا ہے، اسی طور پر یوں سمجھئے کہ قرآن کریم بلا تشبیہ یوں کہئے کہ نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ عالیہ پر اترتا ہے اور اس کے انوارات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے کے اندر اترتے ہیں اور اس کی حقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں متشکل ہوتی ہے اور آپؐ کے جسد مطہر سے جو جو عمل نکلتا ہے

وہ قرآن کی عملی صورت ہے۔قرآن مجسد بن کر نکلتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی سے،قرآنِ مُشَکّل ،قرآنِ مجسد ،قرآنِ عملی اور قرآنِ ناطق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔جس طور پر قرآنِ صامت قرآن کریم خود ہے اسی طور پر قرآن ناطق سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔اس بناء پر اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا جائے گا تو قرآن کو آپ نہیں پا سکتے۔

بہر حال یہ عرض کر رہا تھا کہ خداوند قدوس نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔قراء نے اس کی قرأت کی حفاظت کی ،مفسرین نے اس کے معانی کی حفاظت کی اور اسی طور پر فقہاء نے اس کے مسائل کی حفاظت کی۔ یہاں ایک بات میں ذرا کھولنا چاہتا ہوں ،دوستو! قرآن کریم اترا اور سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ،وہ کیسے کہ بلاتشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہتے ہیں کہ معنی شعر...... شعر کے معنی جو ہوتے ہیں وہ شاعر کے اندر ہوتے ہیں ،شاعر خود جانتا ہے کہ اس کا کیا معنی ہے۔ جب شاعر خود اپنے شعر کے معنیٰ کو جانتا ہے تو ہم یوں کہیں گے کہ قرآن کا اصل مقصد اور اصل معنی خدا کی ذات جانتی ہے یا خدا جس پر ظاہر کر دے وہ جان سکتا ہے ،دوسرا نہیں جان سکتا۔اب قرآن کریم میں خداوند قدوس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے لفظ نہیں اتارے بلکہ یوں فرمایا دیکھو!

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗO فَاِذَاقَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ O ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗO (القیامۃ ۱۷،۱۸،۱۹)

ترجمہ: وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے ،پھر ہمارے ذمے

ہے اس کو کھول کر بتلانا ہم نے اس قرآن کو تم پر اتارا ہے اس کا جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کا قرآن پڑھانا بھی ہمارے ذمے ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ پھر ہمارے ذمے ہے کہ ہم اس کی تشریح، اس کا بیان، اس کے معانی اور اس کے حقائق آپؐ پر کھول کھول کر واضح کر دیں۔ یعنی یہ بات نہیں ہے کہ نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن کے الفاظ کے دینے والے تھے، بلکہ الفاظِ قرآنی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے اور معانی قرآنی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے۔ آج جسے ہم احادیث کہتے ہیں ہمارے فاسد ذہن میں آئیں یا نہ آئیں ہماری وہ نگاہ نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ تھی، ہمارا وہ ذہن نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن تھا، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں دیکھتے تھے وہ ہم قرآن میں نہیں دیکھ سکتے۔ جتنی بھی احادیث صحیحہ ہیں ہماری فاسد سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، ہمارے ذہن ان کو قبول کریں یا نہ کریں جو کچھ بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ قرآن کی تشریح میں فرمایا اور خود نہیں فرمایا بلکہ خدا نے خود ان سے کہلوایا۔ اس معنی میں اگر ہم دیکھیں گے تو جتنی بھی احادیث نبویہ ہیں وہ قرآن کی تشریحات ہیں اور ایسی تشریحات ہیں جو کہ خداوند قدوس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عالی سے ادا کروائی ہیں

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم۔۳،۴)

ترجمہ: اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا قرآن کی تفسیر میں کہا۔ قرآن کے متعلق تو آپ اور ہم سب یوں کہہ دیتے ہیں کہ ویسا ہی ہے جیسا لوحِ محفوظ سے

اترا تھا اور سینۂ نبویہ میں اتر کر آپؐ نے جیسے دیا تھا ویسے کا ویسا موجود ہے۔ لیکن کچھ عرصے سے دشمنوں نے ایک ہوائی اُڑا دی اور ایک آواز لگا دی کہ بھئی احادیث جو ہیں یہ تو تین سو سال کے بعد اکٹھی کی گئیں، ان کا کیا اعتبار ہے کہ کونسی صحیح ہوگی کونسی غلط ہوگی۔ اولاً تو بات یہ ہوتی ہے کہ عقلمند آدمی وہ ہوتا ہے کہ جس فن کو نہیں جانتا اس فن کے متعلق رائے نہیں دیا کرتا۔ اوّل فن کو جانو، پھر اس کے متعلق کوئی بات کرو۔ میں آپ کے A.G آفس میں آکر آپ کے خرچ کے بل بنانے شروع کر دوں اوّل سے آخر تک فن کو جانتا نہیں تو اس فن میں میں کیسے دخل دے سکتا ہوں۔ لیکن افسوس اس پر ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ایسا سمجھ لیا گیا کہ ہر کس و ناکس اٹھتا ہے اور اس پر خط تنسیخ پھیرتا چلا جاتا ہے، میں کہتا ہوں اس پر خط تنسیخ نہیں کھینچتا بلکہ اپنے ایمان پر خط تنسیخ کھینچتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس نے قبول نہیں کیا، جس نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ کو قبول نہیں کیا، جس نے اقوالِ نبویہ کو قبول نہیں کیا ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے قرآن کو قبول نہیں کیا۔ قرآن جس شدّ و مد سے، قرآن جس دعوے سے اتباعِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا کرتا ہے، کوئی کتاب اپنے نبی کے اعمال کی پیروی کی، آپ تمام دنیا کی کتابوں کو سامنے رکھ لیجئے، ہم چیلنج کرتے ہیں کہ کسی کتاب میں بھی جو اس وقت موجود ہیں اس طور پر نبی کی پیروی کا نہیں کہا گیا جس طور پر کہ ہمارے آقا سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا قرآن نے حکم دیا ہے۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷)

ترجمہ: اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے)

سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو۔

یہاں تک فرمادیا

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء۔۸۰)

ترجمہ: جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا۔

یعنی اطاعت رسول ہی اطاعت خداوندی ہے۔ اب جس نے اطاعت محمدیہ کو اختیار کیا اس نے اطاعت خداوندیہ کو اختیار کیا۔

بہرحال یہ عرض کر رہا تھا کہ لوگوں نے اس بات کو اڑایا اور اس کو لوگوں تک پھیلایا اور پہنچایا کہ العیاذ باللہ احادیث نبویہ تین سو سال کے بعد اکٹھی کی گئی ہیں۔ آپ تمام ماشاء اللہ تعلیم یافتہ طبقہ ہیں ایک بات کو واضح کرتا ہوں ذرا اچھی طرح ذہن میں ڈال لیجئے کہ یہ دشمن کی اڑائی ہوئی بات ہے ہمارے ہاں کی بات نہیں۔ احادیث کی یہ نوعیت نہیں ہے، دیکھو! قرآن کریم کا اکٹھا کیا جانا آپ بھی مانتے ہیں اور ہم بھی مانتے ہیں کہ زمانۂ نبوت سے دو طریقوں سے ہوا ہے ایک حفظ سے ہوا ہے اور ایک کتابت سے ہوا ہے۔ اسی طور پر احادیث جمع کی گئی ہیں تو دو نوعیّتوں سے ہوئی ہیں، ایک حفظ سے اور ایک کتابت سے۔ حفظ ہمارے قدیم علماء کے نزدیک وہ زیادہ قابل اعتبار تھا اس بناء پر کہ ممکن ہے کہ آپ ایک کتاب رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شخص اپنی طرف سے قطع و برید کر دے، کمی بیشی کر دے۔ اس لیے وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے اسے حفظ میں بھی یاد رکھتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ صحابہؓ کے زمانے میں ہر صحابیؓ نے جو خود نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اس نے اسے یاد رکھا۔ تابعینؒ کے دور میں ہر علاقے کے لوگوں کا علم علماء نے اکٹھا کیا اور اس کے بعد

پھر ملکوں کا علم اکٹھا ہوا اور تیسری صدی ہجری میں جو علم اکٹھا ہوا وہ ملکوں کا نہیں وہ سارے عالم کے علوم کو، سارے عالم کی احادیث کو اکٹھا کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ اور آج نوعیت یہ ہو گئی کہ جو لوگ علمِ حدیث سے ناواقف ہیں وہ باتیں بناتے ہیں اور اپنے جہل کی بناء پر حدیث پر ملبہ گراتے ہیں۔

ہم ان سے یوں کہیں گے کہ اگر آج تم ان چیزوں کو دیکھو آج کتابیں اپنی اصلی صورت میں موجود ہیں، آج بخاری، مسلم اور اس قسم کی تیسری اور چوتھی صدی کی کتابیں جن کے آگے انسان دنگ رہ جاتا ہے اور بے اختیار آفرین کہتا ہے کہ جس وقت ہمارے سامنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے صحائف ہیں مثال کے طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط جو کہ آپؐ نے مختلف لوگوں کو لکھے وہ خطوط بھی موجود ہیں، ان میں اور احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں ایک نقطے اور ایک لفظ کا فرق نہیں پایا جاتا۔ ابھی آج سے دس پندرہ سال پہلے دمشق کی کی لائبریری میں حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کے شاگرد ابنِ ہمامؒ کا ایک صحیفہ ملا جس میں ان کی حدیثیں جمع تھیں، ان احادیث کو ان احادیث کے ساتھ ملایا گیا جو کہ بخاری اور مسلم میں ہیں تو ان میں ایک حرف اور شوشے کا فرق نہیں پایا گیا۔ آجکل کچھ جہلاء کہتے ہیں بخاری بعد کے دور کی چیز ہے تو ہم کہیں گے کہ بخاری کو لے لو اور اس سے پہلے کی جو دوسری کتابیں ہیں مصنف عبدالرزاق کو دیکھ لو ابن ہمام کے صحیفے کو دیکھ لو تو یہ ایک ترتیب اور تسلسل ہے۔ میں یوں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تمام کتابیں موجود تھیں۔ اپنے ذہن سے اس فاسد خیال کو نکال دو کہ قرآن کریم کی جو تشریحات احادیث میں ہیں بعد کے زمانے میں بنائی گئی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دشمن جس وقت کہ اپنی ان کتابوں

کو جنھیں وہ آسمانی کتابیں کہتے ہیں ان میں ایسی غلط روایات دیکھتے ہیں اور جس وقت کہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تو کچھ بھی نہیں اور حقیقت کے لحاظ سے بعد کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں تو یہ قرآن کے متعلق تو کچھ کر نہیں سکتے احادیث کے متعلق ہرزہ سرائی شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ احادیث میں ہے ہم دعوے سے کہتے ہیں حق ہے اور جیسے کہ قرآن کی حفاظت خدا کے ذمے ہے ہم کہتے ہیں قرآن کے معانی یعنی احادیث کی حفاظت بھی خدا کے ذمے ہے اور اس نے آج تک حفاظت کر کے دکھائی ہے۔ اسی طور پر دین کے احکام کی حفاظت بھی قرآن کی حفاظت ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور قرآن میں اس معنی کی آیتیں پائی جاتی ہیں کہ قیامت تک کے زمانے تک ایسے لوگ موجود رہیں گے جو حق پر قائم ہوں گے اور دین حق کو پہنچاتے رہیں گے

لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِی اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَھُمْ اَمْرُ اللّٰہِ وَ ھُمْ عَلٰی ذَالِکَ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: میری امت کا ایک طبقہ اللہ کے امر (دین پر) ہمیشہ قائم رہے گا۔ ان کی عدم مدد اور مخالفت انھیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ قیامت تک یہ طبقہ اسی طرح امر الٰہی پر قائم (اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا) رہے گا۔

بہر حال قرآن محفوظ ہے اپنے لفظ کے لحاظ سے، قرآن محفوظ ہے اپنے معانی کے لحاظ سے اور قرآن محفوظ ہے اپنے عمل کے لحاظ سے۔ گو عمل کے لحاظ سے دائرہ کم سے کم ہو جائے لیکن دوستو! اس میں قصور قرآن کا نہیں اس میں خدا کا قصور نہیں، اس نے تو حفاظت فرمائی ہے اور قرآن کی دعوت، حدیث کی دعوت اور حضور

پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ عالیہ آج بھی کما حقہ موجود ہیں اور وہ ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آج اگر ہم جشن نزول قرآن مناتے ہیں تو جشن نزول قرآن کو منانے کے تقاضوں کو بھی ذہن میں لانا چاہئے کہ قرآن آیا کس لیے! ۔اکبر الہ آبادی ایک جگہ کہتے ہیں۔

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو
پیشِ خدا داد کی حاجت کیا ہے

تم نے کہا اللہ میاں نے یہ قرآن بڑا اچھا نازل کر دیا ماشاء اللہ ماشاء اللہ، واہ اللہ میاں تم نے بہت اچھا قرآن نازل کیا۔خداوند قدوس کو واہ واہ کی کیا ضرورت ہے؟ اسے داد کی کیا ضرورت ہے؟ اگر قرآن کی داد دیتے ہو تو قرآن کی داد یہ ہے کہ قرآن کو خود اپناؤ، قرآن پر عمل کرو، اس کے ظاہر کو لو اس کے باطن کو لو، اس کے باطن کو اپنے باطن پہ سجاؤ، اس کے ظاہر کو اپنے ظاہر پہ سجاؤ ۔قرآن نے اپنے متعلق یوں کہا ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرة:۱۸۵)

ترجمہ: مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی،

قرآن کی ھدایت ایک قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے ہے۔آپ کے نبیؐ کے متعلق قرآن نے کہا

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (الصبا:۲۸)

ترجمہ: اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو۔

اسی طور پر آپ کا قرآن تمام لوگوں کے لیے ہے۔ اب لوگوں میں اس قرآن کا پہنچانا کس کا ذمہ ہے، کون پہنچائے گا؟ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رہے آپؐ نے قرآن کے ایک ایک شو شے کو پہنچایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا اگر تم سے کوئی یوں کہے کہ العیاذ باللہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کسی بات کو روک لیا تو وہ غلط کہے گا۔ قرآن کہتا ہے

یٰٓاَیُّھَاالرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط (المائدۃ:٦٧)

ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی تم پر نازل کیا گیا ہے تو اسے پہنچا دے، اگر تو نے قرآن کو نہیں پہنچایا تو تو نے رسالت کا حق ہی ادا نہیں کیا۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا اور پھر پہنچا کر صرف یہی نہیں کیا کہ خدا سے کہہ دیا کہ اے ربّ میں نے پہنچا دیا ہے، بلکہ اس زمانے کے سب سے بڑے مجمعے میں جو کہ حجۃ الوداع کا مجمع تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور لوگوں سے پوچھا کہ **ھَلْ بَلَّغْتُ ھَلْ بَلَّغْتُ** لوگوں نے کہا **بَلَّغْتَ وَ اَحْسَنْتَ بَلَّغْتَ وَ اَحْسَنْتَ** ﴿اے محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم آپ نے پہنچایا اور بڑے اچھے طریقے سے پہنچایا﴾ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ** اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے پہنچا دیا۔ اور آئندہ کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے ایک بات کہہ دی **فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ** (بخاری) پس جو حاضر ہے وہ غائب تک پہنچاتا چلا جائے۔ قرآن کی ایک آیت

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط (الانعام:۱۹)

ترجمہ: اور اترا ہے مجھ پر یہ قرآن تا کہ تم کو اس سے خبردار کردوں اور جس کو یہ پہنچے۔

کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جس تک قرآن پہنچا وہ یوں سمجھے کہ اسے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پہنچا ہے پس بَلِّغُوْا عَنِّی وَلَوْ آیَةً (بخاری) کے تحت اس پر یہ لازم ہوتا ہے کہ اگر قرآن کی ایک آیت بھی تم تک پہنچی ہے تو تم اسے آگے پہنچاتے چلے جاؤ یہاں تک کہ جیسے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک وقت وہ آئے گا کہ تمام مشارق و مغارب میں یہ دین پہنچ کر رہے گا لیکن کمال والے وہ لوگ ہوں گے اور کامیاب ہوں گے وہ لوگ جن کا اس دین کے پہنچانے میں اپنا کچھ حصہ ہو جائے گا۔ تمھیں خداوندکریم نے نبی کیسا دیا......

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (السبا:۲۸)

ترجمہ: اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو۔

تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر، قرآن دیا ھُدًی لِّلنَّاسِ تمام انسانوں کے لیے ھدایت اور تمھیں کیا بنایا اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تمھیں لوگوں کے لیے نکالا اس لیے کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ تم لوگوں میں پھرو اور اس قرآن کے پیغام کو لے کر قریہ قریہ، گلی گلی، کوچہ کوچہ، ملک ملک قوم در قوم پھرتے رہو اور پہنچاتے رہو یہاں تک کہ خدا کی حجت مخلوق پر پوری ہو جائے اور تمام مخلوق یوں کہہ اٹھے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط اور یوں پکار اٹھے اٰمَنَّا بِالْقُرْآن ہم اس قرآن پر ایمان لے

آئے۔ جب تک قرآن پر تمام دنیا ایمان نہیں لے آتی میرا اور آپ کا مشن پورا نہیں ہوتا نزولِ قرآن کا جشن منانا اسی طور پر زیب ہے۔ ہے تو کڑوی بات لیکن حق بات چھپائی نہیں جاسکتی ...... جشن قرآن وہ منائے جس نے اپنے اندر قرآن کو رچا یا ہو، جس نے اپنے اندر قرآن کو اتارا ہو، جس نے اس کے اعمال کو خود لیا ہو، جس کے اندر قرآن کی دُھن سمائی ہو، جس نے قرآن کے لیے مشکلات کو جھیلا ہو اور قرآن کے پیغام کو پہنچانے کے لیے اپنی جان اور مال کو لگایا ہو۔ اگر ہم نے یہ کیا ہے تو ہم سب کو مبارک ہو اور اگر نہیں کیا، جیسے میں نے نہیں کیا تو دوستو! مجھ پر یہ عائد ہوتا ہے، لازم ہوتا ہے کہ اس قرآن کو لوں، سمجھوں، پڑھوں، اس پر عمل کروں اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کے مطابق دنیا کے کوچے کوچے میں اللہ کے اس آخری پیغام کو پہنچا دوں کیونکہ اس آخری پیغام کے بغیر دنیا کی نجات نہیں ہے۔ دنیا اس کو اپنا لے تو نجات پا جائے گی اور اگر نہیں اپنائے گی تو ہلاک ہو کر رہے گی۔ وہ جانے یا نہ جانے مانے یا نہ مانے ہلاکت ہے قرآن کے خلاف میں جانے پر۔ اور قرآن کے اتباع میں اس دنیا کا بھی چین ہے آرام ہے اور اس دنیا کی بھی راحتیں اور عزتیں ہیں اور آخرت کی تمام رفعتیں تو انہی لوگوں کے لیے ہیں جو کہ قرآن کے اپنانے والے ہیں۔ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کل قیامت کے دن جنت میں داخلے کے وقت قرآن کے پڑھنے والوں کو کہا جائے گا پڑھتا جا اور چڑھتا جا جسقدر تو نے دنیا میں قرآن کو پڑھا تھا جتنی آیتوں کو لیا تھا اس کے مطابق تیرے جنت میں درجے ہوں گے۔ جو قرآن کو سب سے زیادہ پڑھنے والا اور لینے والا ہوگا وہ سب سے اونچے درجے میں ہوگا۔ اللہ مجھے بھی عمل کی توفیق دے اور آپ کو بھی عمل کی توفیق

دے اور پوری امت مرحومہ کو توفیق دے کہ کل ہم پر یہ الزام عائد نہ ہو جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرما دیں اور اللہ کے سامنے فریاد رسی کریں کہ اے اللہ اس قوم نے قرآن کو چھوڑ رکھا تھا

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان:۳۰)

ترجمہ: اور (اُس دن) رسولؐ کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری (اس) قوم نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔

بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو کہیں نرسری میں جا رہا ہے، کہیں کنڈرگارٹن (kindergarten) میں جا رہا ہے کہیں پبلک سکول میں جا رہا ہے لیکن اتنا ہوش نہیں آتا کہ آخرت میں نہ تو نرسری بچائے گی، نہ سکول بچائے گا، نہ کالج بچائے گا اگر بچائے گا تو قرآن بچائے گا اور احادیث نبویہ بچائیں گی۔ قرآن کو لو گے تو بچو گے ورنہ قرآن کو لیے بغیر کامیابی نہیں اور پھر آخر میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ قرآن کا نرا لے لینا ہو نہیں سکتا جب تک کہ قرآن کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نہ لے لو، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو چھوڑ دیا تو قرآن حاصل نہیں ہوسکتا۔

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ترجمہ: اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچاؤ کیونکہ سارا دین وہی ہیں اگر ان تک نہ پہنچے تو پھر سب کچھ ابولہبی (یعنی باطل ہی باطل) ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

مشیخت وارادت

(ماہنامہ بینات: ستمبر، اکتوبر: ۱۹۷۳)

نبوی مہناجِ تربیت وتزکیہ اور سلسلۂ صحبت کا اصطلاحی نام مشیخت وارادت یا سلوک وتصوف ہے۔

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہدایت ربّانی کی تقسیم کا مرکز تھی۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زبانِ نبوت سے حکمت سرمدی کے موتی بکھیرتے، آیات الٰہی کی تلاوت اور احکامِ خداوندی کی تعلیم وتشریح فرماتے تھے تو آپؐ کے سینۂ مطہر کا فیضان کفر وضلالت کی ظلمتوں کو کافور کرتا تھا۔ اگر آپؐ کے اعمال امت کے لیے اسوۂ حسنہ تھے تو آپؐ کی صحبت، کبریت احمر اور اکسیرِ اعظم تھی جو زرِ خالص بلکہ سنگِ پارس وکیمیاء بنادیتی تھی۔ بقول شخصے ؎

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کردیا
دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

آپؐ کے قلبِ اقدس کا فیضان، قلبی کدورتوں کو دھوتا، نفوس کو رذائل سے پاک کرتا، انھیں سنوارتا، نکھارتا، روشن وتاباں اور نسبتِ حق کی قبولیت کے قابل بناتا تھا۔ ایک طرف آپؐ کی تعلیم ودعوت اور تلقین وموعظت صحابہ کرامؓ کو گمراہی سے بچا

کر ہدایت ربّانی سے فیضیاب کرتی تھی تو دوسری طرف آپؐ کا فیضِ صحبت آپؐ کی قلبی اور روحانی توجہ ان کی باطنی اصلاح وتربیت کا قوی سبب تھی۔

حضرت سید الملت سید سلیمان ندوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے۔ یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات، مجسمِ ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور انھیں ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس امت میں وہ مبعوث ہوتے ہیں ان کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے...... ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسرے خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیض صحبت اور اثر سے انھیں بھٹکنے نہ دیتا، اور ضلالت سے مانع آتا تھا...... (اور) اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اس کی کتابِ ناطق (رسولؐ) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی تھی۔''

<u>تزکیہ:</u>

''انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف ''تزکیہ'' ہے جس کے معنی پاک وصاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے، جن میں آپؐ کی یہ توصیف کی گئی ہے کہ ''ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی دعوت دیتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے''۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کا تیسرا وصف پہلے

دو اوصاف سے الگ ہے۔ یہ پاک صاف کرنا، آیت الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبیؐ کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حسن اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں ...... یہ وصف تزکیہ، وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے۔ خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

اس لیے نبوت کا سینہ، صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ھدایت کا مطلع النور ہوتا ہے۔ جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے، اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خود آپؐ کو مخاطب فرمایا گیا:

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ٥ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ٥ (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

ترجمہ: اے نبیؐ ہم نے بیشک آپؐ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپؐ (مومنین کے) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کے) ڈرانے والے ہیں اور (سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپؐ ایک روشن چراغ ہیں۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے...... اور جب آپؐ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں (جسم

وجان، زبان ودل، خُلق وعمل، علم وفہم) انوارِ الٰہی ہیں۔تو ان انوار میں سے ہرنور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اوران میں سے کسی سے بھی قطع نظرکرنا ظلمت کے ایک گوشے میں قدم دھرنا ہے۔ (سیرت النبی ص ۱۸۶ تا ۱۸۹ ملخصاً)

نبوت کے ''سراج منیر'' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا اثر ونتیجہ تھا کہ جو شخص آپؐ کی پاکیزہ دعوت پر لبیک کہتا ہوا، آپ کی خدمت میں جا پہنچتا تھا سینۂ اقدس کی تجلیات وانوارا اسے سراپا نور بنا دیتے تھے۔ جوبھی طالب بن کراس مہرِ جہانتاب کے ذرا بھی مقابل ہوا وہ شعلۂ طور بن کر نکلا۔ چنانچہ صحابہ کرام کا پاکیزہ گروہ جب اپنی خداداد استعدادوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اس سراجِ منیر کی صحبت میں پہنچا تو ان میں کا ہر فرد خود مطلع انواراور پوری بزمِ چراغاں بنا۔ ہر صحابی اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کے بقدر ہدایتِ الٰہی اور نورِ ربّانی کا جگمگاتا ہوا ستارہ بن کر چمکا، جو ''مشکوٰۃِ نبوت'' اور سراجِ رسالت کے انوارکو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

ارشادِ نبوی

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ (مشکوٰۃ)

ترجمہ: میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے ھدایت پاؤ گے۔

اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے ہدایت ربّانی کے قدسی چراغ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صحابہ کے قلوب منور وروشن ہو گئے، ان کی روحیں تجلیات نبوت سے وادیٔ ایمن بنیں، اور دل رشکِ سینا ......انوار الٰہیہ کی جوقندیل سینۂ نبوتؐ میں فروزاں تھی اس سے یہ قدسی ہستیاںؓ یوں چمکیں کہ ہر

صحابی عالم کے لیے شعلۂ طور اور ستارۂ ہدایت بن گیا۔ اس طرح صحابہ کرامؓ کا وہ پاک گروہ وجود میں آیا جسے انبیاء علیھم السلام کے بعد انسانیت کا سرمایۂ افتخار، ایمان وعرفان کی اوجِ کمال، تقویٰ و طہارت کی معراج اور انسانی اخلاق و اقدار کا صحیح پیمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے چہرے تقویٰ کے نور سے چمکتے اور ان کے قلوب انوار الٰہیہ سے جگمگاتے تھے۔

سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ (الفتح:۲۹)

ترجمہ: ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

ان کا ظاہر، اعمال و اخلاقِ نبوت کا امین اور ان کا باطن فیضان و برکاتِ رسالت کا حامل تھا کہ حضرت محمد رسول اللہ جس طرح احکامِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم ومعلم اور احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے والے تھے اسی طرح آپؐ کا سینۂ پاک اور قلبِ مطہر رشد و ھدایت کا سب سے بڑا مخزن اور توحید و معرفت اور ''نورِ امانت'' کا سب سے بڑا گنجینہ تھا۔ صحبت نبویؐ میں آرائش ظاہر کے ساتھ آراستگیٔ باطن کا سامان بھی موجود تھا۔ بقول حضرت سید الملت قدس سرہٗ: ''اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے فیض واثر سے پاک وصاف اور مصفّٰی بھی بنا دیتا ہے۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیکوکار، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن بنا دیتا ہے۔'' (سیرت النبیؐ ششم ص ۳۸۶، ۳۸۷)

حکمت الٰہیہ جن مبارک ہستیوں کو اس عالم میں اپنی ہدایت کی فیضان رسانی کے لیے چنتی ہے ان کے قلوب کو بھی فیضانِ ہدایت کا سبب و ذریعہ بنا دیتی

ہے۔ 'قلوب' کے آئینے جب ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں تو مزکی قلوب، کثیف قلب، کو مصفیٰ ومجلّٰی بنا کر انوار الٰہیہ کے قبول کرنے اور تخمِ ہدایت (جو یوم ازل میں جذر قلوب میں بکھیر دیا گیا تھا) کے بار آور ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ قلوب قلوب سے رنگ پکڑتے ہیں اور روحیں روحوں سے متاثر ہوتی ہیں، دل کی تاثیر سے دل زندہ ہو جاتے ہیں اور روحوں کی نورانیت ارواح کو روشن کر دیتی ہے۔ جس طرح نبیؐ ظاہری علوم و معاملات میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خلیفہ اور پیام رساں ہوتا ہے، احکام الٰہی کا اجراء اس کی ذات سے اور علوم حقہ کا اعلان اس کی زبان سے کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا قلبِ مزکی ہدایت الٰہی کے فیضان کا ذریعہ ہوتا ہے جس کی پیہم ضیاء پاشیاں اپنے ہم صحبت طالبین کے قلوب کو سنوارتی، نکھارتی اور پاک بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ ربّانیین کی جو جماعت سید عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تعلیم اور فیض صحبت سے وجود میں آئی وہ آپؐ کے ظاہری کمال اور باطنی جمال کی دوگونہ حسن وخوبی کا مرقع اور آپؐ کی جامعیت کبریٰ کا نمونہ تھی۔ صحابہ کرام کے قبائے تقویٰ کا خصوصی امتیاز صرف نبوت کا ظاہری اتباع نہ تھا بلکہ ظاہر کی دلکش متابعت کے ساتھ فیض نبوت سے ان کے دل روشن، روحیں منور اور نفوس تابندہ تھے۔ ان کے ظاہری اعمال کے علاوہ باطنی احوال بھی منہاجِ نبوت کے مطابق تھے۔ اگر ان کے اخلاق واعمال، عبادت و معاملات اور عادات وشمائل سنت نبوی کے ہمرنگ تھیں تو ان کی قلبی کیفیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مطہر کے انوار کا پرتو اور عکس تھیں۔ قلب و قالب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت تامہ اور اپنے علم وعمل، فکر ونظر اور ذوق وحال میں آپؐ سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔

سلسلۂ صحبت:

صحابہ کرام کے ان جملہ کمالات کا سبب سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کی صحبت ومعیت تھی۔ ''صحابیت'' کا امتیاز ہی یہ ہے کہ صحابہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک وشخصیت گرامی سے بے واسطہ فیضیاب ہوئے ہیں۔ معیتِ نبوت وصحبتِ رسالت نے ان میں ظاہر و باطن کی جامعیت پیدا کر دی تھی اور ایمان وتقویٰ کے کمال تک پہنچا دیا تھا اور ہر صحابی کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ کاملہ کا اپنی اپنی استعداد وظرف کے بقدر نمونہ اور مثنیٰ بنا دیا تھا۔ جن کا ایمان وتقویٰ اور اعمال واخلاق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی سے مستفاد اور جن کا ظاہر و باطن آپؐ کے فیوض وکمالات و برکات وانوار سے مکمل اور مستنیر تھا۔ گویا صفاتِ رَبّانی کے مظہر اتم اور مستورِ ازل کے آخری واکمل نقاب کشا حبیبِ با صفا صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ظاہر و باطن نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحابہ کرام کو قلباً و قالبًا الٰہی رنگ میں رنگین بنا کر اپنے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے) ظاہری و باطنی اتباعِ کامل سے منور بنا دیا تھا۔ صحبت کی تاثیر، معیت نبوت کے اثر، اور تعلیم و تربیت رسالت کی برکت نے صحابہ کو اس قابل بنا دیا تھا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کی حیثیت سے تعلیم وتزکیہ کے نبوی فرائض انجام دے سکیں۔ اور آپؐ سے اخذ کردہ ظاہری و باطنی علوم کو دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں اور اپنے فیض صحبت تاثیر قلب اور فیضان باطن سے دوسروں میں میراثِ نبوت تقسیم کر سکیں اور اپنے مستفیدین کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر و باطن والے اعمال سے بتوفیقِ الٰہی مشرف فرما سکیں۔ اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اللہ

تبارک و تعالیٰ نے انسانیت کی دائمی صلاح و فلاح کے لیے جو ہدایت اور فیضانِ ربّانی کا سلسلہ جاری فرمایا ہے اس سلسلۃ الذہب کی سب سے مضبوط اور درخشاں کڑی بن سکیں۔ اور ان کے واسطے سے ہدایت نبویؐ تابعین میں منتقل ہو اور پھر تابعین سے تبع تابعین فیض و ہدایت کی امانت کو سنبھال لیں اور اس طرح نسلاً بعد نسل ہدایت ربّانی کا یہ چشمہ واصحابِ کاملین کے ذریعے قیامت تک جاری رہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی حجت قیامت تک بندوں پر پوری ہو اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی فیوض و کمالات سے سعید ہستیاں تا قیام قیامت فیضیاب ہوتی رہیں۔ کہ ختم نبوت کے مفہوم میں یہ حقیقت بھی منظور رہی ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کا اجراءِ فیض بھی قیامت تک قائم و دائم رہے گا اور ہر دور میں قدوسیوں کی جماعت، جو وراثت نبوت کی جامع ہو، نیابت نبوت کے فریضہ کو ادا کرتی رہے گی۔ مندرجہ ذیل ارشاد نبوی میں اسی جماعت کے بقاء و دوام کا مژدہ سنایا گیا ہے:

لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِی اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰی یَاْتِیَهُمْ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ عَلٰی ذَالِکَ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: میری امت کا ایک طبقہ اللہ کے امر (دین پر) ہمیشہ قائم رہے گا۔ ان کی عدم مدد و مخالفت انھیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ قیامت تک یہ طبقہ اسی طرح امر الٰہی پر قائم (اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا) رہے گا۔

گزشتہ تاریخ ملّت کے اوراق اس دعویٰ پر شاہد عدل ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک سنت الٰہیہ فیضان نبوت کے اس سلسلہ کو جاری رکھے گی۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ O (صف:۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنے نورِ ہدایت کو کامل کر کے رہے گا اگر چہ مشرکین اس کو پسند نہ کرتے ہوں۔

سیدی حضرت والا نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے ”قرنِ اوّل میں جماعت سے جماعت متاثر ہوتی تھی۔ پھر جب اسلامی معاشرے میں اضمحلال آیا تو جماعت کی بجائے افرادِ کاملین پیدا ہونے لگے اور افراد سے افراد متاثر ہونے لگے...... دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی، ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں لیکن ابھی اللہ تعالیٰ کے بندے موجود ہیں۔ جیسے چراغ جلاتا ہے اسی طرح جن کے دل (گناہوں سے) میلے ہو چکے ہیں پھر ان روشن قلوب سے ملا دیں تو وہ صاف اور روشن ہو جائیں گے۔ قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”سراجا منیرا“ کہا گیا ہے۔ اب تک جو صالحین موجود ہیں ان کے دل اسی چراغ (سراجا منیرا) سے روشن ہوئے ہیں۔ ”شجرہ“ میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام یکجا ہیں۔ جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ شجرہ میں ملاتے ہیں۔“

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ زمین و آسمان کی روشنی تو اللہ ہی ہیں

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (النور: ۳۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیا جائے تو نور کہاں رہ جاتا ہے، ظلمت ہی ظلمت رہ جاتی ہے۔ یہ چیز پراپیگنڈا سے ہاتھ نہیں آتی زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے، جیسے دیے سے دیا روشن ہو جاتا ہے صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں ۔

اندھیرا ہے عالم میں چھایا ہوا   چراغِ جہاں قلبِ آگاہ ہے

صحراؤں میں رکھے ہوئے چراغوں میں تو حرکت نہیں۔ اپنے اندر انوار پیدا کیجئے، دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں لیکن ابھی اللہ کے بندے موجود ہیں۔

حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے ایک مستفسر کے جواب میں تعلیم وتزکیہ کی یکجائی اور صحبت نبوت و فیضانِ ہدایت کے الٰہی سلسلہ کی اہمیت ذہن نشین کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا: ''یہ فن (سلوک) نظری سے زیادہ عملی ہے۔ اس کے لیے ایسے کاملین کی ضرورت ہے جو اپنے حسن اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبی ہوں۔ جو اپنے آداب، اخلاق، عادات اور اتباعِ اوامر ونواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں، جن کی صحبت میں پرتو نبوی کا اثر ہو، اور جن کا سلسلہ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تک منتہی ہو، جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے، جس طرح فن روایت میں اس کا نام سلسلہ ہے۔ اس مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ علم حدیث جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا سلسلہ ہے سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا سلسلہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سارا فیض صحبتِ نبوت کی تاثیر کا نتیجہ تھا۔ ان کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اٹھے اور تابعین کے فیضِ صحبت سے تبع تابعین کا ظہور رہا۔ یہ تین دور ایسے ہیں جن میں پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہے۔ مگر ہر دور میں جماعت کم و کیف یعنی تعداد اور حالت میں کم ہوتی چلی گئی۔ تبع تابعین کے بعد جب فتنوں کا ظہور ہوا تو تعداد اور بھی کم ہوگئی۔ اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی۔ اب

اشخاصِ کاملین کی صحبت سے اشخاصِ بااستعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ ہوا جس کا نام متاخرین نے ''ارادت'' یا ''پیری مریدی'' رکھ دیا ہے۔ ورنہ قدماء اور سلف صالحین کی اصطلاح صحبت ہی کی تھی۔ مرید کو صاحب یعنی صحبت یافتہ کہتے تھے۔ جیسا امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کو صاحبِ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت شبلیؒ اور جنیدؒ کے مرید بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے۔ جیسے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص نے شبلی کی صحبت اٹھائی ہے یا جنید کی صحبت اٹھائی ہے۔

قرآن کریم نے بھی خلیفۂ اوّل سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''صاحب'' کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

فَقَدۡ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذۡ اَخۡرَجَہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ثَانِیَ اثۡنَیۡنِ اِذۡ ھُمَا فِی الۡغَارِ اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبہ:۴۰)

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد فرمائی جب انھیں (آنحضورؐ کو) کافروں نے نکال دیا تھا اور جب وہ دو میں سے دوسرے تھے جبکہ وہ دونوں غار میں تھے اور جب وہ (آنحضورؐ) اپنے صاحب (ساتھی) سے فرما رہے تھے کہ رنجیدہ نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی انھیں ''صاحبی'' فرمایا ہے، چنانچہ جامع ترمذی (ابواب المناقب) میں ہے

لَوۡ کُنۡتُ مُتَّخِذًا خَلِیۡلًا لَّا تَّخَذۡتُ اَبَابَکۡرٍ خَلِیۡلًا وَلٰکِنَّہٗ اَخِیۡ وَ صَاحِبِیۡ (مسلم)

ترجمہ: اگر میں اپنی امت میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن وہ میرا بھائی اور ''صاحب'' ہے۔

بلکہ اپنے جملہ ساتھیوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اصحابی'' کہہ کر پکارا ہے جیسا کہ صحاح کی روایاتِ متواترہ شاہد ہیں۔ اور یہ ''صحابہ'' اور ''اصحاب'' کا لفظ خود ''صحبت نبوت'' کی اہمیت و تحقق پر دال ہے۔

صحبت و معیت کے ثمرات ہی صحابہ کے فضائل و کمالات تھے۔ چنانچہ ''معیتِ نبوت'' کے حاملین (صحابہ کرامؓ) وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کا تذکرہ قرآن اِن دلستان الفاظ میں کرتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط (الفتح:۲۹)

ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں بہت رحمدل ہیں (اے مخاطب) تم انھیں رکوع و سجود کی حالت میں پاؤ گے وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضا حاصل کرنے میں مصروف ہوں گے۔ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں میں نشانیاں ہیں۔

معلوم ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت وصحبت نے جلال و جمالِ الٰہی کی صفات کا عکس وظلال (شدت علی الکفار، رحمت علی المؤمنین) محبت وعبادتِ الٰہی کا شغف وکمال اور طلب ورضا وفضل کا اشتیاق صحابہ میں پیدا فرما

دیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ارواح شیخین رضی اللہ عنہما کے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک سے متاثر و رنگین ہونے کے بارے میں کیا خوب شعر نقل کئے ہیں۔

رق الزجاج ورقت الخمر   فتشابها و تشاکل الامر

فکأنها خمر و لا قدح   و کأنها قدح ولا خمر

(تفہیمات الٰہیہ ص۲۴۴ و ۲۴۵ ج ۱)

یہ سب صحبت نبوت ﷺ کا ثمرہ تھا۔ امام قشیریؒ ''صحابیت'' کی فضیلت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (شرف وفضیلت کے اظہار کے لیے) ''صحابہ'' کے سوا اور کوئی لقب ایجاد نہیں ہوا کہ شرفِ صحبت سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہوسکتا۔''

علامہ ابونصر الطّوسی کتاب اللمع میں لکھتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو وہ عظمت وخصوصیت حاصل ہے کہ جس شخص کو یہ عزت حاصل ہوگئی اس کو کوئی دوسرا خطاب جو اس سے بھی معزز ہو نہیں دیا جا سکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ زہاد، عباد متوکلین، فقرا، اہل رضا، اہل صبر، اہل تواضع واخبات کے امام ہیں۔ اور یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''فیض صحبت'' سے حاصل کیا ہے۔ تو جب ان بزرگوں کا انتساب صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جو بزرگ ترین صفات سے ہے تو یہ محال ہے کہ اس بزرگ ترین صفت کے علاوہ ان کو کوئی دوسری فضیلت دی جائے۔ (کتاب اللمع ص۲۳)

غرض یہی ''صحبت'' کی اہمیت ہے جس کی بناء پر طریقِ تقویٰ وسلوک کا مدار ''صحبت'' پر قائم ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی ''صادقین'' کی معیت وصحبت کا امر فرمایا ہے کہ ''متقین'' کی صحبت حصول وازیادِ تقویٰ کا سب سے بڑا اور قوی سبب ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ O لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ ط ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ O (الزمر:۳۳)

ترجمہ: اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بدلہ ہے نیکوکاروں کا۔

حضرت الشیخ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح میں ارقام فرماتے ہیں: ''یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال ودولت اور جاہ وعزت کے نکتہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے نہیں ہٹنا چاہتا۔'' (سیرت پنجم ص ۴۱۸، ۴۱۹)

ایسے سچے (صادقین) متقیوں کی صحبت ومعیت مِس خام کو کُندن اور گِل کو گُل بنا دیتی ہے۔ صحبت کی اسی تاثیر کے متعلق شیخ شیراز نے کیا تمثیل دی ہے ؎

گِلے خوشبوئے در حمام روزے ۔۔۔ رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ۔۔۔ کہ از بوئے دلاویزے تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم ۔۔۔ ولیکن مدتے با گل نشستم!

جمالِ ہمنشین در من اثر کرد　　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمہ: حمام میں ایک دن دوست کے ہاتھوں مجھے خوشبودار مٹی ملی۔اس سے میں نے کہا تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دلآویز خوشبو سے میں مست ہوگیا۔اس نے کہا کہ میں ایک ناچیز مٹی تھی لیکن کچھ عرصہ گلاب کے ساتھ رہی، میرے ساتھی کے حسن نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں وہی مٹی ہوں جو کہ تھی۔

انسان فطرۃً دوسرے کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے۔خصوصاً اہل اللہ کی صحبت تو سراپا شعلۂ طور ہے جو ماسوا کے تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ یہ سنتِ الٰہی، عادت ربّانی اور حکمت تشریعی ہے کہ توحید و معرفت الٰہی کا جو بیج ازل میں انسانی قلب کے سپرد کیا گیا تھا، اس عالمِ ناسوت میں اس کا پھٹنا، آبیاری، نشوونما، اور بار آوری اہل حق کے فیض صحبت وتوجہ سے ہوتی ہے اوراس جوہر پاک کا احیاء وسنوار، ترقی ونکھار صاحبِ دل حضرات کی معیت و فیضان کا نتیجہ ہوتا ہے۔گو یہ فیض وتوجہ مستفیض و مُرید کی طلب و ارادہ کی شرط پر عادتاً منحصر ہے گویا اللہ تبارک و تعالیٰ ''صاحبِ نسبت''، زندہ دل، اشخاص کے قلوب کو اپنی ہدایت و انوار وتجلیات کا عادی آلہ بنا کر مستفیض کے دل پر اپنی صفات کا انعکاس اور اپنی 'نسبتِ عالیہ'' کا ورود واِلقاء فرماتے ہیں۔ یہ نسبت باطنی فیض و مستفیض (شیخ و مرید) کی قوتِ نسبت و استعداد کے بقدر متفاوت ہوتی ہے۔بہرحال کاملین کی صحبت حیاتِ قلبی اور اصلاحِ باطنی کا سبب بن جاتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا نورِ ہدایت اور فیضان صاحبِ دل شیخ کے ذریعہ طالبین کے دلوں میں منتقل فرما دیتا ہے اور دلوں کے آئینے انوارِ الٰہیہ سے جگمگا اٹھتے ہیں۔

نورِ معشوقِ ازل در دلم ازیار افتاد

عکس خورشید ز آئینه بدیوار افتاد

ترجمہ: ازل کے معشوق (ذاتِ خداوندی) کا نور دوست (شیخ) کے ذریعے میرے دل میں آیا۔ جیسے سورج کا عکس دیوار کے آئینے پر پڑتا ہے۔

دلوں کی کھیتی شیخ کی آبیاری سے ہری ہو جاتی ہے۔ بقول سید الملتؒ ؎

ترے اک چھینٹے سے اے ابرِ بہاری ان دنوں

سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزارِ دل

جس طرح آتشی شیشے کی سوزش کے اثر سے کاغذ جل اُٹھتا ہے، یا چقماق کی رگڑ سے آگ پیدا ہو جاتی ہے ان ربّانی آئینوں (اہل دل کے قلوب) کے مقابل جو دل بھی شوق وطلب وعزیمتِ اصلاح وعمل لے کر آتا ہے وہ نسبت الٰہی سے منور و ایمان وتقویٰ کے نور سے مصفّٰی ومتجلّی ہو جاتا ہے۔ بقول عارف رومیؒ

ھیں کہ اسرافیلِ وقت اند اولیاءؒ

مردہ راز ایشاں حیات است و نما

ترجمہ: دیکھو اولیاء وقت کے اسرافیل ہوتے ہیں مردہ کے لئے اُن کے ذریعے زندگی اور حیات ہے

اہل اللہ کے قلوب بھی خدا جانے کیسی قوت رکھتے ہیں جن کی ایک ہی نظر زندگی کو پلٹ دیتی ہے ؎

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس

ہوش جو تھا بیہشی ہے بیہشی اب ہوش ہے (سید الملتؒ)

سیدی حضرت الشیخ قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک خادم نے عرض کی ''حضرت دردِ دل کس طرح حاصل ہو؟'' فرمایا

جو آج لذّت دردِ نہاں کا جویا ہے وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

پھر ارشاد فرمایا، محبت نہ ہونے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔

محبت تو اے دل بڑی بات ہے یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے جو آبِ حیات محبت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے تو سارے غموں سے فراغت ملے

اس کے بعد فرمایا: ''اس کی خواہش ہو تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ محبت خاصانِ خدا کے قلوب کا خاص نور ہے...... '' صحبت سے یہ چیز شدہ شدہ آپ میں بھی آجائے گی۔

ایک مرتبہ فقیر نے دارمنزل کے غربت کدہ میں جو آج ہزاروں سینہ فگاروں کا حریمِ شوق ہے عرض کیا، حضرت والا کیا کسی کا یہ کہنا صحیح ہے

؏ نگاہِ مستِ ساقی نے میری دنیا بدل ڈالی

فرمایا جی ہاں، سچ ہے۔ میرا بھی ایک شعر ہے

تیری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

پھر متبسم نگاہوں سے اپنے مجموعہ '' غزل الغزلات'' سے ایک دوسرا شعر نکال کر پڑھنے کو دیا۔

تیری نظر میں ہے تاثیر مستی صہبا
تیری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

یہ شعر پڑھ کر ساقی کی پُر معنی نگاہیں فقیر کے چہرہ پر تھیں اور اس کا دل تھا کہ اُڑا جا رہا تھا ۔

شراب دیتے ہوئے اس پہ چشم ساقی تھی
سرور مے میں کہاں سب نشہ نگاہ میں ہے

مدہوشی وسکر کا یہ عالم، ارشاد سے ہوش سے بدل گیا ''آپ نے شعر پڑھ لیا'' عرض کیا جی ہاں اور سرور دل وجان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ صحبت کی یہی تاثیر و اثر پذیری ہے جس کی بناء پر عارف رومیؒ نے کہا ہے ۔

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است	بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است
یک زمانے صحبتِ با اولیاء	بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارۂ مرمر شوی!	چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی
مہر پاکاں درمیان جاں نشاں	دِل مَدِہ الاّ بمہر دل خوشاں

ترجمہ: نیک لوگوں کی صحبت اگر ایک ساعت کے لیے بھی ہو تو وہ سو سالہ عبادت و زہد سے بہتر ہے۔ اولیاء کے ساتھ ایک زمانہ صحبت سو سالہ بے ریاء عبادت سے بہتر ہے۔ اگر تو عام پتھر ہے تو سنگِ مرمر بن جائے گا جب صاحبِ دل کے پاس پہنچے گا تو ہیرا بن جائے گا۔ پاک لوگوں کی محبت جان کو کمال دیتی ہے اس لئے دل میں اہل اللہ کے علاوہ کسی کی محبت نہیں ہونی چاہیئے۔

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''سلوک وتصوف'' اور

سلسلہ مشیخت وارادت (پیری مریدی) حقیقت میں تربیت وتزکیہ نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اورصحبتِ رسالت کے سلسلہ جاریہ ہی کا نام ہے۔تربیت واصلاح نفوس و قلوب کا نبویؐ طریق نسلاً بعدنسل صحبت کے ذریعے پہلوں سے پچھلوں کی طرف منتقل ہوتا چلا آیا ہے اورفطری تربیت کے مطابق سابق سے لاحق اورایک سے دوسرا راہ پاتا رہا ہے کہ ؂

ہیچ کن ازخود بخود چیزے نشد　　　ہیچ آہن خنجر تیزے نشد

ہیچ حلوائی نشد استاد کار　　　تا کہ شاگردِ شکرریزے نشد

مولوی ہرگز نشد مولائے روم　　　تا غلام شمس تبریزے نشد

ترجمہ: کوئی آدمی خود بخود کوئی چیز نہیں بنا،کوئی لوہا تیز خنجر نہیں بنا،کوئی حلوائی اُستاد نہیں بنا جب تک کسی ماہر حلوائی کا شاگرد نہیں بنا،مولوی مولائے روم ہرگز نہ بن سکا جب تک شمس الدّین تبریز کا غلام نہ ہوا۔

اس بناء پر سلوک وطریقت کی افادیت مسلم اوراس کی ضرورت لابدی ہے۔اس کے مقاصد حسب درجات فرض یا سنت یا مستحب ہیں اوراس کے ذرائع بعض منصوص اوربعض اجتہادی ہیں۔اس لیے اس سے کلی انکار کی عقلاً وشرعاً گنجائش نہیں بلکہ اس کا اختیار وقبول علی قدر المراتب لازمی وضروری ہے۔



”حجِ بیت اللہ شریف“

(۹، اپریل ۱۹۵۹ء رورل ڈویلوپمنٹ اکیڈمی پشاور)

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور انور سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دین کے ساتھ بھیجا ہے وہ ہر رُخ سے کامل ہے اور ہر صورت سے اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تکمیلی شان رکھ دی ہے۔ کہ کوئی شعبۂ عمل بھی ہو اس میں انسان کی ترقیات کی راہ انتہا تک پہنچ جائے اور انسان کے اندر اللہ نے جو شعبے اور استعدادیں رکھی ہیں یا جو کمالات رکھے ہیں وہ اسی طور پر پستی کی حالت میں نہ رہیں بلکہ بڑھتے چلے جائیں۔ دوستو! جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں نماز ہے روزہ ہے اسی طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت پر ایک فریضہ عائد کیا ہے، ان لوگوں کے لیے جو کہ کعبۃ اللہ تک جاسکیں، اسے حج کا فریضہ کہتے ہیں۔

وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ط (ال عمران: ۹۷)

ترجمہ: اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمہ جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کی سبیل کی۔

حج کی عبادت اپنے کئی پہلوؤں سے انتہائی اہم ہے اور یوں کہئے کہ اسلام کا یہ تکمیلی فریضہ ہے۔ اگر حج کو صحیح نیت سے انسان ادا کرلے اور اس کے حقوق کو ادا کر دے تو حاجی حقیقت میں اسلام کے انتہائی اعلیٰ اور اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے۔

دوستو! حج کا لفظی معنیٰ ارادہ اور قصد کرنے کا ہے، کسی چیز کا ارادہ کرنا اور قصد کرنا اور یہاں مراد ہے بیت اللہ شریف یعنی اللہ کے گھر پر جانا اور اللہ کی عبادت کی نیت سے جانا۔

دوستو! بنیادی طور پر اگر آپ دیکھئے تو اسلام سے جتنی بھی پہلی قومیں گزری ہیں اُن کی اپنی اپنی عبادت گاہیں ہوتی تھیں ان پر جاکر وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے اور عبادتیں کرتے تھے، کوئی بھینٹ چڑھاتا تھا کوئی کیا کرتا تھا کوئی کیا کرتا تھا۔ اب ایک ایسی ملّت کے لیے جو کہ پورے عالم کی ملّت ہو اور ایسی ملّت جو کہ ہمیشہ کے لیے ہو اور اللہ تبارک وتعالیٰ جسے سب کچھ دینا چاہیں اس کے لیے ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو کہ دنیاوی غیر مذاہب کے ان مشرکانہ رسوم سے قطعاً ممتاز ہو اور اس میں کبھی بھی ایسی نوعیت نہ آئے کہ انسان اپنے اندر کسی شرک کی نوعیت کو لے لے۔ اسلام دینِ توحید ہے اور تمام انبیاءؑ توحید کی دعوت ہی دینے کے لیے آئے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم سیدنا نبینا علیہ الصلوۃ والسلام کو توحید کی انتہائی بلندی کے ساتھ بھیجا، جسے کہ آخر میں آکر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا۔ اب اس امت کو مرکزیت کے لیے ایک ایسا مقام چاہئے تھا جہاں جاکر انسان اپنی خدا کی محبت کو آشکارا کر سکے، لوگ تو دیوی اور دیوتاؤں کے لیے قربانیاں دیا کرتے ہیں، یہ اپنی قربانی سے خدا کے اوپر اپنے آپ کو قربان کرنے کا منظر پیش کر سکے۔ اس کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ کو چُنا جسے کہ بیت اللہ کہتے ہیں۔ بیت اللہ قرآن کریم کے مطابق بیت العتیق ہے۔ دنیا میں سب سے پہلا گھر جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے بنایا، قرآن پاک خود کہتا ہے

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (ال عمران:۹۶)

ترجمہ: یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا، وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے، جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں پہلا گھر جو ہم نے دنیا میں بنایا وہ کعبۃ اللہ تھا، اور یہ ایسا گھر ہے جو کہ بندگی کے لیے بنایا گیا اور مسجد کے رُخ سے بنایا گیا۔ آج بھی اگر آپ موجودہ تورات کو دیکھئے تو اس میں کم ازکم تین مقامات پر اس کا اشارہ آتا ہے، اسے بیت ایل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عبرانی زبان میں ''ایل'' اللہ کو کہتے ہیں اور بیت گھر کو کہتے ہیں جیسا کہ ہمارے ہاں ہے ایسے ہی ان کے ہاں ہے، یعنی اللہ کا گھر۔ اب یہ اللہ کا گھر کس جگہ پر تھا اور کہاں تھا اور اسے کیوں چُنا گیا! اس کے متعلق میں چند باتیں عرض کر کے بیت اللہ اور حج کے متعلق بات عرض کروں گا۔

بیت اللہ پر حج کے لیے جانا حقیقت میں ابراھیمی عبادات کی تازگی ہے۔ اس بناء پر حضرت ابراھیم علیہ السلام کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ابراھیم علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے

مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ ؕ ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (الحج:۷۸)

ترجمہ: دین تمہارے باپ ابراھیمؑ کا اُسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان۔

حضرت ابراھیمؑ ہمارے دینی لحاظ سے باپ ہیں، اور عرب کے تو نسبی لحاظ

سے بھی باپ ہیں، ہمارے دینی لحاظ سے باپ ہیں اور حقیقت میں ملت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ابراھیمی دین کی تجدید ہے اور وہی دین جو کہ ابراھیمؑ کا تھا ہمیں دیا گیا۔ اس بناء پر حج میں کلیۃً حضرت ابراھیم علیہ السلام کے جتنے بھی مراسم تھے انہی مراسم کو اور انہی کی قربانیوں کو زندہ کیا گیا ہے اور اللہ کے ساتھ جو ان کا تعلق تھا اور جو قربانی تھی اس کو زندہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ حج کی روح کو جاننا چاہیں تو ابراھیم علیہ السلام کے متعلق تھوڑی سی بات کو سمجھ لینا چاہیئے۔ ابراھیم علیہ السلام کے متعلق آپ جانتے ہیں، قرآن بھی کہتا ہے

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ○ (النساء: ۱۲۵)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے ابراھیمؑ کو اپنا خالص دوست بنایا تھا۔

اللہ نے ابراھیمؑ کو اپنا دوست چنا تھا۔ عربی کے لحاظ سے خلت اس مرتبۂ محبت کو کہتے ہیں جس محبت کے بعد کسی دوسرے کی محبت کی گنجائش نہیں رہتی یعنی ابراھیمؑ کے دل کے اندر خدا کی محبت اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ کسی دوسرے کی محبت کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔ اسی مفہوم کو قرآن نے دوسرے مقام پر نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ابراھیمؑ اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔ اور قلبِ سلیم اسی دل کو کہتے ہیں جس میں کوئی روگ نہ ہو، غیر کی محبت کا روگ نہ ہو، غیر کے رجحان کا روگ نہ ہو، غیر کی یاد کا روگ نہ ہو۔ روگ کہتے ہیں بیماری کو، یعنی کوئی ایسی بیماری نہ ہو جو انسان کو غیر کی طرف ملتفت اور راغب کر سکے۔ ہر وقت ہر حال میں خدا کی ذات میں مست و مشغول رہنا اور خدا کے دھیان میں ہر آن لگے رہنا، اسے کہتے ہیں قلبِ سلیم، جس میں دوسری کوئی بھی چیز سما نہ سکے۔

دیکھئے ایک موٹی سی بات ہے اگر آپ اسے سمجھیں گے تو جح کی حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ ابراھیم علی نبینا الصلوۃ والتسلیم نے جس وقت کہ شروع دور میں ایک بات کہی تھی کہ

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ O (الانعام:۷۹)

ترجمہ: میں اپنا رُخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

آپؑ جس قوم میں پل رہے تھے اور جوان ہو رہے تھے وہ قوم کلدانی قوم تھی اور یہ بابل کے قریب رہتے تھے، ''عر'' بابل سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ایک جگہ تھی وہاں آپؑ کی پیدائش ہوئی تھی، یہ ستارہ پرستوں کا علاقہ تھا اور سب کے سب ستاروں کی اور سورج چاند کی پرستش کرتے تھے۔ ابراھیمؑ کے اگر آپ دلائل میں دیکھیں جو قرآن نے نقل کیے ہیں، وہ دشمنوں کی بات کا رد ایسے کرتے ہیں کہ عملاً مظاہرہ کر کے کرتے ہیں جسے آپ لوگ اپنی اصطلاح میں Practical Demonstration کہتے ہیں، ایک چیز کو Demonstrate کرتے ہیں اور پھر نتائج کو بیان کرتے ہیں۔ قرآن نے ان کے اس انداز کو ایک طور سے بیان کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس وقت ابراھیمؑ نے ستاروں کو دیکھا تو انھوں نے کہا ھٰذا رَبِّی (یہ میرا پروردگار ہوگا) ابراھیمؑ اپنے دل سے نہیں کہہ رہے تھے، وہ اس بات کو نقل کر رہے تھے جس بات پر کلدانیوں کا ایمان تھا، ستارے جب غروب ہو گئے تو کہنے لگے

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ O (الانعام:۷۶)

ترجمہ: سو جب غروب ہو گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔

جو ڈوب جانے والی ہے اس سے میں محبت نہیں کرتا، وہ خدا کیسا ہو سکتا ہے جو ڈوب جائے۔ جب چاند آیا تو چاند کے بارے میں یوں کہا کہ ممکن ہے یہی میرا خدا ہو، اور جب چاند جا کر چھپ گیا اور سورج نکلا تو کہنے لگے هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَر یعنی یہ بڑا ہے یہی خدا ہو گا، یعنی مخاطبین کے ذہن کی سطح کے مطابق بات کرتے جا رہے ہیں جب وہ بھی ڈوب جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد یوں کہتے ہیں، کھل کر اپنے دل کی جو بات ہے زبان پر لا کر کہتے ہیں

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام:۷۹)

ترجمہ: میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

اب زبان سے انھوں نے کہہ دیا ''وَجَّهْتُ وَجْهِیَ''، میں نِرا سو فیصد خدا کا ہو گیا، دعویٰ کر لینا آسان ہوتا ہے اور میاں کے سامنے دعویٰ کر لیں تو بعض اوقات دلیل بھی مانگی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ہم نے ابراھیمؑ کو آزمایا ہم نے ان کی آزمائش کی۔ کہہ تو دی ہے تم نے ایسی بات اب ہم تمہاری تھوڑی سی آزمائش بھی کر لیتے ہیں کہ آیا تم اپنے دعوے میں سچے ہو، کہ تم جو کہہ رہے ہو میں تیرا ہوں کسی غیر کا نہیں ہوں، نہ زمین کی کسی چیز کا لینے والا ہوں، نہ آسمان کی کسی چیز کی طرف جھکنے والا ہوں، میں تو بنانے والے کی طرف جھکوں گا، بنے ہوؤں کی طرف نہیں جھکوں

گا۔ بات کہہ دی، اب اس کے بعد کیا ہوا کہ ایک اور Demonstration کی، وہ کیا؟ ابراھیمؑ کی دعوت الی اللہ کا یہ ایک منظر ہے، انکی قوم کے مختلف بت تھے اور بتوں میں کوئی کس حاجت کا بت ہے کوئی کس حاجت کا بت ہے ان میں ایک بڑا بت بھی تھا۔ ان کی قوم کا قرآن کے لفظوں میں ''یوم سینا'' کا لفظ آتا ہے یعنی ان کے میلے کا دن تھا جس دن کہ وہ اپنا تہوار مناتے ہیں، باہر جو نکلے تو ابراھیمؑ نے کہا کہ آج ایک نئے رُخ سے ان کے دین کا مضحکہ اڑاؤ اور انھیں ایسا لاجواب کردو کہ یہ جواب ہی نہ دے سکیں۔ تو کیا کیا کہ جب ان کی قوم تہوار منانے شہر سے باہر نکل گئی تو ان کے تمام بتوں کو توڑ دیا اور جو بڑا بت تھا اسے چھوڑ دیا، اور جس کلہاڑے سے بتوں کو توڑا تھا اس کلہاڑے کو اس بڑے بت کے پاس رکھ دیا۔ اب لوگ آئے، کہنے لگے یہ کیا ہوا کہ سب خدا مارے گئے، جتنے خدا تھے کوئی زخمی پڑا ہے، کوئی مرا ہوا ہے، کیا حال ہو چکا ہے۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ بھئی اور تو کوئی بات نہیں

قَالُوۡا سَمِعۡنَافَتًی یَّذۡکُرُهُمۡ یُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِیۡمُ O (الانبیاء:۶۰)

ترجمہ: بعضوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان آدمی کو جس کو ابراھیمؑ کہہ کر پکارا جاتا ہے ان بتوں کا (برائی سے) تذکرہ کرتے سنا ہے۔

ایک لڑکا ہے جس کا نام ابراھیمؑ ہے، وہ ہمارے بتوں کو بُرے نام سے یاد کرتا تھا، ہو نہ ہو وہی ہوگا جس نے یہ کام کیا۔ حضرت ابراھیمؑ بلائے گئے، آپؑ کہنے لگے بھئی مجھے کیا پوچھتے ہو، ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ دل کا پکڑا جانا، آپ لوگوں کی بولی میں Red handed کہتے ہیں، اس بڑے بت کے ہاتھ میں تو کلہاڑا پکڑا ہے اس سے پوچھو جو تمہارا بڑا خدا ہے اسی نے مارا ہوگا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تو بات نہیں

کرسکتا۔ ابراھیم علیہ السلام کہنے لگے کہ تم کیسے کمبخت ہو کہ جو بات تک نہیں کرسکتا، جو سن نہیں سکتا تم نے اسے بڑا خدا بنا لیا ہے، اب کیا ہوا کہ سر جھکا لیا جواب تو نہ دے سکے، کیا جواب دیتے! وہ بت کوئی بات کرنے والا تھا؟ ابراھیمؑ نے وہاں پوری دعوت دی کہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمھیں نفع پہنچا سکے نہ نقصان پہنچا سکے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ہمارے ہاں اردو میں ایک محاورہ ہے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے، اور کچھ نہیں ہوسکا تو کہنے لگے آؤ اپنے بتوں کی مدد کریں۔ تو بتوں کی کیا مدد کرو گے؟ چلو ابراھیمؑ کے لیے آگ جلائی جائے اور بہت تیز آگ جلائی جائے، اب آگ کا انتظام کیا گیا اور بہت زیادہ لکڑیوں کو جلایا گیا اور یہاں تک کتابوں میں آتا ہے کہ اس کے لیے بہت دور دور سے کُنسؔ حبشہ کا ایک علاقہ ہے اس زمانے میں وہاں سے لکڑیاں لائی گئیں اور چھ مہینے تک تیاری کر کے اتنی بڑی آگ جلائی گئی کہ کوئی قریب نہیں جا سکتا تھا، قریب جانے کی ہمت نہیں تھی۔ حضرت ابراھیمؑ کو منجنیق یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک جھولا بنا کر اس میں بٹھایا گیا کہ آگ کے قریب کوئی جا نہیں سکتا تھا اس لیے منجنیق میں رکھ کر آگ میں بھیجا گیا۔

اب میں نے جو یہ بات کی اس لیے کی کہ حضرت ابراھیمؑ کے لیے ظاہر کے نقشے یہ ہو رہے تھے اور باطن کے نقشے سے ابتلاء ہو رہی تھی آزمائش ہو رہی تھی۔ بتوں کا توڑنا ذریعہ بنا اس آزمائش کا جس کے لیے کہ آگ میں ڈالے گئے۔ اب جس وقت کہ آگ میں ڈالے جا رہے ہیں اور جھولے میں رکھے گئے۔ اللہ کا ایک باطنی نظام قائم ہے جس میں اللہ کے فرشتے کام کرتے ہیں ایک ہے مَلک النّار (آگ کا فرشتہ) وہ بھاگا بھاگا حضرت ابراھیمؑ کے پاس آیا کہ میری مدد کی ضرورت ہو تو میں

مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کہنے لگے کیا اللہ کی طرف سے آئے ہو یا اپنی طرف سے آئے ہو؟ کہنے لگا میں بیتاب ہو کر دوڑا۔ کہنے لگے اگر تیری طرف سے یہ چیز ہے تو میں اس کے لیے تیار نہیں، جو کچھ بھی ہو گا میں نے اپنے کو اللہ کے سپرد کر دیا، میں اُس کا ہو چکا وہ دیکھ رہا ہے مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک موقع پر بیمار ہو گئے، کسی نے کہا طبیب کو نہیں بلاتے! کہنے لگے طبیب ہی نے تو بیمار کیا ہے، کونسے طبیب کو بلاؤں۔ اب اس کے بعد جبریل امین آ گئے۔ جبریلؑ کا تعلق تمام انبیاء کے ساتھ ہے اور حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصی مناسبت ہے۔ اب جس وقت جبریلؑ آتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ کوئی مدد کروں؟ کہنے لگے خود ہی آئے ہو یا بھجوائے گئے ہو؟ کہا کہ خود ہی آیا ہوں۔ تو کہنے لگے حسبی اللّٰہ لاالٰہ الا ھو مجھے اللہ کافی ہے، میں تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہوں۔ اسی دوران بالکل آگ کے دریا میں جا پہنچتے ہیں، ہم جیسا آدمی ہوتا تو گھبرا جاتا، وہ تو اپنے الفاظ کے پابند تھے کہہ چکے تھے

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَامِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○ (الانعام:۷۹)

ترجمہ: میں اپنا رُخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

خالق کو دیکھنا ہے، اگر جبریلؑ ہیں وہ بھی بنے ہوئے ہیں، زمین ہے وہ بھی بنی ہوئی ہے، آسمان بھی، آگ بھی بنے ہوئے ہیں، میں ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، اللہ دیکھ رہا ہے یہی کافی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قربانی کے اس پہلے منظر کو دیکھا،

اللہ تبارک وتعالیٰ کو پیار آیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود کہا، قرآن کہتا ہے

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ ○ (الانبیاء:۶۹)

ترجمہ: ہم نے (آگ) کو حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابراھیمؑ کے حق میں۔

یعنی خود امر الٰہی سے بغیر سبب کے واسطے کے آگ کو حکم دیا گیا کہ تو ٹھنڈی ہو جا گلزار ہو جا اور آگ ٹھنڈی ہوئی اور جب یہ ٹھنڈی ہوگئی تو ابراھیمؑ بچ گئے۔ حضرت ابراھیمؑ کا لمبا قصہ ہو گیا میں نے حج پر آنا ہے۔ بہر حال اب نتیجہ یہ ہوا کہ اس آگ کو دیکھ کر وہاں کے بادشاہ نمرود کی بیٹی آئی اور مسلمان ہوگئی۔ اس کا نام سارہؓ تھا، سارہؓ مسلمان ہوگئیں جس سے قصر شاہی میں ہلچل مچ گئی، اب ایسے شخص کو کون چھوڑ سکتا ہے، ان دنوں میں تو جو بھی ہوتا تھا، اب اس زمانے میں بھی دیکھ لیں۔ بہر حال اب برداشت تو ہو نہیں سکتی تھی تو ہر طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ اللہ کا حکم ہوا کہ بھئی تم نکل جاؤ۔ یہ بیوی کو لے کر نکلے اور شام کی طرف اور پھر مصر کی طرف چلے گئے، لمبے واقعات ہیں۔ تین ملکوں میں خصوصیت ہے، آجکل تو پانچ چھ ہو جاتے ہیں لیکن اس وقت تین ملک کہلائے جاتے تھے۔ عراق سے نکلے ہیں اور شام کا علاقہ طے کرتے ہوئے اردن کے شمال میں جہاں کہ آجکل بیت المقدس ہے پہنچے ہیں اور وہاں سے ہوتے ہوئے مصر گئے ہیں۔ مصر میں اس زمانے میں ''حسوس'' بادشاہ تھے، اصل میں گڈریے تھے۔ ''حسوس'' گڈریے کو کہتے ہیں، وہ قوم آباد تھی اور پہلا فرعون وہاں موجود تھا۔ جس وقت یہ وہاں پہنچے تو ان کا کام تو دعوت دینا تھا بادشاہ کے پاس توحید کی دعوت دینے کے لیے گئے۔ توحید کی جب دعوت دینے گئے تو ان

کے ساتھ تھیں حضرت سارہؓ ، بادشاہ کے دل میں بدنیتی آئی ، ہاتھ اٹھانا چاہا، بخاری شریف کی روایت ہے کہ ہاتھ شل ہوگیا، دوبارہ ارادہ کیا سہ بارہ ارادہ کیا ہر بار اس کا ہاتھ شل ہوگیا۔ اس پر اور تو کچھ نہیں کرسکا، ایمان تو نہیں لایا لیکن خدمت کے لیے ایک عورت دے دی جس کا نام حضرت ہاجرہؓ ہے۔ ہاجرہؓ کو لے کر حضرت ابراھیمؑ چلے، حضرت ہاجرہؓ کی اولاد ہوئی جن کا نام حضرت اسماعیلؑ ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہوا کہ تم جاؤ اور اس بچے کو اس جگہ پر چھوڑ آؤ جہاں پہلا گھر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراھیمؑ کو وہ ٹھکانہ بتایا جہاں کہ اللہ کا پہلا گھر تھا۔ کعبۃ اللہ قرآن کے نزدیک اور احادیث کے نزدیک وہ سب سے پہلا مقام ہے جو دنیا میں اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا بلکہ ہماری کتابوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ زمین کی جو پیدائش ہوئی ہے اس کی بنیاد کعبۃ اللہ پر ہے۔ کعبۃ اللہ سے ہی زمین کا بُلبلہ اٹھا اور زمین بنی اور پھر پھیلا دی گئی، ابتدا کعبۃ اللہ کی جگہ سے ہوئی ہے۔ بہرحال وہاں اللہ نے اپنا پہلا گھر بنایا۔ پہلا گھر بنانے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان میں یہ اٹھالیا گیا اور اس کے بعد یہ پھر جمایا گیا لیکن بعد کی قوموں نے اسے مٹا دیا، نشان باقی نہیں تھے لیکن زمین میں اس کی بنیادیں موجود تھیں۔ جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا حضرت اسماعیلؑ کو بھجوایا تو ابراھیمؑ نے انھیں وہاں پہنچا دیا اور قرآن کہتا ہے

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراھیم: ۳۷)

ترجمہ: اے ہمارے ربّ میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے قریب

ایک (کف دست) میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے
ہمارے ربّ تاکہ وہ لوگ نماز کا اہتمام کریں۔

اب ایسی بے آب وگیاہ جگہ ہے، جہاں کچھ بھی اُگتا وغیرہ نہیں ہے وہاں جا کر انھوں نے اپنے بچے کو ڈالا اور بچے کو ڈالنے کے بعد یہ وہاں سے نکلے۔ کیونکہ حکم تھا کہ چھوڑتے ہی وہاں سے چلے آؤ۔ اب آپ اندازہ کیجئے جو کہ بیت اللہ شریف جا چکے ہیں انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بیت اللہ شریف کے چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں درمیان میں تھوڑی سی نشیبی جگہ ہے۔ اب جہاں کھانے کو کچھ ہے اور نہ پینے کو، ایک جوان عورت ہے اور ایک چھوٹا سا شیر خوار بچہ ہے انھیں چھوڑا جا رہا ہے۔ انھیں چھوڑنے کے بعد جب واپس ہونے لگے تو حضرت ہاجرہؑ نے کہا بخاری شریف کے الفاظ ہیں، اے ابراھیمؑ ہمیں کس کے بھروسے پر چھوڑے جا رہے ہو؟ **أامرت بھذا یا ابراھیم** کیا اس چیز کا ابراھیمؑ تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ آپ ہمیں ایسی بے آب وگیاہ جگہ پر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ حضرت ہاجرہؑ کے الفاظ بڑے عجیب الفاظ ہیں کہنے لگیں تب اللہ ہرگز ہمیں ضائع نہیں کرے گا...... نہ کھانے کو ہے نہ پینے کو ہے لیکن جو اُس کے اَمر پر کسی جگہ بھی ڈال دیے جاتے ہیں، اللہ کے حکم پر ڈالے جانے والوں کو ہلاک نہیں کیا جاتا...... اب جوان عورت اور بچے کو چھوڑ کر یہ چلے گئے، اب انھیں پانی کی پریشانی ہوئی، روٹی کے بغیر تو ایک دو دن گزارہ ہوسکتا ہے کھجوریں تھیں تھوڑی سی، لیکن پانی کے لیے کیا کریں؟ کبھی ادھر دوڑتی ہیں صفا ومروہ کی پہاڑی پر کبھی ادھر، کبھی ادھر آتی ہیں کبھی ادھر جاتی ہیں یہاں تک کہ ساتواں چکر لگانے کے بعد جس جگہ بچے نے ٹانگیں ماری

تھیں اس جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کو بھیجا اور اس جگہ ایک چشمہ پھوٹ پڑا جسے زمزم کا چشمہ کہتے ہیں۔ زم زم کا چشمہ اس لیے اسے کہتے ہیں کہ یہ پانی بہت تیزی سے نکلا اب یہ گھبرا گئیں کہ ممکن ہے پانی نکلا ہے کہیں بہہ کر ختم نہ ہو جائے، حضرت ہاجرہؓ نے اس کے گرد مٹی سے کنارہ باندھنا شروع کر دیا کہ پانی کہیں نکل نہ جائے اور کہنے لگیں زم زم زم زم، رُک رُک رُک رُک۔ جب انھوں نے یوں کہنا شروع کر دیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ابراھیمؑ اور ہاجرہؓ کی قربانی پر اللہ کی رحمت کو اتنا جوش آیا تھا کہ اللہ رحمت کرے ہاجرہؓ پر کہ اگر وہ پانی کو نہ روک لیتیں تو وہ تمام دنیا میں بہنے والا بن جاتا۔ اب بھی دیکھئے میرا خیال ہے آپ میں کئی لوگ ہوں گے جنھوں نے زم زم کا پانی پیا ہوگا، یہاں رہتے ہوئے بھی پیا ہوگا، زم زم اب بھی تمام دنیا میں پہنچتا ہے اور اس چشمے کو نکلے ہوئے چار ہزار سال ہو گئے ہیں۔ بہرحال یہ چشمہ نکلا، پانی پینا شروع کیا اور وہاں رہنے لگیں۔

اب اس کے کچھ عرصے کے بعد یہ ہوا کہ پھر حضرت ابراھیمؑ آئے اور ایک اور واقعہ پیش آتا ہے۔ اب حضرت اسماعیلؑ جوان ہو گئے، پہلے تو یہ نوعیت تھی کہ بھئی بچے کو جا کر چھوڑ آؤ۔ اب پال کر دکھایا، جب کچھ چلنے پھرنے کے لائق ہوئے تو ابراھیمؑ کی پھر آزمائش ہوئی۔ جاؤ ابراھیم! کس لیے جاؤ؟ بیٹے کی قربانی کرو، بیٹے کو ذبح کر دو۔ اب ابراھیمؑ آتے ہیں اور اسماعیلؑ کو کہتے ہیں جو جوان ہو رہے ہیں ابتدائی جوانی کی عمر ہے، کہتے ہیں اے اسماعیلؑ! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں،

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ

اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰی ط (الصافات:۱۰۲)

ترجمہ: سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراھیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراھیمؑ نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامرالٰہی) ذبح کررہا ہوں، سوتم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

تمہاری کیا رائے ہے؟......ذبح کرنا چاہتا ہوں، تمہاری کیا رائے ہے؟ ......انبیاء کرام کے خواب بھی وحی کی ایک قسم ہے اور وحی ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے اس خواب کو خواب نہیں سمجھا بلکہ اللہ کا حکم سمجھا اور اسماعیلؑ سے پوچھا۔ اب جو اُن سے پوچھا گیا تو بیٹا بھی تو باپ کا بیٹا تھا بقول اقبال کے ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

کہتے ہیں بیٹا میں تمھیں ذبح کرتا ہوں! جواب ملتا ہے کرلیجئے۔ باپ کو سبق پڑھایا جارہا ہے ابّا جان اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئے کہیں میرا چہرہ دکھائی دے اور شفقت پدری جوش میں آجائے اور آپ ذبح نہ کرسکیں۔ اب کیا ہوتا ہے؟

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ O (الصافات:۱۰۳)

ترجمہ: دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کرلیا اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لیے) کروٹ پر لٹایا۔

جس وقت دونوں حکمِ خداوندی کو مانتے ہیں اور چہرے کے بل ڈال دیتے ہیں اور اسماعیلؑ کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ اس چیز کا اندازہ کیجئے کہ جو انبیاء ہوتے ہیں وہ بہت ہی نرم و نازک ہوتے ہیں۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق آتا ہے کہ صحابہؓ کہتے ہیں ہم حضورؐ کے ہاتھوں کو دیکھتے تھے تو ہم نہیں سمجھتے تھے کہ ریشم زیادہ نرم ہے یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیاں زیادہ نرم ہیں۔ تو اب وہ بچہ ہے اس کی گردن پر وہ چھری کھینچی جا رہی ہے، ایک دفعہ پھیری دو دفعہ پھیری رونگٹہ تک نہیں کٹتا، غصّے میں آکر چھری کو پتھر پر مارا تو پتھر پھٹ گیا لیکن گردن نہیں کٹتی۔ میں بعض اوقات یہ سوچا کروں کہ حقیقت میں جتنی دفعہ چھری پھیری ہے اتنی ہی مرتبہ اللہ نے حضرت ابراھیمؑ کو اسماعیلؑ کی قربانی کا ثواب دیا ہے، کیونکہ اپنے اکلوتے بیٹے جو کہ بڑھاپے کی اولاد ہے کی گردن پر چھری پھیرنا آسان بات نہیں۔ ایک دفعہ تو چلو ٹھیک ہے کر لیا، نہیں ...... بلکہ بار بار دیکھا جا رہا تھا، یہ چھری حقیقت میں بیٹے کی گردن پر نہیں پھر رہی تھی، یہ ابراھیمؑ کے دل پر پھر رہی تھی اور دیکھا جا رہا تھا کہ ابراھیمؑ کس طور پر قربانی کے کرنے والے ہیں، جس وقت کہ قربانی کو پورا کر لیا اور گردن نہیں کٹی تو اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور جنت سے دُنبہ آ گیا اور دنبے کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرا دیا اور فرما دیا

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ج (الصافات:۱۰۵)

ترجمہ: تو نے تو اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔

وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ O (الصافات:۱۰۷)

ترجمہ: اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا۔

ہم نے اس کے فدیے میں ایک بڑی قربانی کو کروا دیا ہے

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ O (الصافات:۱۰۸)

ترجمہ: اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لیے رہنے دی۔

اور جو آنے والے ہیں پچھلے لوگ یعنی امت محمد یہ مرحومہ اس کے لیے ہم نے اس کو چھوڑ دیا۔ خیر اب وہ قربانی کی ایک چیز قائم ہوگئی ۔ یہ میں کچھ بنیادی طور پر باتیں بتا رہا ہوں ۔ اب اس کے بعد دیکھئے، کچھ دن گزرے تو حکم ہوا کہ اے ابراھیم جاؤ اور ہمارے گھر کو بلند کرو۔ یعنی مقصد کعبۃ اللہ بنانے کا تھا ۔ اس وقت سیدنا ابراھیم علیٰ نبینا الصّلوٰۃ والسّلام کو حکم ہوا اور یہ باپ اور بیٹا دونوں معمار بن گئے

ع معمار حرم باز و تعمیر جہاں خیز

قرآن کہتا ہے

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط (البقرۃ:۱۲۷)

ترجمہ: جس وقت کہ اٹھا رہے تھے ابراھیم اور اسماعیل دونوں مل کر کعبۃ اللہ کی دیواروں کی بنیادوں کو۔

یعنی بنیادیں تو ٹھیک تھیں ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ دیکھو یہ جگہ تو وہی ہے اس کے اوپر اب تم دیواروں کو اٹھاؤ۔ اب ایک پتھر تھا جس کے اوپر ابراھیم خلیل اللہ کھڑے ہو کر بناتے تھے اور اللہ کی قدرت سے قبلہ جتنا اونچا ہوتا جاتا تھا یہ پتھر اونچا ہوتا جاتا تھا، یہ معجزہ ہے ابراھیمؑ کا۔ ابراھیمؑ کے قدموں کے نشان اب بھی مقامِ ابراھیم میں ثبت ہیں اور موجود ہیں ۔ اسے مقامِ ابراھیم کہتے ہیں اور قرآن نے بھی کہا ہے مقام ابراھیم کو اپنی نماز کی جگہ بناؤ۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ط (البقرہ:۱۲۵)

ترجمہ: اور مقامِ ابراھیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو۔

اور اب بھی جو حاجی جاتے ہیں اور وہ طواف کر لیتے ہیں تو اس کے بعد دو

رکعت نفل پڑھنی ہوتی ہیں جو کہ واجب ہیں، مقامِ ابراھیم کے قریب جا کر پڑھتے ہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انھوں نے کعبۃ اللہ کو بنا لیا۔اب جب کعبۃ اللہ بن گیا تو پھر ابراھیمؑ کو حکم ہوا...... باتیں کافی ہیں ابراھیمؑ کے بارے میں کہ اگر میں چلتا رہوں تو تین چار گھنٹے لگیں گے، بہت ساری چیزوں کو چھوڑتا ہوں ......اس کے بعد جب یہ کعبۃ اللہ بن گیا تو ابراھیمؑ کو حکم ہوا

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (الحج:۲۷)

ترجمہ: لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔

اے ابراھیمؑ آواز دے لوگوں میں تاکہ وہ حج کے لیے اللہ کے گھر کی طرف آئیں۔اب کس طرح آئیں؟ ......وہ لبیک کہتے ہوئے آئیں گے، قرآن کے الفاظ ہیں،

یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ O (الحج:۲۷)

ترجمہ: لوگ تمہارے پاس (حج کو) چلے آویں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

وہ آئیں گے دبلی دبلی اونٹنیوں پر بھی اور پیدل چل کر بھی دور دور سے اس گھر تک آئیں گے تاکہ اس پرانے گھر کا حج بھی کرلیں، اور اپنی گندگیوں اور کثافتوں کو بھی یعنی گناہوں کی گندگیوں اور کثافتوں کو بھی اتاریں اور یہاں آکر اللہ کے لیے قربانی کو بھی پورا کریں۔

اب ابراھیم علیہ السلام نے آواز دی اور آواز جس وقت دی تو جیسے نماز کی اَذان ہے یہ حج کی اَذان تھی۔تو روایات میں آتا ہے کہ عالمِ ارواح تک اس آواز کو

پہنچایا گیا، جس شخص نے عالم ارواح میں ایک دفعہ لبیک کہا وہ ایک دفعہ حج کر لے گا، جس نے دو دفعہ لبیک کہا وہ دو دفعہ کر لے گا جس نے تین دفعہ لبیک کہا وہ تین دفعہ کر لے گا، چاہے ہزار تم پابندیاں لگا دو، جن کے نصیبے میں ہے وہ پہنچ کر رہیں گے، جنھوں نے جانا ہے انھوں نے تو جا کر رہنا ہے، تمہارے باپ کی میراث نہیں یا یہ نہیں کہ تم کسی کو روک سکو، یہ خدا کا گھر ہے اور ابراھیمؑ اس کے مؤذن ہیں اور ابراھیمؑ کی آواز پر پہنچا جاتا ہے۔ جس نے بھی وہاں جانا ہے چھت پھاڑ کر اسے پہنچا دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے پہنچا دیتا ہے۔ فقرا میں ہمیں بعضے ایسے حضرات معلوم ہیں جن کا کوئی ظاہری سامان نہیں ہوتا لیکن وہ ہر سال حج پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا ہوتا ہے؟...... ایک اندر کی لگن ہوتی ہے اور یہ لگن کا قصہ ہوتا ہے۔

بہر حال بات دوسری طرف جانے لگی اب کیا ہوا کہ حج کی اللہ تبارک و تعالیٰ نے آواز دلوا دی تو یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارا دین صرف رسموں والا دین نہیں بلکہ قرآنِ کریم میں آتا ہے مؤمنین کے متعلق ایک بات بیان کی گئی ہے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرہ۔۱۶۵)

ترجمہ: وہ لوگ جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے

المؤمن الف مالوف ولا خیر فیمن لا یالف ولا یولف (طبرانی، احمد)

ترجمہ: مؤمن الفت کرتا ہے اور الفت کیا جاتا ہے اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو نہ

محبت کرتا ہو اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہو۔

مؤمن ایمان سے ڈھلتا ہے اور اللہ کے عشق و محبت سے بڑھتا ہے اور ابراھیمؑ کا عشق آپ دیکھ چکے ہیں، ابراھیمؑ نے اللہ کے عشق میں اپنے وطن کو چھوڑا، اپنے بچے کو ذبح کیا اور جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے کیا۔ اب اس کے بعد بڑی چیز یہ تھی کہ پہلے زمانے میں جیسے کہ قربانی دینے کی ایک نوعیت تھی وہ یہ تھی کہ جواَب مثال کے طور پر ہمارے ہاں بھی ہے، کہا کرتے ہیں کہ تمہارے قربان جائیں اور پشتو میں جو ریڈیو پر ہوتا ہے واقربان وہ تو ہے ہی واقربان۔ عین وہ تمام کے تمام واقربان والے قصے، اور واقربان کا جتنا بھی تعلق ہے یہ حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے اندر ایک حس رکھی ہے یہ پانچ حواس جو ہیں یہ تو ظاہر والے ہیں، بقول مولانا رومؒ کے اللہ نے پانچ حواسِ باطنی بھی رکھے ہیں۔ اور ان پانچوں حواسِ باطنی کی جڑ اللہ کی محبت اور اللہ کا عشق ہے۔ تو اب عشقِ الٰہی کی جو آگ انسان کے سینے میں جلتی ہے، تو جیسے کہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے محبوب پر میں اپنے آپ کو قربان کر دوں، تو خداوند قدوس کی ذاتِ عالی کوئی ایسی ذات نہیں کہ وہ یہاں آکر تمہارے سامنے نمایاں ہو جائے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ کو جو کہ اللہ کی عبادت کے لیے پہلا گھر بنا اور جہاں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازل سے اپنی تجلیات کو اور اپنی برکات کو ڈالا، حدیث میں آتا ہے کہ کعبۃ اللہ پر ہر وقت اللہ کی ایک سو بیس رحمتیں اترتی رہتی ہیں، اور ان رحمتوں میں سے ساٹھ رحمتیں تو طواف کرنے والوں کو ملتی ہیں، اور چالیس وہاں نماز پڑھنے والوں کو ملتی ہیں اور بیس جو کعبہ کی طرف صرف دیکھتے رہتے ہیں ان کو ملتی ہیں۔ میں بعض اوقات کہا کروں کعبۃ اللہ

کو دیکھو تو ایسا مزہ آتا ہے، لطف آتا ہے، اندھیری رات میں بیٹھ کر دیکھو، بات تو ٹھیک نہیں، لیکن نئی نویلی دلہن میں بھی وہ حسن نہیں ہوتا جو کہ کعبۃ اللہ کے سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے اس چوکور گھر میں ہوتا ہے، یعنی انسان کے اندر ایک قسم کا نور ہی نور اور سرور ہی سرور آتا چلا جاتا ہے، جی بھرتا نہیں کہ اس سے آدمی نگاہ کو ہٹائے۔ ایک مقام پر مولانا رومؒ نے کہا ہے

کعبہ را ہر دم تجلی می فزوں
زین کہ اخلاص ابراھیمؑ بود

کعبہ کی ہر دم تجلیاں بڑھتی ہیں، اور یہ سب ابراھیمؑ کے اخلاص کی برکت ہے۔ میں بعض اوقات کہا کروں، دیکھئے پتہ نہیں قربانی کا گوشت آپ کتنا کھاتے ہوں گے، قربانی کا گوشت عام گوشت کی طرح زیادہ نہیں کھایا جاتا، میں کہا کروں کہ اس گوشت میں بھی ابراھیمؑ کی مستی آگئی ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام کے عشقِ الٰہی کی جو مستی تھی جو چیز بھی ان کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے اس میں وہی رنگ ہوتا ہے۔ دوسرا گوشت آپ زیادہ کھالیں گے، آپ آزما کر ایک دفعہ دیکھ لیں، لیکن قربانی کا گوشت اتنا نہیں کھایا جا سکتا جتنا کہ دوسرا، اس میں ایک خاص قسم کا مزہ ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کا نشہ ہوتا ہے، وہ نشہ عشقِ الٰہی کا نشہ ہوتا ہے، حضرت ابراھیمؑ کے زمانے سے وہ چلا اور چلا آرہا ہے۔

بہر حال حج کی عبادت عاشقانہ عبادت ہے۔ انسان کی زندگی میں ایک آخری چیز ہوتی ہے جو کہ عبد کو معبود پر قربان کروا دینے والی ہوتی ہے۔ اس بناء پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنے بھی حج کے مناظر قائم کیے ہیں وہ سب کے سب عاشقانہ

مراسم ہیں، جیسے کہ شمع کے گرد پروانہ پھرتا ہے! دیکھا ہوگا آپ نے قربان ہو جاتا ہے، اب خدا کی ذات تو سامنے آتی نہیں لیکن اس نے اپنے گھر کو مقصد قرار دیا جس گھر پر ہر آن اس کی تجلیات ہوتی رہتی ہیں۔ صوفیاء نے لکھا ہے ان کی اپنی اصطلاح ہے کعبۃ اللہ، اللہ کی تجلیات کا ''سمت القدم'' ہے، ان کی اصطلاح ہے بالکل جیسے اوپر سے رحمتیں اترتی ہیں وہ سیدھی آ کر کعبۃ اللہ پر اترتی ہیں اور اس میں ایک بات اور بھی عرض کر دوں غیر متعلق غالباً نہیں ہوگی، قرآن میں ایک لفظ آتا ہے ''مَثَابَةً'' ہم نے کعبہ کو ''مَثَابَةً'' بنایا، ''مَثَابَةً'' کا ''مرجع'' کا بھی معنی کیا گیا ہے، جہاں پر لوٹ کر آدمی آئے اور اصل میں مثابۃ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں آپ نے دیہاتوں میں دیکھا ہوگا اردو میں اسے کہتے ہیں ''پنگھٹ''، پانی بھرنے کی جگہ، گاؤں والے جو ہوتے ہیں وہ سب کے سب پانی بھرنے کی جگہ جاتے ہیں اور اپنی پیاس وہاں آ کر بجھاتے ہیں، اسی طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کعبے کو ایسا مرکز قرار دے دیا ہے جس مرکز پر پہنچ کر جیسے پانی سے انسان کے دل کی پیاس بجھتی ہے اسی طور پر دل کی محبت کی پیاس اس کعبہ پر جا کر بجھتی ہے۔ انسان کے دل کی تسلی کاملاً نہیں ہوتی جب تک کہ انسان کعبہ تک پہنچ نہ جائے، یعنی یہ اللہ کی رحمتوں کا پنگھٹ ہے، اللہ کی رحمتوں کے اترنے کی جگہ ہے۔ اب مثال کے طور پر آپ نماز پڑھتے ہیں، پانچ وقت آپ نماز پڑھتے ہیں کعبۃ اللہ کی طرف آپ کو کیوں توجہ کرنے کا کہا گیا؟ ویسے تو قرآن میں آتا ہے

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط (البقرۃ:۱۱۵)

ترجمہ: اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب سمتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی، تم لوگ جس

طرف منہ کرو ادھر (ہی) اللہ تعالیٰ کا رُخ ہے۔

جہاں بھی چہرہ کرو گے خدا کی ذات ادھر ہے لیکن اللہ کی حکمت نے یوں چاہا کہ کعبے کی طرف آپ جب چہرہ کریں گے آپ جب رُخ کریں گے تو وہاں کی تجلیات اتر اتر کر آپ کے سینے پر آکر پڑیں گی، آپ اگر یوں کہیں کہ کیسے اتنے دور سے تجلیات آتی ہیں؟ آجکل غالباً راڈار سسٹم کہتے ہیں کتنے دور دور سے ہوائی جہاز جو پہاڑوں کے پیچھے چل رہا ہوتا ہے اس کی شکل لے لیتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کہا ہے

ع بُعدِ منزل نہ بود در سفر روحانی

ترجمہ: روحانی سفر میں تو بُعد ہوتا ہی نہیں۔

اگر آپ کا دل کھلا ہوا ہے، سینہ کھلا ہوا ہے تو آپ اپنے قلب پر اس تاثر کو محسوس کر لیں گے۔ جیسے کہ دیکھئے ایکسرے کے لیے آپ جا کر لیٹتے ہیں تو آپ کی ہڈیوں کے اندر کی چیزیں نمایاں ہو جاتی ہیں اس کی شعائیں آپ کے اندر تک جا پہنچتی ہیں۔ اسی طرح دوستو! آپ یقین کیجئے کہ اگر آپ کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو جائیں تو کعبہ کی شعائیں آپ کے دل پر آئیں گی اور اگر آپ اپنے دل کو فوکس کر لیں، جیسے کہ فوٹو والے کرتے ہیں، آپ فوکس کریں اپنے دل کو خدا کی طرف اور کعبہ کی طرف تو کعبے کی تجلیات وہاں سے آکر آپ کے دل پر پڑیں گی۔ یہاں تک کہ اپنوں کو تو چھوڑ یئے ''ہیٹی'' موجودہ زمانے کا بہت بڑا رائٹر ہے اس نے اپنی کتاب "The History of Arabs" میں لکھا ہے کہ اگر ہم کعبۃ اللہ کو دیکھیں تو ایک ایسا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے جس کے گرد اگرد دائرے کھینچتے چلے جائیں تو تمام

دنیا کے مسلمان اس میں آ جائیں گے، دائرے کھینچتے چلے جائیں، کعبہ کے گرد کا دائرہ پھر دائرے پھر دائرے، تمام دنیا کے دائرے کعبہ کی طرف ہیں ۔ اور کعبہ میں یوں کہوں، دیکھو! یہ اور نکتے کی بات ہے، طوافِ کعبہ کسی وقت بھی بند نہیں ہوتا رات کو بھی ہوتا ہے دن کو بھی ہوتا ہے آپ کسی وقت بھی اگر وہاں چوبیس گھنٹے رہ کر دیکھیں کعبۃ اللہ کسی وقت بھی ایسا نہیں ہوگا کہ وہاں طواف نہ کیا جا رہا ہو۔ ۱۹۵۴ء میں پانی کا بہت بڑا سیلاب آیا۔ مولوی سعید خان صاحب وہاں موجود تھے، کہتے ہیں اس وقت ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کئی لوگ سیلاب میں طواف کر رہے تھے۔ بس جب عشق ہے تو عشق میں کیسے انسان چھوڑے، چکر پر چکر لگا رہے ہیں ۔ تو جس طور پر کعبۃ اللہ طواف سے کسی وقت میں خالی نہیں ہوتا اسی طور پر میں یوں کہتا ہوں کہ

ع تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے!

تو کعبہ ہر وقت جبینوں سے بھی بسا ہوا ہے ۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ نماز کے اوقات مختلف منطقوں میں مختلف ہوتے ہیں، اب تمام دنیا کے اوقات کو لے لو تو کوئی وقت ایسا نہیں رہے گا کہ جس میں نماز نہ پڑھی جا رہی ہو۔ تو ہر وقت کعبے کی طرف لوگوں کی جبینیں جھکی ہوئی ہیں ۔ تو یہ کعبہ اللہ نے ایسی جگہ بنا دی کہ اوپر سے بھی رحمتیں نازل کرتا ہے، لوگوں کو بھی اس کی طرف جھکواتا ہے، یہ اللہ سے لینے کا ایک مرکزی آلہ ہے ۔ بلکہ حضرت آدم بنوریؒ، حضرت مجدد سرہندیؒ کے خلفاء میں سے گزرے ہیں وہ اپنے مکتوبات میں ایک مقام پر هُدًى لِّلنَّاسِ کی تشریح میں لکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ کعبہ مستقلاً ذریعۂ ھدایت ہے، اگر اس کعبے پر انسان جاتا رہے اور وہاں دین کے احکام ادا کرتا رہے تو کعبۃ اللہ سے مستقلاً انسان کے دل پر تجلیات آ کر گرتی ہیں ۔

جیسے کہ اہل اللہ ہوتے ہیں وہ خود مرکز ھدایت بن جاتے ہیں، ان کے دلوں کا نور آ کر دوسروں کے دلوں پر پڑتا ہے، اسی طور پر کعبہ کے مرکز سے دوسرے انسانوں کے دلوں پر ھدایت پڑتی ہے۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں چاہا کہ اس امت کو نوازے، جیسے دوسری امتوں کو نوازا اسی طور پر اس امت کو انتہائی عبادت کے ساتھ نوازے، تو اب اس کے لیے یوں چاہا کہ وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو اللہ کے خلیل ابراھیمؑ کا طریقہ ہے۔ حج کی چند موٹی موٹی چیزیں ہیں اور پہلی چیز یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں دین میں کسی ایسی بات کو نہیں رکھا گیا جو آپ پر مشکل ہو۔ حج اس پر فرض کیا گیا جو کہ کعبۃ اللہ تک پہنچ سکے، اگر آپ کسی وقت پہنچ جاتے ہیں تو آپ پر حج فرض ہے اور اگر نہیں پہنچ سکتے تو آپ پر فرض نہیں ہے، لیکن اگر آپ کے پاس کعبۃ اللہ تک پہنچنے کی استطاعت ہے تو آپ پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ یہ عبادت دین ابراھیمی اور دین محمدی کا خاص نشان ہے، اور وہاں کی جتنی بھی چیزیں ہیں وہ قابلِ تعظیم ہیں اور ان کی تعظیم کرنا تقویٰ کی نشانی ہے، قرآن کہتا ہے

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ O (الحج:۳۲)

ترجمہ: جو شخص دین خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

جو کہ میری نشانیوں کی یعنی کعبہ ہوا، صفا مروہ ہوئے اور وہاں کی جتنی بھی چیزیں ہیں کی عزت کرتا ہے یہ ان کے دلوں کے تقویٰ، اللہ کے لحاظ اور اللہ کے ڈر کی اللہ کے تعلق کی نشانی ہے۔ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی ہر چیز کے ساتھ انسان کو محبت

اورعظمت ہوتی ہے۔ جتنے بھی شعائر اللہ ہیں کعبۃ اللہ اور دوسری چیزیں ان سے مسلمان کوایک خصوصی تعلق ہوتا ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کررہا تھا کہ حج فرض ہے ہراس شخص پر جو وہاں تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔حقیقت یہ ہے کہ ہم اس بارے میں بہت زیادہ کوتاہی کررہے ہیں، میں بعض اوقات سوچوں کہ ہم تو ''بے کار'' لوگ ہیں یہ جو کار والے ہوتے ہیں ان پر حج فرض نہیں؟...... کار خرید سکتے ہیں دس پندرہ ہزار کی اور حج پر نہیں جاسکتے؟...... بارہ سو میں تیرہ سو میں یا سترہ سو میں اچھا حج ہوجاتا ہے۔ تیرہ سو ساٹھ اس لیے کہا کہ کم ازکم نصاب چھپا تھا۔سترہ سو ساٹھ میں اچھا حج ہوجاتا ہے۔ میں تو ایک بات کہوں مجھے تو یوں دکھائی دے کہ حج تو مفت ہی ہوجاتا ہے، حدیث میں آتا ہے

اَلْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰہِ (ابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ: فضائل حج)

ترجمہ: حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ جل شانہ کا وفد ہیں۔

یہ حجاج اور عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہیں۔ یہ میں کس رخ سے کہوں؟ دیکھئے آپ جاتے ہیں یہاں سے، ہم جس زمانے میں گئے تھے، غریب لوگ ہیں پر گئے تھے، تو گیارہ سو روپے ہمیں وہاں کرنسی ملی تھی گیارہ سو ہمیں ریال ملے، یہاں ہم نے جتنے بھی داخل کیے ستانوے فیصد کے حساب سے وہاں کرنسی ملتی تھی، ہمارا دس آدمیوں کا قافلہ تھا۔ ہم نے اپنا بہت اچھا خرچہ کیا، چارسو ریال ہم نے اکٹھے کیے، اکٹھا پکاتے تھے خوب دعوتیں کرتے تھے، وہاں کے علماء کبھی ہماری دعوتیں کریں کبھی ہم ان کی کریں، خوب مزیدار وقت گزارا، چار چار سو ریال ہم نے وہاں خرچ کیے

اور سات سات سو ریال ہمارے تقریباً بچ گئے ، میں وہاں سے تقریبا ساڑھے تین ہزار کی کتابیں لایا، ساڑھے سات من کتابیں میں وہاں سے لایا۔ اب یہ دیکھئے اس میں نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہاں آپ کو جو کرنسی ملتی ہے ریال، آپ کا ریال یہاں دو روپے میں بِکتا ہے،تو جتنی آپ کو کرنسی ملی ایک کے دو ہو گئے یا نہیں ہو گئے۔ پھر اس کے بعد میں یہ نہیں کہتا کہ ناجائز طور پر آپ وہاں سے چیزیں لائیں لیکن جو انھوں نے لسٹ بنا کر دی ہوئی ہوتی ہے کہ اتنی چیزیں تم واپس ساتھ لے جا سکتے ہو تو اگر وہ چیزیں آپ لے کر آئیں تو ان کی قیمت جو پاکستان میں ہے موجودہ دور میں اتنی قیمت کی وہ چیزیں تمہارے گھر میں آجاتی ہیں،تو وہاں کا جانا آنا یہ سب مفت ہے کچھ بھی وہاں خرچہ نہیں، سیر مفت ہی ہو جاتی ہے۔ حج مفت ہے لیکن یہ کہ شیطان نکلنے نہیں دیتا، کہتا ہے پیسے نہیں، حکومت کے سر پر بھی ایسا شیطان نے ڈنڈا مارا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آتی کہ صحیح رخ سے سوچ سکیں۔ آپ کو ایک واقعہ سناؤں حاجیوں پر پہلے ٹیکس ہوتا تھا ،شاہ ابن سعود نے جس دن ٹیکس معاف کیا اسی دن دیکھا گیا کہ شاہ سعود کو ایک تار آیا، یہ جو دہراؔن کے تیل کے چشمے ہیں ادھر اس نے اعلان کیا ٹیکس کی معافی کا ادھر وہاں تیل کے چشمے جاری ہو گئے۔ خداوند قدوس تو کہتا ہے کہ تم اپنی تھیلی کے منہ کو بند نہ کرو تو میں میں تم پر اپنی عطا کو بند نہیں کروں گا۔ حج کی عبادت تو ایسی چیز تھی کہ جس کے لیے جان بھی قربان کر دو، مال بھی قربان کر دو، سر بھی قربان کر دو۔ کہتے ہیں بھئی فارن ایکسچینج کیسے آئے گا؟ ستیاناس ہو اس فارن ایکسچینج کا، اور تمام چیزوں کے لیے آتا ہے، نہیں آتا تو حج کے لیے نہیں آتا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ سرکاری ملازمین ہیں ۔

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

حق بات کو کیسے چھپاؤں! دوستو دیکھو! یہ کہتے ہیں کہ پابندی لگا دی جائے، پابندی کتنے سالوں سے لگی چلی آ رہی ہے، اگر اس پابندی کو ہٹا دیا جائے تو زیادہ سے زیادہ دو سال ذرا بوجھ ہوگا پچاس ہزار آدمیوں کا، پچاس ہزار ایک سال پچاس ہزار دوسرے سال اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، اس کے بعد بالکل symmetry میں معاملہ چلے گا۔ پچیس ہزار آدمی اب بھی جاتے ہیں آپ پندرہ سولہ ہزار بھیجتے ہیں، دوسرے رخوں سے خدا انھیں جیسے پہنچاتا ہے پہنچا دیتا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ فارن ایکسچینج کی وجہ سے خدا کے حج کو روکتے ہیں، خدا کے فریضے کو روکتے ہیں تو خدا بھی تم پر کبھی کہاں کی ایڈ (Aid) بند کروا دیتا ہے کبھی کہاں کی ایڈ (Aid) بند کروا دیتا ہے، ممکن ہے اگر خدا کے اس معاملے کو کھلا چھوڑ دو تو خدا تمہارے گھر کے اندر سے سونے کی نہروں کو جاری کروا دے، ہم ہر چیز کو آزماتے ہیں خدا کو نہیں آزماتے۔ خدا کے ساتھ تم لگا کر دیکھو اس کے بندوں کو اس کے گھر تک جانے دو، پھر دیکھو وہ تمھیں کیا دیتا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حج کا فریضہ لازم ہے اور یہ مرکزی نقطہ ہے ملت محمدیہ مرحومہ کا اور امت مرحومہ کو اللہ نے حج کے ذریعے سے ایک نکتے پر جمع کیا ہے۔ آپ اگر حج پر جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ حج میں دنیا کی تمام قومیں شریک ہوتی ہیں، یہ بنی اسرائیل کا کعبہ نہیں یا کسی خاص قوم کا کعبہ نہیں ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کا کعبہ ہے، حج بیت اللہ حقیقت میں پرانے مذاہب اور اسلام کے درمیان

تفریق کی لکیر ہے، پہلے مذہبوں میں یہود یا نصاری اپنے کعبہ پر جا کر بندگی کرتے تھے تو وہاں سب انسان اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے، بیت المقدس بنی اسرائیل کا قبلہ ہے، یہ نہیں ہے کہ پوری انسانیت وہاں جا کر اکٹھی ہو سکے۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ نوعیت ہے کہ اسلام کا قبلہ تمام انسانوں کا قبلہ ہے وہاں ہندوستان والے بھی آئیں گے، عرب والے بھی آئیں گے، چین والے بھی آئیں گے تمام دنیا کی قومیں وہاں اکٹھی ہوتی ہیں، اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

''جو شخص حج کی استطاعت رکھتا ہے اور پھر حج نہیں کرتا تو اللہ کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔''

یہودی مرتا ہے یہودی مرے نصرانی مرتا ہے نصرانی مرے۔ کیونکہ اصلاً دینِ حنیف کی حقیقت کعبۃ اللہ پر ہی جا کر نصیب ہوتی ہے۔ وہاں اجتماع ہے دِلوں کا، وہاں اجتماع ہے قوموں کا، وہاں اجتماع ہے ہر نسل کا، ہر ملک کا ہر علاقے کا، وہاں نصرانیت اور یہودیت کی طرح مختلف علیحدہ علیحدہ شعبے نہیں ہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا کمال اگر دیکھنا ہو تو وہاں جا کر انسان کو پتہ چلتا ہے کہ کیا نوعیت ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حج فرض ہوا ہر اس شخص پر جو کہ استطاعت رکھتا ہے۔ ایک اور بات، یہ بھی عجیب خدا کی شان ہے آپ اگر حج پر جائیں پہلے ہندستان اور پاکستان ایک تھا تو کہا کرتے تھے کہ ''دالمیاں اور تاتا'' آجکل تو کچھ کہہ نہیں سکتے، یہاں کے تاتا اور دالمیاں آپ بہت کم وہاں دیکھیں گے، وہاں آپ دیکھیں گے یہی ٹوٹے پھوٹے ہوں گے کہ عام طور پر تیسرے درجے کا جو طبقہ سمجھا

جاتا ہے وہ حج پر زیادہ موجود ہوں گے، فقراء کے زیادہ لوگ ہوں گے امراء کے نہیں ہوں گے، اور وجہ کیا ہے؟ ...... کہ حج دل کی لگن سے ملتا ہے، اگر دل کی لگن ہو تو خدا پہنچا دے گا اور اگر دل کی لگن ہی نہیں تو اللہ میاں کہاں پہنچائیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر غریب بھی حج کرنا چاہے تو سترہ سو روپے کی بات ہے سترہ سال میں اکٹھا کر سکتے ہو، سو روپیہ سالانہ، پچاس روپیہ سالانہ کرو تو چونتیس سال میں ہو جائے گا۔ بعض بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں تمام عمر کا اکٹھا کر کے آخر حج پر پہنچ جاتی ہیں لیکن جسے لگن ہی نہیں تو وہ کیا کرے۔

بہرحال حج پر بات کر رہا تھا وقت ختم ہو رہا ہے، اب حج کے موٹے موٹے اعمال بیان کر دیتا ہوں۔ جیسے آپ نماز میں تکبیر تحریمہ کہتے ہیں تو تکبیر تحریمہ کے بعد نماز سے باہر والے اعمال آپ پر بند ہو جاتے ہیں اسی طور پر حج کی تکبیر تحریمہ احرام ہے۔ جیسے نماز میں تکبیر تحریمہ ہے ایسے ہی حج میں احرام کا باندھ لینا ہے۔ احرام میں دو اَن سلے کپڑے ہوتے ہیں ایک اوپر والا ایک نیچے۔ چاہے شاہ ہو چاہے گدا ہو، اس میں اسلام کا وہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی دنیا کا سب سے بڑا با جبروت بادشاہ آجائے اور ایک ادنیٰ درجے کا آدمی ہو تو دونوں برابر ہیں۔ ایک واقعہ یاد آیا، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ کے زمانے میں ایک غسانی بادشاہ ''جبلہ بن ایہم'' مسلمان ہو کر آیا۔ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اب حج کا موسم آیا تو حج کے لیے چلا گیا۔ حج کے دوران اس کی جو نیچے تہبند تھی اس کا پلہ نیچے لٹک رہا تھا، قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کا پاؤں اس پر آ گیا اس نے ایک تھپڑ مارا اور اس کا دانت توڑ دیا۔ دانت ٹوٹ گیا تو وہ شخص دُہائی دیتا ہوا حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا اور کہا امیر المؤمنین اس نے

میرا دانت توڑ دیا۔ پوچھا کون ہے؟ کہا کہ جبلہؔ ہے۔ جبلہ کو بلایا گیا تو وہ کہنے لگا کہ کیا تمہارے مذہب میں غریب اور امیر سب برابر ہوتے ہیں! میں نے تو سوچا تھا کہ اسلام میں آکر میری عزت بڑھے گی، یہ تو ذلت ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ کوئی ذلت نہیں ہے بلکہ یہ تو تیری عزت ہے یا تو اپنا منہ آگے کر کہ تیرے بھی دانت کو توڑ دے یا اس کو راضی کر یعنی دیت ادا کر۔ یا تو قصاص دے یا پھر دیت ادا کر۔ اس نے کہا کہ میں صبح تک جواب دوں گا، خیر دیت دلوائی گئی اور پھر وہ رفو چکر ہو گیا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شاہ اور گدا سب برابر ہیں، وہاں تو ایک بڑا مزیدار منظر ہوتا ہے جب سعی کے دوران ''میلینؔ'' کی طرف جاتے ہیں تو وہاں پر سپاہی جو ہوتے ہیں وہ بھی احرام باندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ دیکھنا ہے تو اسلام کی چیزوں کو دیکھو۔ چلے جا رہے ہیں یورپ کو دیکھنے، او اللہ کے بندو! وہاں ویرانے میں کیا رکھا ہوا ہے۔...... دیکھنا ہے تو اللہ کے گھر کو جا کے دیکھو...... بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ احرام حقیقت میں ظاہر کے لحاظ سے تو دو جامے ہیں، اس کے بعد آپ نے حج کے خلاف والے اعمال نہیں کرنے ہوں گے۔ موٹی موٹی باتیں قرآن کے لفظوں میں

فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (البقرہ:۱۹۷)

ترجمہ: حج میں نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے، نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے نہ کسی قسم کا نزاع زیبا ہے۔

شہوت والی بات کا زبان سے بھی ادا کرنا منع ہے، زبان سے بھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرو گے، اور نہ کوئی جھگڑا اور نہ کوئی گناہ کا کام کرو گے، یعنی بالکل پاک ہو کے رہو گے، کوئی چاہتِ نفس والی بات ہی نہیں ہے، خدا کے ہو کر خدا کی

طرف جاؤ۔ تو اب جیسے یہ دو جامے باندھے جاتے ہیں، بعض محققین نے کہا دو جامے باندھے جاتے ہیں اتباعِ الٰہی کے اور اتباعِ سنت کے۔ تو جیسے مؤمن نے ظاہر میں احرام کے دو جامے پہن لیے باقی تمام چیزوں کو اتار دیا تو اس کے بعد اے ربّ میں نے اپنے جسم سے دنیا کی تمام گندگیوں کو اور قوانین کو اتار کر دو جامے پہنے یا تو اے اللہ تیرے حکم کو مانوں گا اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کروں گا اور سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ اب ایک بات تو یہ ہوگئی احرام والی۔ اس کے بعد ہم لوگ جب ہوائی جہاز کے ذریعے سے جاتے ہیں تو کراچی سے احرام باندھ کر جاتے ہیں اور باقی لوگ جو سمندری راستے سے جاتے ہیں ان کے لیے یلملم کی میقات کے متوازی ایک جگہ ہے جو سمندر ہی میں آتی ہے وہاں سے احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے نہانے وغیرہ کے بڑے آداب ہیں، اس وقت میں کیا بیان کر سکتا ہوں۔ خیر، اس کے بعد احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ احرام باندھنے کے بعد آپ اللہ میاں کے دربار میں حاضر ہو گئے، اب جتنا کثرت سے آپ سے ہو

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ط لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ ط اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ ط لَا شَرِیْکَ لَکَ

ترجمہ: میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں آپ کا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیشک سب تعریف اور نعمت آپ ہی کے لیے ہے اور سارا جہان ہی آپ کا ہے، آپ کا کوئی شریک نہیں۔

اے اللہ میں تیرے دربار میں حاضر ہوں، بس یہ پڑھتے جاؤ گے۔ اس کے بعد آپ پہنچیں گے کعبۃ اللہ پر۔ اصل میں حج میں تین طواف ہوتے ہیں، پہلے طواف

کوطوافِ قدوم کہتے ہیں، یہ ہمارے ہاں (حنفیہ کے ہاں) مستحب ہے۔اس کے بعد دوسرا طواف ہے جسے طوافِ زیارت کہتے ہیں جوکہ دس تاریخ کو ہوتا ہے اور یہ حج کے ارکان اور فرائض میں سے ہے،اگر یہ رہ گیا تو حج ادا نہیں ہوگا۔اور دیکھو کعبۃ اللہ کا کمال یہ ہے کہ اس دن کتنے لاکھ حاجی ہوتے ہیں سب کو ظہر سے لیکر عشاء کے وقت تک یہ طواف کرنا ہوتا ہے۔اب یہ طواف کرنے کے لیے اندازہ لگایئے کتنے آدمیوں کو گھومنا پڑتا ہوگا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے آسانی سے کرادیتے ہیں۔اب یہ طواف فرض ہے،اس کے بعد ایک طواف واجب ہے جسے طواف وداع کہتے ہیں جو واپسی پر ہوتا ہے۔ایک بات کہہ دوں عام طور پر ذہن میں نہیں رہتا،ہم نے دیکھا عورتیں وغیرہ ہوتی ہیں طواف کرتے ہوئے کعبے کو چوم لیتی ہیں،ایک محبت ہے،لیکن یہ محبت غلط محبت ہے،جیسے کہ نماز کی حالت میں کعبۃ اللہ سے آپ کی چھاتی پھر جائے تو آپ کی نماز نہیں ہوگی،آپ اگر جان بوجھ کر کعبے سے رخ کو پھیریں تو نماز نہیں ہوگی اسی طور پر طواف کے دوران اگر آپ کی چھاتی کعبہ کی طرف ہوگئی تو آپ کا طواف نہیں ہوگا،سوائے اس جگہ کے جہاں ''حجر اسود'' ہے۔...... یہ موٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں،ہم لوگ نمازیں تو خوب پڑھتے ہیں،ہم نے کہاں سیکھی ہیں،لیکن بہرحال نماز کو یاد کرلیتے ہیں۔اور عمر میں ایک حج کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر سیکھے جاتے ہیں، اور جب بغیر سیکھے جاتے ہیں تو کچھ اناپ شناپ کر آتے ہیں اور حاجی صاحب ہو جاتے ہیں،مجھ جیسا غریب ہوتو وہ حاجی ہوجاتا ہے اور جو امیر ہوتو وہ الحاج ہوجاتا ہے۔

حج کی تین قسمیں ہیں،وقت ختم ہوگیا ہے میں نے لمبی بات کرلی۔حج کی

تین قسمیں ہیں ایک کو ''افراد'' کہتے ہیں ایک کو ''قران'' کہتے ہیں اور ایک کو ''تمتع'' کہتے ہیں۔ افراد اسے کہتے ہیں کہ آپ صرف حج کی نیت سے احرام باندھیں اور عمرہ نہ کریں، عمرہ ایک قسم کا چھوٹا حج سمجھ لیجئے جو حج کے ایام کے علاوہ بھی ہوتا ہے۔ تو اب آپ اگر صرف حج کریں گے تو اسے افراد کہیں گے۔ اور اگر حج کے ساتھ بیچ میں ''حلال'' ہو جائیں، ''حلال'' کہتے ہیں احرام کو کھول دینا۔ احرام کو کھولنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سر کو مُنڈا دیتے ہیں اور یہ حقیقت میں نشانی ہے اس چیز کی کہ پہلے زمانے میں جو غلام ہوتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیا کرتے تھے۔ تو یہ اپنی غلامی کا نشان دیتے ہیں کہ اللہ میاں اب ہم پکے تیرے غلام ہو گئے اور کسی دوسرے کے نہیں رہے۔ اس وقت احرام کھول دیتے ہیں۔ احرام کھولنے کے بعد اگر پھر حج کے ایام میں، حج کے پانچ دن ہوتے ہیں آٹھویں سے شروع ہوتا ہے، اور اگر پھر حج کے ایام میں احرام باندھیں تو اسے تمتع کہتے ہیں۔ حج کا ایک احرام ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے احرام باندھا تو حج کے آخری مراسم کو ادا کرنے تک آپ اس احرام کو نہ کھولیں تو اسے کہتے ہیں حجِ قران، اس میں عمرہ بھی آجاتا ہے اور حج بھی آجاتا ہے۔ بہر حال نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج فرمایا تھا وہ حجِ قران تھا۔ حنفیہ کے نزدیک حجِ قران افضل ہے، شافعیہ کہتے ہیں تمتع اچھا ہے، بہر حال دونوں ہو سکتے ہیں جو بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نصیب فرما دے۔ مقصد یہ ہے کہ وہاں پہنچ جائیں اور حج کر لیں۔

حج میں جب آپ جائیں گے تو پہلے تو طواف کریں گے، طواف حجرا سود سے شروع کریں گے۔ حجرا سود ایک پتھر ہے جو جنت سے آیا تھا، اور باتوں کو چھوڑ دیجئے اس کا اندازہ لگایئے کہ اس پتھر پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی لب مبارک لگے

ہوں گے، حضرت ابراھیمؑ کے بھی لگے ہوں گے ، اور کتنے نبیوں کے لگے ہوں گے اور کتنے اہل اللہ اور صلحاء کے لگے ہوں گے ،تو یہ پتھر کتنا قیمتی ہوگا۔ اگر اس کے قریب انسان پہنچ جائے تو اسے بوسہ دیتے ہیں یا ہاتھ لگا لیتے ہیں ، یا اس کی طرف رخ کر کے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں جیسے تکبیر میں کرتے ہیں اور پھر کعبہ کے گرد سات چکر لگا لیتے ہیں ۔اس کے بعد وہاں سے نکلتے ہیں اور قریب ہی دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اب تو چھوٹے چھوٹے ٹیلے رہ گئے ہیں ، ایک کا نام ہے صفا اور ایک کا نام ہے مروہ۔ صفا و مروہ وہ پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حضرت ہاجرہؓ سات دفعہ دوڑی تھیں ، اسے کہتے ہیں سعی ۔ وہاں آپ کو بھی سات دفعہ دوڑنا ہوگا اور جس جگہ وہ زیادہ دوڑی تھیں وہاں سبز نشان لگائے ہوئے ہیں وہاں تیز دوڑنا ہوتا ہے اور ایک دعا بھی آئی ہوئی ہے حدیث شریف میں

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ (حصن حصین)

<u>ترجمہ:</u> اے میرے رب تو مجھ کو بخش دے اور رحم فرما ، بیشک تو ہی سب پر غالب اور سب سے زیادہ کرم والا ہے۔

یہ دعا وہاں پڑھی جاتی ہے اس کے بعد سر کو منڈا کر آپ کا پہلا طواف قدوم ختم ہوگیا۔اس کے بعد دوسرے ایّام ہیں ان کو یوم ترویحہ کہتے ہیں اور آٹھ تاریخ سے شروع ہوتے ہیں ۔اس میں سب لوگ نکل کر میدانِ منیٰ میں چلے جاتے ہیں ، وہاں رات عبادت وغیرہ ہوتی رہتی ہے ،اس کے بعد عرفات ایک اگلا میدان ہے۔ حج میں یہ موٹی موٹی دو چیزیں یاد رکھئے ، ایک تو احرام کا باندھ لینا یہ شرط ہے اور اس کے بعد دو رکن ہیں ایک رکن ہے طوافِ زیارت اور ایک رکن ہے وقوفِ عرفات ،

اگر یہ دو چیزیں نصیب ہو جائیں تو حج ہو جاتا ہے، اگر وقوف عرفات نصیب نہ ہوا یا طواف زیارت نصیب نہ ہوا تو حج ادا نہیں ہوتا۔ اب عرفات میں چلے جاتے ہیں وہاں جاکر اللہ سے مانگنا ہے، رونا ہے، زاری ہے جیسے حضرت ابراھیمؑ نے کی تھی۔ اس کے بعد پھر واپسی ہوتی ہے، واپسی میں مزدلفہ میں آتے ہیں، پھر منیٰ میں جاتے ہیں اور منیٰ میں تین دن تک رمی کرنا ہوتی ہے، جسے عام اصطلاح میں کہتے ہیں بڑا شیطان، درمیانہ شیطان اور چھوٹا شیطان، یہ تین وہ جگہیں ہیں جہاں حضرت ابراھیمؑ حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے لے جا رہے تھے تو شیطان نے بہکانے کی کوشش کی تھی، اس وقت حضرت ابراھیمؑ نے شیطان کو کنکریاں ماری تھیں، تو وہاں جا کر کنکریاں مارتے ہیں۔ بعضے لوگ تو غصے میں ہوتے ہیں اور جوتے بھی مارتے ہیں، جوتے بھی کتنے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ سنا ہے ہمارے علاقے کے ایک خان صاحب گئے تھے تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ہمیں چھوڑتا نہیں ہے آج تو میں اسے گولی سے ماروں گا اور پستول سے اس پر فائر کیے تھے۔ بہرحال وہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس کے بعد دسویں تاریخ کو طوافِ زیارت کے لیے آیا جاتا ہے، اس کے بعد پھر منیٰ آجاتے ہیں اور تیرہ تاریخ کو حج کے مراسم ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد آپ اگر وہاں رہنا چاہیں تو طواف کریں جتنا بھی کرنا چاہیں۔ روایات میں پچاس طواف کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے، اتنی بڑی بات نہیں ہے اگر اچھا چلنے پھرنے والا آدمی ہو تو پندرہ منٹ میں ایک طواف کر لیتا ہے۔ اگر آپ پچاس طواف کرلیں یا زیادہ کرلیں یہ آپ کی مرضی ہے۔ جب طواف کر لیتے ہیں تو وہاں سے واپس آ کر زم زم کا پانی پیتے ہیں، زم زم کے بارے میں حدیث میں ہے

مَاءُ زَمْزَمَ لِمَاشُرِبَ لَهٗ (سنن ابن ماجہ)

ترجمہ: زمزم کا پانی جس نیت سے پیا جائے اس سے وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔
زم زم پی کر جو دعا بھی مانگیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ایک مختصر سی دعا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے اور بڑی جامع دعا ہے دوسرے موقع پر بھی آپ پڑھ سکتے ہیں

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّ رِزْقًا وَّاسِعًا وَّ شِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ (حصن حصین)

ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے نفع پہنچانے والے علم اور فراخ روزی اور ہر بیماری سے شفا کا سوال کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اسلام کا نظریۂ تعلیم

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ

اَمَّا بَعۡدُ!

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ O

قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ط (الزمر:۹)

ترجمہ: آپؐ کہئے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں۔

میرے عزیزو اور دوستو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم کی جو آیت میں نے پڑھی اس میں ایک بات ارشاد فرمائی ہے، کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے؟

آپ جانتے ہیں کہ یہاں استفہامِ انکاری ہے یعنی برابر نہیں ہو سکتے وہ لوگ جو کہ جاننے والے ہیں اور جو نہیں جاننے والے۔ اب جہاں تک کہ اسلام کے نظریۂ علم کا تعلق ہے، اسلام کے نزدیک علم اتنی اونچی، ارفع واعلیٰ چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ بلکہ بعض علماء کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا تو مناسب نہیں ہوگا لیکن بہرحال ظہور کے لحاظ سے اور عطا کے لحاظ سے علم کی جو صفت ہے وہ تمام صفات سے اونچی ہے اور مولانا نانوتویؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں

بلکہ تمام انبیاء کی صفات میں عملیت سے بڑھ کر ان کی علمیت کی صفت ہوتی ہے اور نبوت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی علمی صفات ہی کا ظہور ہے، اللہ کی علم کی صفت ہے جو نبی پر کھلتی ہے اور نبی اس چیز کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ اب جب علم اتنی اونچی چیز ہے تو اس بناء پر قرآن نے کہا کہ

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط (المجادلۃ:۱۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے جن کو علم دین عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کرے گا۔

اب علم کسے کہتے ہیں، وہ علم کونسا ہے جس علم کی بناء پر انسان کے درجات بلند ہوئے اور وہ سب سے اونچا چلا گیا اور اسے بلندیاں عطا ہوئیں۔ دوستو! ہمارے نزدیک حقیقت میں علمِ اصلی وہی ہے اور علمِ حقیقی وہی ہے جو انسان پر خداوند قدوس کی معرفت کے دروازوں کو کھول دے۔ بقول شاعر کے

سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیرِ او
علمے که راهِ حق نه نماید جهالت است

ترجمہ: سعدی دل کی تختی کو اللہ تعالیٰ کے غیر کے نقش سے دھو ڈالو۔ ہر وہ علم جو کہ حق کی طرف راہنمائی نہ کرے جہالت ہے۔

اب وہ علم کونسا ہے جو کہ انسان کو خدا تک پہنچائے اور وہ علم کونسا ہے جو کہ انسان کے رابطے کو خدا کی ذات کے ساتھ قائم کر دے۔ وہ وہی علم ہے جو کہ انبیاء علیھم السلام کے ذریعے سے انسانوں پر کھولا جاتا ہے اور سب سے پہلے انبیاء علیھم

السلام کے سینے اس علم کے حامل بنتے ہیں اور جس طور پہ ہر نبی اپنی شان کے مطابق خدا کے علوم کا حامل ہے اور اس کا علم انتہائی ارفع و اعلیٰ ہے اسی طور پر سید الانبیاء حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نبوت کی سیادت کے مقام پر فائز ہیں تو وہ علوم جو کہ آپؐ کی ذات سے صادر ہوئے وہ تمام علوم پر سیادت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان علوم کا کوئی دوسرا علم مقابلہ نہیں کرسکتا۔ حقیقت میں جو علم سینۂ نبوت پر کھولا گیا وہ خدا کا علم ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو علوم کھلے ان کی دو نوعیتیں ہیں، ایک علم وہ ہے جو کہ فرشتے کے ذریعے سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر باہر سے ڈالا گیا اور آپؐ کے قلبِ مطہر پر وہ علم جبرئیل امین کے واسطے سے اترا اور اپنے الفاظ اور معانی اور اپنی حقیقت کے لحاظ سے وہ سب کا سب کلامِ الٰہی ہے، اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہنی، قلبی یا دلی کسی حیثیت سے بھی دخل نہیں جیسے کہ فرشتہ جبرئیلِ امین قرآن کے لانے میں امین ہے اسی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو لفظ و معنیٰ کے لحاظ سے لینے کے لحاظ سے امین ہیں اور پہنچانے کے لحاظ سے امین ہیں۔ جبرئیل فرشتہ بھی امانت والا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی امانت والے ہیں۔ آپؐ کے نہ ذہن نے اس میں کام کیا نہ آپؐ کے دل نے اس میں کام کیا، یہ بات میں خاص وجہ سے کہہ رہا ہوں آجکل ایک فتنہ اٹھا ہے اس کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ نہ آپؐ کے ذہن نے اس میں کام کیا، نہ آپؐ کے دل نے اس میں کام کیا، نہ آپؐ کی شخصیت اس پر اثر انداز ہوئی۔ بلاتشبیہ جبرئیل کی حیثیت کو سمجھ لیں جیسے ایک اچھا ٹیپ ہو اور ٹیپ میں جب بات آئے اور ریکارڈ ہو تو ٹیپ میں الفاظ بھی کہنے والے کے ہوں گے ان کے اندر جو معانی ہوں گے وہ بھی اسی کے ہوں گے، لہجہ تک بھی اسی کا

ہوگا۔ اسی طور پر قرآن کریم جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اترا وہ الفاظ و معانی اور لہجہ ہر لحاظ سے خدا کا کلام ہے اس میں نہ تو جبرئیل امین کا کوئی دخل ہے اور نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دخل ہے۔ قرآن نے کہا

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط (الاسراء:١٠٥)

ترجمہ: اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہوگیا۔

خدا نے اسے حق کے ساتھ اتارا اور یہ حق کے ساتھ اترا۔ یعنی انسان تک پہنچنے میں یہ دونوں واسطے جو ہمیں دکھائی دیتے ہیں یعنی جبرئیل امین کا واسطہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ ان دونوں واسطوں میں سے کسی نے بھی اپنی طرف سے ملاوٹ نہیں کی یہ سب کا سب خدا کا کلام ہے۔ اسے ہم وحی متلو کہتے ہیں جو کہ پڑھی گئی وحی ہے اور دوسرا علم جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے پر اترا اس کی حقیقت کچھ اس رُخ کی ہے کہ دیکھئے جو الہامِ ربّانی ہوتا ہے وہ دل کے اندر سے پھوٹتا ہے اور اس کے الفاظ جس پر الہام ہوتا ہے اس کے اپنے ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے چشمہ اندر سے پھوٹے۔ وہ علم بغیر حرف وصوت (آواز) کے انسان کے قلب پر آتا ہے۔ جیسے بلا تشبیہ یوں کہوں کہ وسوسہ ہوتا ہے، وسوسے کے الفاظ تو نہیں ہوتے، آواز تو نہیں ہوتی لیکن ایک چیز اندر آجاتی ہے اسی طور پر خدا کا علم (خدا باطن بھی ہے) پہلے اندر پھوٹتا ہے پھر الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ علم جسے کہ ہم حدیث کا علم کہتے ہیں اس کا اصلی سوتا بھی خدا کا علم ہے لیکن الفاظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ اس میں صرف اتنی سی بات ہے کہ جو حدیث قدسی ہے اس کا مفہوم الفاظ

کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالا گیا اور آپؐ کی زبان سے وہ الفاظ نکل گئے ۔ یہ تو ہوئی علم کی وہ بنیاد جس بنیاد پر دین کا علم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ظاہر ہوا یعنی یوں کہئے کہ جتنے بھی علوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی سے وجود میں آئے وہ علوم محمد یہ نہیں کہے جائیں گے بلکہ انھیں علومِ الٰہیہ کہا جائے گا ۔ ہر اس علم کی جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے صادر ہوا نسبت ثانی ہو گی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیکن ان کی نسبت اصلی یعنی منبع کے لحاظ سے ،سوتوں یعنی چشموں کے لحاظ سے خدا کی طرف ہو گی ۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم علوم الٰہیہ کے حامل ہیں ،محمد صلی اللہ علیہ وسلم علوم الٰہیہ کے عالم ہیں ،محمد صلی اللہ علیہ وسلم علوم الٰہیہ کے قاسم ہیں ،محمد صلی اللہ علیہ وسلم علوم الٰہیہ کے پہنچانے والے ہیں ۔ وہ اپنی ذات سے کچھ نہیں کہتے وہ سب خدا سے لے کر کہتے ہیں ،خدا سے سُن کر کہتے ہیں

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۔۳،۴)

ترجمہ: اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے ، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا ۔

آپؐ کا سب کا سب علم خدائی علم ہے اور خدا کا دیا ہوا علم ہے ۔اب جب خدا کا علم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک آیا اور آپؐ نے اسے اپنایا اور آپؐ نے اسے اپنی زندگی میں سمویا اور وہی چیز آپؐ کے جسد سے اعمال کی صورت میں وجود میں آئی ۔ عام طور پر علم کو معلومات کے معنیٰ میں لے لیا جاتا ہے ، دینی علم جو ہے وہ نری معلومات نہیں ہوتیں ، دینی علم اللہ کا نور ہے اور وہ بقول امام مالکؒ کے

نور نزل اللّٰه علی قلوب عباد المؤمنین

ترجمہ: ایک اللہ کا نور ہے جو کہ اللہ تعالیٰ مؤمن بندوں کے دلوں پر ڈالتا ہے ۔

یہ نورِ ربّانی ہے جو کہ بندۂ مؤمن کے قلب پر وارد ہوتا ہے اور اس کا سینہ حقائق کے کھلنے کے لیے روشن ہو جاتا ہے۔ دیکھو دوستو! میں ایک بات عرض کروں قرآن کریم یا وہ علومِ الٰہیہ جو کہ خدا کی طرف سے آتے ہیں ان کی نوعیت کچھ اس رُخ کی ہوتی ہے جیسے کہ آنکھ دیکھتی ہے لیکن آنکھ اپنے رخ سے نہیں دیکھتی بلکہ آنکھ اپنی بینائی سے دیکھتی ہے، یہ جتنا بھی محسوسات اور کائنات کا عالم ہے آپ اسے اپنی آنکھ سے دیکھیں گے لیکن آپ کی آنکھ اسے نہیں دیکھے گی بلکہ آپ کی آنکھ کی بینائی دیکھے گی اسی طور پر جیسے کہ اس آنکھ کو اس عالم کو دیکھنے کے لیے بینائی کی ضرورت ہے، ایسے ہی حقائق کو جاننے کے لیے، آخرت کے جاننے کے لیے، خدا کے علوم کو جاننے کے لیے، ان کے سمجھنے کے لیے جس بینائی کی ضرورت ہے، جس نور کی ضرورت ہے اس نور کو ہم الٰہی علوم کہتے ہیں۔ علوم الٰہیہ نبیوں کے ذریعے سے انسانوں پر کھولے جاتے ہیں۔ جب علوم انبیائی آئیں گے اور ان کا پَرتو اور انعکاس آپ کے دلوں پر ہوگا اور آپ کے دل پر خدا والے علوم اتریں گے اس وقت نوعیت یہ ہوگی کہ آپ کا دل کھلے گا۔ جیسے قرآن کہتا ہے

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ وَھُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ (الزمر:۲۲)

ترجمہ: سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لیے کھول دیا

اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کیے ہوئے) نور پر ہے۔

جس کے سینے کو ہم اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ایک روشنی پر قائم ہو جاتا ہے۔ جب یہ روشنی آتی ہے تو سینہ روشن ہو کر حقائق کو دیکھنے لگ جاتا ہے۔ جیسے کہ چیزوں کی تمیز آپ اپنی آنکھ سے دیکھ کر کرتے ہیں کہ یہ لکڑی ہے،

یہ لوہا ہے، یہ پانی ہے، یہ دودھ ہے اسی طور پر محسوسات کو آپ اپنی آنکھ سے دیکھیں گے اور جو کہ مغیبات ہیں یعنی وہ چیزیں جن پر عقیدہ لایا جاتا ہے یا موت کے بعد والی چیزیں ان سب کی بینائی اور دیکھنے کی طاقت جس علم سے حاصل ہوتی ہے اسے علومِ نبوت کہتے ہیں۔ یہ علم جب انسانوں کو دے دیا جاتا ہے تو اس کے بعد انسان کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی کہ اس کی زندگی ان لوگوں کی طرح ہو جائے جو کہ اس علم کو رکھنے والے نہ ہوں۔ دیکھو قرآن کریم میں ایک مقام پر فرمایا

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (الرعد:١٦)

ترجمہ: آپؐ کہئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوسکتا ہے یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہوسکتی ہے۔

اللہ کے علم والا بینا ہے اور اللہ کا علم جسے حاصل نہیں حقائق کے لحاظ سے وہ نابینا ہے۔ اب جو عالم ہوا آخرت کے لحاظ سے، خدا کے علوم کے لحاظ سے وہ بینا ہے اور نابینا وہ ہوتا ہے جسے کہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے آپ دیکھئے کہ سب سے پہلے بینا اور آنکھ والے جو اس دنیا میں آئے وہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کی اس بینائی کا نور امت کی طرف منتقل ہوا اور امت کے ہر طبقے کی طرف منتقل ہوا لیکن جنھوں نے ان علوم کے زیادہ حصے کو اپنایا وہ عالم کہلائے۔ حدیث میں آتا ہے

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ (سنن الترمذی)

ترجمہ: علماء وارث ہیں انبیاء کے۔

وراثت سب سے زیادہ جس چیز کی ہوگی وہ خدائی علم ہے۔اب خدائی علم آنے کے بعد انسان کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ جس پر خدا کا علم کھلا کرتا ہے وہ سب سے پہلے خدا کا جاننے والا بنتا ہے۔علم الٰہی کا حاصل یہ ہے کہ ہم خدا کو جاننے والے بنیں، خدا کے پہچاننے والے بنیں،خدا کی معرفت والے بنیں، خدا کے حقائق کے سمجھنے والے بنیں،موت وحیات کے حقیقی رازوں سے واقف ہو جائیں۔یوں سمجھیں کہ ہمیں اس دنیا میں ایک پورا کا پورا کرشمہ اس دنیا کے اعمال کا ہوتا دکھائی دیتا ہے سب کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن جب علم الٰہی آئے گا تو علم الٰہی آنے کے بعد پہلی بات جو آپ کے دلوں پر آئے گی تو یہ ہوگا کہ جو کچھ بھی اس دنیا میں ہو رہا ہے یہ پورا کا پورا کائنات کا نظام اپنی ذات سے قائم نہیں بلکہ خدا کی ذات سے قائم ہے۔یہاں جتنے بھی احوال اعمال جو کچھ بھی پیش آرہا ہے یہ خدا کی ذات سے آرہا ہے، خدا اس کو کرنے والے ہیں یعنی سب سے پہلے جب علم الٰہی آتا ہے تو انسان کا تعلق مخلوق سے ایک معنی میں منقطع ہو جاتا ہے یا یوں کہئے کہ مخلوق کا تعلق مغلوب ہو جاتا ہے اور خدا کا تعلق غالب آجاتا ہے۔اس وقت علم الٰہی کے آنے کے نتیجے کے طور پر انسان خدا والا بنے گا اور اس کی نگاہ میں ہر غیر اللہ جو ہے وہ نیچے چلا جائے گا اور خدا کی ذات ہر مقام پر ہر آن اس کے دھیان میں بسے گی۔خدا کو اپنا مقصد زندگی بنا کے وہ زندگی کی ہر راہ پر جب قدم اٹھائے گا تو اس قدم کے اٹھانے میں سب سے پہلے اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی ان علوم پر عمل کے ذریعے سے جو کہ انبیاء علیھم السلام لے کر آئے ہیں۔خدا کی رضا کا پتہ بھی علوم کے ذریعے سے چلے گا اور اس پر عمل کا راستہ

بھی انہی ذرائع سے معلوم ہوگا۔ پھر اس کے بعد قیمتی چیز جو ہم پر کھلے گی وہ کیا ہوگی؟ دیکھو! جن پر علوم الٰہیہ کھلتے ہیں وہ اس کے امین ہوتے ہیں۔ جن پر اللہ کا علم کھلا وہ اس کے امین ہوتے ہیں۔ سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جب اعتراض کیا گیا کہ آپ اتنی احادیث کیوں بیان کرتے ہیں؟ کیونکہ آپ محراب کے قریب کھڑے ہو کر بار بار احادیث بیان کرتے جاتے تھے **قال نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ،قال ابو قاسم صلی اللّٰہ علیہ وسلم** یعنی حضورؐ کے مختلف ناموں کو لے کر احادیث بیان کرتے۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ ابو ہریرہ تم فلاں سَن میں آئے تم اتنی احادیث کیونکر بیان کرتے ہو۔ کہنے لگے اگر قرآن کی دو آیتیں نہ ہوتیں اور انھوں نے قرآن کی دو آیتیں پڑھیں اور کہنے لگے کہ میں نبیؐ کی کوئی بات بھی تم سے بیان نہ کرتا

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ O

(البقرہ:۱۵۹)

<u>ترجمہ:</u> جو لوگ اخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کو) ہادی ہیں بعد اس کے کہ ہم انکو کتابِ (الٰہی تورات وانجیل) میں عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور (دوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا

اُولٰٓئِکَ مَایَاْ کُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّاالنَّارَوَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ o (البقرہ:۱۷۴)

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں (دنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کرینگے اور نہ (گناہ معاف کرکے) ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔

فرمانے لگے اگر قرآن کی یہ آیتیں نہ ہوتیں تو میں تم سے ایک بات بھی بیان نہ کرتا۔ میں تو اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھ پر علمِ الٰہی کچھ کھلا ہے اور مجھ پر یہ لازم کردیا گیا کہ میں اسے آگے پہنچاؤں۔ اسی طور پر بخاری میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے جب ان کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے یہ روایت بیان کی

لَا یَشْھَدُ عَبْدٌ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ یَمُوْتُ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قَالَ قُلْتُ أَفَلَا اُحَدِّثُ النَّاسَ قَالَ لَا اِنِّی اَخْشٰی اَنْ یَتَّکِلُوْا عَلَیْہِ (مسند احمد)

مفہوم: جو بندہ بھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی گواہی دیتا ہوا اور پھر اسی پر مرجائے تو وہ جنت میں داخل ہوگا، کہا کیا میں لوگوں سے یہ بات بیان کردوں تو آپؐ نے فرمایا نہیں کہیں وہ اسی پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں (اور عمل کرنا ہی چھوڑ دیں)۔

انھوں نے یہ بات اس لیے بیان کی کہ انھیں اس چیز کا ڈر تھا کہ اگر وہ دنیا سے چلے جائیں تو ایک علم کا حصہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان پر کھلا تھا دنیا

اس سے محروم نہ ہو جائے ، کیونکہ علم امانت ہے یہ دوسروں تک پہنچائی جائے گی ۔ اگر علم اگلوں تک نہیں پہنچایا جائے گا تو رفعِ علم شروع ہو جائے گا ، دین کا اٹھنا شروع ہو جائے گا۔ علم کے ساتھ عمل قائم ہے ، علم و عمل کے جوڑ سے دین وجود میں آتا ہے جب علم نہیں ہوگا تو عمل نہیں ہوگا ، جب عمل نہیں ہوگا تو دین نہیں ہوگا ۔ اس بناء پر یوں کہا جائے گا کہ علم والے پر لازم ہے کہ جو علم وہ جانتا ہے اسے دوسروں تک پہنچائے ۔ مسلم میں ایک دوسری روایت ہے یہ جو میں نے حدیث پڑھی کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا جنت میں داخل ہو جائے گا ، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس کے الفاظ کو اگر لوگوں تک تم پہنچا دو تو لوگ اس کا غلط معنیٰ سمجھ کر ممکن ہے عمل سے غافل نہ ہو جائیں ۔ لا الہ الا اللہ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ جیسے دوسری روایات میں آتا ہے کہ ''جس نے لا الہ الا اللہ اخلاص سے کہا اور اس کا حق ادا کر دیا تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا'' ۔ کسی نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا کہ ﴿ اَنْ تَحْجِزَهٗ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ ﴾ کلمے کا حق یہ ہے کہ اسے ان تمام چیزوں سے روک دے جن کو کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے ۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا اسی طور پر عبادہؓ ابن صامت سے یہ روایت ہے کہ انھوں نے بھی موت کے وقت اس حدیث کو بیان فرمایا اس خیال سے کہ علم کا ایک حصہ میرے ساتھ اس دنیا سے اٹھ جائے تو کل قیامت کے دن مجھے شرمندگی اٹھانی نہ پڑے ۔ میں اس وقت یہ عرض کر رہا تھا کہ جب علم آتا ہے تو زندگی بدلتی ہے ، مقصدِ زندگی بدلتا ہے ، عملِ زندگی بدلتا ہے اور بدلنے کے ساتھ صرف یہی نہیں ہوتا کہ ہم اگر حاملِ علم بن گئے عالمِ علم بن گئے تو یہ کفایت کر جاتا ہے یہ بات کفایت نہیں کرتی یہ بہت بڑی دولت ہے جیسا کہ حدیث

میں آتا ہے کہ

مَنۡ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيۡرًا يُفَقِّهۡهُ فِى الدِّيۡنِ (بخاری)

ترجمہ: جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا معاملہ فرمانا چاہتے ہیں اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتے ہیں۔

لیکن علم کا لینا کافی نہیں ہو جاتا کہ آپ علم والے ہو گئے اور آپ نے علم کا حق ادا کر دیا، علم جتنی اونچی شان کا ہے اس کی ذمہ داریاں بھی اتنی ہی اونچی ہیں۔علم اپنے جاننے والے سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی زندگی بھی علم کے مطابق ہو۔ دیکھئے قرآن میں آتا ہے

اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُاط (فاطر:۲۸)

ترجمہ: اللہ سے حقیقت میں وہی لوگ ڈرتے ہیں جو خدا کے علمِ صحیح کو رکھتے ہیں۔

یعنی جتنا علم آئے گا اتنی ہی خدا کی خشیت آئے گی، خشیت مطلوبہ کے متعلق نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اَللّٰهُمَّ اقۡسِمۡ لَنَا مِنۡ خَشۡيَتِكَ مَا يَحُوۡلُ بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَ مَعَاصِيۡكَ (الترمذی)

ترجمہ: اے اللہ ہم تیری ایسی خشیت کو چاہتے ہیں جو کہ حائل ہو جائے ہمارے اور گناہوں کے درمیان۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

اَنَا اَتۡقٰكُمۡ لِلّٰهِ وَ اَعۡلَمُكُمۡ بِحُدُوۡدِ اللّٰهِ (مسند احمد)

ترجمہ: میں تم سب سے زیادہ خدا کا جاننے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں۔

یعنی جتنا علم الٰہی آتا جائے ،خشیت الٰہی آتی جائے ،تقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے ۔سب سے زیادہ متقی وہی ہوگا جو سب سے زیادہ علم کا رکھنے والا ہے ۔لہٰذا اگر تقویٰ ہماری ذات میں نہیں تو ہم علمِ صحیح کے رکھنے والے نہیں ۔علم کے متعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ عِلۡمٍ لَّا یَنۡفَعُ (صحیح مسلم)

اے اللہ میں اس علم سے پناہ چاہتا ہوں جو کہ نفع نہ دے۔

علم کا نفع نہ دینا کیا ہے؟ مثلاً آپ ایک درخت لگاتے ہیں آم کا لیکن اس آم کے درخت میں نہ تو پتے آئیں اور نہ پھل آئے تو کہا جائے گا کہ اس درخت نے فائدہ نہیں دیا، اگر اس میں پھل آجائے تو یہ آم کے درخت کا فائدہ ہوگا۔اسی طور پر جس علم کا نتیجہ تقویٰ ہے اور خشیت ہے وہ علم فائدہ مند ہوگا۔کسی نے کہا ہے اور اچھا کہا ہے۔

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

عصیاں (گناہوں) کے ساتھ تقویٰ کا درخت اور علمِ الٰہی کا درخت باقی نہیں رہ سکتا۔امام شافعیؒ کے استاد وکیعؒ کے لفظ ہیں کہ علم اللہ کا نور ہے اور یہ عاصی کو نہیں دیا جاتا۔علم حقیقی اور علم الٰہی وہ گناہوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔گناہوں کی ظلمت علم کی حقیقت کو، علم کے نور کو، علم کی برکت کو ختم کر دیا کرتی ہے۔اس لیے ہمارے بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر علم کی برکت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو علم کے برتن کو صاف کرلو اور علمِ الٰہی کا برتن دل ہے۔اگر دل درست ہو جائے گا تو علم باقی رہے گا

ورنہ اس کی برکات باقی نہیں رہیں گی، انوارات باقی نہیں رہیں گے، اس کا حاصل باقی نہیں رہ سکے گا۔ اس کے لیے دل کی صفائی دیکھئے قرآن کریم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق واضح الفاظ ہیں آپؐ کے فرائض معلمی میں یہ بات بتائی گئی

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (ال عمران:۱۶۴)

ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔

آپؐ کے ذمے تلاوت بھی ہے اور تلاوت کے ساتھ دل کی صفائی کا بھی کام ہے تزکیۂ قلبی بھی ہے، تزکیۂ نفوس بھی ہے۔ دلوں کو بھی پاک کریں نفسوں کو بھی پاک کریں اور اس کے بعد پھر تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ کتاب وحکمت وہیں اپنا رنگ ڈالے گی اور اس کی بہار وہیں آئے گی جہاں تزکیہ بھی ہو، جہاں تقویٰ بھی ہو۔ جہاں تزکیہ اور تقویٰ کا بیج نہیں ہوتا وہاں کی کھیتی سرسبز وشاداب نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے یوں کہتے ہیں کہ دلوں کی صفائی علم کے باقی رکھنے کے لیے علم کا تقاضا ہے۔ دینی علم نِرے الفاظ کا نام نہیں، بقول امام مالکؒ کے لیس العلم بکثرت روایات، علم کثرت روایات کا نام نہیں ہے، یہ تو ایک زندگی ہے۔ ترمذی کی ایک روایت میں آتا ہے، روح المعانی میں حاکم کے حوالے سے بھی روایت کیا ہے، فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ”علم کا جو سب سے پہلا حصہ اٹھایا جائے گا وہ نماز کا خشوع ہو

گا۔'' خشوع آپ جانتے ہیں، لغت کی کتابوں میں دیکھ لیجئے کہ خشوع اس سکون کی کیفیت کو کہتے ہیں جو کہ اللہ کے ڈر کے مارے انسان کے قلب میں حاصل ہوتی ہے اور انسان کے جوارح بھی اللہ کی عظمت کے آگے ساکن اور پر سکون ہو جایا کرتے ہیں۔ یعنی خشوع ایک کیفیت حالی کا نام ہے، علم کو نہیں کہتے بلکہ خشوع ایک کیفیت عملی کا نام ہے۔ لیکن حدیث کے لفظ ہیں جو پہلی چیز اٹھائی جائے گی وہ نمازیوں کا خشوع ہوگا۔ علم کے لفظ ہیں کہ علم کی پہلی چیز جو اٹھائی جائے گی وہ خشوع ہوگا۔ گویا کہ قرنِ اوّل میں وہ کیفیات جو علم کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتی تھیں انھیں بھی علم کا نام دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ قرناً بعد قرن دین کی چیزیں اٹھتی چلی جائیں گی یہاں تک کہ نماز کی ظاہری صورت دین کی آخری چیز ہوگی جو اٹھائی جائے گی۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دیکھو قرنِ اوّل میں علم و عمل دونوں یکجا تھے دونوں اکٹھے چل رہے تھے، ایک ہی سوتا خدا کی ذات سے چلتا تھا اور ہمارے دل کے اندر حقائق کو کھولنے کے رُخ سے آتا تھا تو علم تھا اور اگر عمل پر ڈال دیتا تو یہ عمل کہلاتا تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے بخاری کی روایت ہے ''میری مثال اور اس علم کی مثال جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں بارش کی بدلیوں کی ہے کہ بارش کسی زمین پر برستی ہے، اب اگر زمین نرم ہے تو اس پانی کو سنبھالے گی اور پانی کو اندر لے لے گی تو لوگ اس سے سیراب بھی ہوں گے اور اس میں کھیتیاں بھی لہلہائیں گی اور سرسبز و شاداب بھی ہوگی لیکن ایسے لوگ جو کہ سخت زمین کی طرح ہیں وہ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے۔ اور فرمایا کہ جو میری طرف متوجہ نہیں ہوتے اور میرے علم کو نہیں لیتے ان کی مثال ان پتھر جیسی زمینوں کی ہے کہ

علم کو نہ تو لیتے ہیں اور نہ اسے سنبھالتے ہیں۔'' لیکن جو علم کو لے لیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علم کی حقیقت کو اپنائیں گے اور سنبھالیں گے اور علم کی سرسبزی اور شادابی سے وہ خود بھی فائدہ اٹھائیں گے اور دوسرے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

تو میں نے یہ عرض کیا کہ علم الٰہی آئے گا تو اس کے ساتھ یقین الٰہی آئے گا۔ قرآن کے الفاظ میں

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ o کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ o ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ o کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ o لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ o ثُمَّ لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ o ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ o (سورہ التکاثر)

ترجمہ: (دنیاوی ساز و سامان پر) فخر کرنا (جو کہ علامت ہے محبت و طلب کی) تم کو (آخرت سے) غافل کیے رکھتا ہے، یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں تم کو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی یعنی مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا، پھر (دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (تمہاری یہ حالت ٹھیک) نہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا، اور اگر تم یقینی طور پر (دلائل صحیحہ واجب الاتباع سے اس بات کو) جان لیتے واللہ تم لوگ ضرور دوزخ دیکھو گے، پھر (مکرر تاکید کے لیے کہا جاتا ہے کہ) واللہ تم لوگ اس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو کہ خود یقین ہے، پھر (اور بات سنو کہ) اس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی۔

علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یقین کے تمام مراتب کو منسلک کر دیا۔ عین یقین جو ہے وہ بھی علم کی وہ کیفیت ہے کہ جو علم انسان کے دل پر اپنا پرتو حقیقت کے رُخ

سے ڈالتا ہے، جیسے آپ گھپ اندھیرے میں سرچ لائٹ ڈالیں تو جتنی بھی چیزیں ہوں گی وہ روشن ہوتی چلی جائیں گی اسی طور پر جب قلب پر خدا کے علم کا نور پڑتا ہے تو پورا دل روشن ہو کر اس پر حقائق ایسے منکشف ہو جاتے ہیں جیسے کہ آنکھوں دیکھی چیز ہوتی ہے اور اس وقت انسان دلائل کا محتاج نہیں رہتا، جب حقائق کھل جائیں تو انسان دلائل کے پیچھے نہیں پھرا کرتا۔ یہ انکشافی علم ہے یہ دل پر جب کھل جاتا ہے جیسے کہ مولانا رومؒ نے فرمایا

ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

آفتاب سامنے آجائے تو پھر انسان آفتاب کی دلیل نہیں ڈھونڈا کرتا۔ اسی طور پر جب انکشافی علم کا انتہائی درجہ انسان کو میسر آجائے تو انسان اس کے دلائل کے پیچھے نہیں پھرے گا۔

سب سے پہلا کلمہ علم کا کیا ہے؟ وہ معتقدات یا عقیدے ہیں جن کی خدا کی طرف سے دعوت دی گئی یعنی مغیبات، وہ مشاہدات کی طرح ہو جائیں گے۔ جتنا علم بڑھتا جائے گا اتنا یقین بڑھتا چلا جائے گا۔ جتنا یقین خدا کی ذات پر خدا والے عقیدوں پر اور آخرت کی زندگی پر بڑھتا چلا جائے گا نتیجہ یہ ہوتا چلا جائے گا کہ انسان آخرت کی زندگی کے رخوں پر چلنے والا بن جائے گا اور انسان کی زندگی میں انقلاب آئے گا جو انسان کے جملہ اعمال کو بدل کر رکھ دے گا۔ عالم جو ہوتا ہے وہ صرف عالم نہیں ہوتا دیکھو یہ بھی نکتے کی بات ہے ہمارے بزرگ فرمایا کرتے ہیں علم وعمل کے الفاظ ایک ہی ہیں علم پہلے آتا ہے ''ع ل م'' اور عمل بعد میں آتا ہے ''ع م ل'' اور اس میں ایک اور نکتہ میں اپنی طرف سے عرض کروں دیکھو عربی کی ابجد میں ''ل'' کے

بعد ''م '' آتا ہے، جو علم کے حروف ہیں وہ عمل کے حروف ہیں جہاں علم ہوگا، جس کے اندر علم کے یہ تین حروف حقیقی رُخ سے آجائیں گے اس کے اندر عمل بھی آئے گا۔ میں یہ عرض کررہا تھا کہ سب سے پہلا علم کا نتیجہ کیا ہے؟ اسلامی نکتہ نظر سے یہ نکتہ ہے کہ انسان کے اندر یقینِ خداوندی پیدا ہوجائے اور یقین خداوندی کے نتیجے کے طور پر دوسری بات یہ کہ انسان کے اندر عملی زندگی پیدا ہوجائے۔ عالم جو ہوگا وہ باعمل ہوگا۔ ربّانی جو ہوگا وہ ایسا نہیں ہوگا کہ صرف باتوں کا بتانے والا ہو اور ان پر عمل کرنے والا نہ ہو۔ اب اس کے بعد دوسری چیز یہ ہوگی کہ علم کا تقاضا کیا ہے؟ دیکھو! نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے اور آپؐ کی احادیث جیسے خود فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے

بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ (بخاری، مسلم)

فرمایا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے جوامع کَلِم کے ساتھ یعنی چھوٹی لیکن سمندروں سے زیادہ معانی والی باتوں کے ساتھ بھیجا۔ ہمارے ایک استاد تھے لوگوں نے جب حدیث کا انکار کرنا شروع کردیا، وہ کہنے لگے اگر یہ اہلِ زبان کے ہاں ہوتے سعودی عرب میں ہوتے، مصر میں ہوتے تو انھیں مجنون کہا جاتا دیوانے کہا جاتا۔ احادیث کی تو تعلیمات ہی ایسی ہیں کہ اگر کافر بھی سُن لے اور پڑھ لے تو وہ بھی ایمان لے آئے۔ ایک ایک حدیث کو اگر آپ دیکھیں تو اس میں علوم کے سمندروں کے سمندر ہیں۔ ایک حدیث میں فرماتے ہیں

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَ (الترمذی، کتاب العلم)

فرمایا اللہ تعالیٰ سرسبز وشاداب رکھے اس شخص کو جس نے ہماری کسی بات کو سُنا پھر اس

نے اسے پہنچا دیا اس رُخ سے جیسے اس نے ہم سے سُنا ہے۔

اب دیکھو یہاں کیا بات ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے کوئی بات سُنی تو وہ علمِ الٰہی ہے، خدا کی بات ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجے میں ، اب بات سنی تو بات کا حق اس پر لازم ہو گیا کہ وہ اسے سنبھالے بعض روایات کے الفاظ آتے ہیں فــاه اسے سنبھال بھی لیا۔ بعض اوقات صحابی جب حدیث کہتے ہیں ناں سمعت فاه قلبی اور میرے دل نے اسے سنبھالا۔ کانوں نے سُنا دل نے سنبھالا اب دِل نے سنبھالا اور سنبھالنے کے بعد اگلی بات کیا ہوئی ؟ اگلی بات یہ ہوئی کہ پہنچاؤ۔ اور پہنچانے پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا دیتے ہیں کہ اللہ اسے سرسبز وشاداب رکھے۔ سرسبز وشادابی کیا ہے؟ دیکھو جیسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ حدیث نے اپنے علوم کی مثال پانی کی دی ہے۔ تو جیسے پانی کھیتیوں کے لہلہانے کا اور ان کی آبادی سرسبزی اور شادابی کا ذریعہ ہے ایسے علمِ الٰہی کی دعوت وتبلیغ اور اس علم کو دوسروں تک پہنچانا دین کی زندگی کے لیے شادابی اور سیرابی کا ذریعہ ہے۔ اگر علمِ دین آتا رہے اور وہ پہنچایا جاتا رہے تب تک تو دین قائم ہوگا اور جب علم دین نہیں ہوگا دین باقی نہیں رہے گا۔ اسی لیے گویا جو حقیقت پانی کی کھیتیوں کے لیے ہے وہی علمِ دین کے پہنچانے کی حیثیت ہے دین کی بقاء کے لیے، اس وقت تک دینِ صحیح باقی ہوگا جب تک علمِ صحیح ، صحیح رُخ سے پہنچایا جاتا رہے گا۔ اس میں ایک بات میں تفصیل سے کہہ دوں دوستو! روایات میں آتا ہے ’’لوگوں سے باتیں کرو ان کی عقلوں کے مطابق، ایسی بات نہ ہو کہ وہ تمہاری بات کو نہ سمجھ کر خداوند قدوس کی بات کا انکار ہی کر دیں۔‘‘ اب یہ رخ جو ہے دعوت کا جسے حکیمانہ دعوت کہتے ہیں یہ علم کا تیسرا تقاضا

ہے۔علم کا تیسرا تقاضا کیا ہے؟ کہ علم میراث نبوت ہے، میراث نبوت کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی یہ امانت ہے اس امانت کو دوسروں تک پہنچایا جائے گا۔اس پہنچانے کی جہاں تک کہ ہمیں نبوت کے طریق سے معلوم ہوتا ہے کہ دو تین راہیں ہیں۔ایک تو یہ کہ اس علم کو لے کر زبان کے لحاظ سے دوسروں تک پہنچاتے چلے جاؤ، جو بات پہنچی اسے دوسروں تک پہنچاؤ لیکن پہنچانے میں ان کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے دین کی حق بات کو ایسے لہجے سے بیان کرو کہ بات کو وہ لینے والے، سنبھالنے والے اور قبول کرنے والے بن جائیں۔اگر انھوں نے قبول کر لیا تو بات بن جائے گی۔اس میں دیکھو دوستو! عمومی طور پر میں اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ دین کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات پیش آتے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں آتے کہ دین میں کوئی خرابی ہے۔دین میں کوئی خرابی نہیں، یہ دینِ فطرت ہے یہ خدا کا دین ہے، اُس خدا کا دین ہے جس نے ہوا کو پوری انسانیت کے لیے کہ جہاں کا بھی کوئی شخص ہوگا موٹا ہوگا، پتلا ہوگا، کالا ہوگا گورا ہوگا، ہندی ہوگا ترکی ہوگا، امریکن ہوگا یورپین ہوگا جو بھی ہوگا اللہ تعالیٰ نے ہوا ہر ایک کے لیے ضروری قرار دے دی اور ہوا کو ایسا کر دیا کہ اس سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے۔جس طور پر ہوا ہے نفوس کی بقاء کے لیے ہے اسی طور پر علمِ الٰہی ہے روحوں کی بقاء کے لیے۔انسان کی حقیقی زندگی کے لیے علم کی زندگی ہے قرآن نے کہا ہے ایک مقام پر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو مان لو ﴿لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾ (الانفال:۲۴) جس سے تمھیں حیات روحانی حاصل ہو جائے۔حیات روحانیہ علم نبوت پر مبنی ہے۔اب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے جو علوم بھیجے یہ یقین کر لیں اس پر ایمان لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے علوم صرف عرب کے لیے نہیں تھے، کسی خاص زمانے کے لیے خاص نہیں تھے، جیسے ہوا ہر جگہ موجود ہے اسی طور پر علومِ نبوت ہر زمانے کے لیے ہیں۔ دیکھو جو بڑے پھیپھڑوں والا ہوگا وہ سانس کو زیادہ کھینچے گا زیادہ ہوا کو اندر لے گا، اور میری طرح جس کا پھیپھڑہ چھوٹا سا ہوگا وہ تھوڑی سی ہوا کو اندر کھینچے گا۔ جو بڑے برتن والے ہیں بڑے قد والے ہیں وہ بڑی چیز کو اپنا لیں گے اور جو چھوٹے قد والے ہیں وہ چھوٹی کو اپنا لیں گے۔ عرض کرنے کا میرا مدعا یہ تھا کہ علم میں کوئی بھی کوتاہی نہیں جو کہ کسی صحیح ذہن والے کے لیے خرابی کا سبب ہو۔ خراب اشکالات تین وجوہ سے آتے ہیں یا تو یہ ہوتا ہے کہ جس بات کو آپ پیش کر رہے ہیں آپ نے دین کی بات کو صحیح سمجھا نہیں یا آپ نے صحیح سمجھا اور غلط رُخ سے پیش کر دیا، ایک اشکالات کا سبب یہ بنتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جس شخص نے لیا اس شخص نے صحیح سُنا نہیں، صحیح سمجھا نہیں اس طرح سے دوسرے اشکالات پیش آتے ہیں۔ یا یہ کہ آپ کا جو طرزِ بیان ہے، آپ کے سمجھانے کا جو طریقہ ہے، علم کے پہنچانے کے رُخ سے معلم کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ معلم امین ہو، امانت کا معنیٰ یہ کہ علم کا تقاضا جس علمِ صحیح کا پہنچانا ہے اس میں اپنی نفسانی خواہشات کو داخل نہ کرے، بلکہ علمِ صحیح کو بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دے اور اس رُخ سے پہنچا دے کہ وہ اس چیز کو اسی طور پر صحیح رُخ سے لینے والے بن جائیں۔ میں نے کہا اشکالات کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ یا تو بات صحیح پہنچتی نہیں یا پہنچائی نہیں جاتی یا لینے والے صحیح رُخ سے نہیں لیتے۔ یہی تین چیزیں ہیں جو کہ سبب بنتی ہیں اشکالات کا اور شکوک کے پیدا ہونے کا۔

اب اس کے بعد اگلی جو بات آتی ہے وہ **متعلم** (شاگرد) کا حق ہے کہ جو

شخص اس سے بات کر رہا ہے اس کی ذہنی سطح کو جانے ۔ چھوٹے بچے کے لیے باپ جب اس سے بات کرتا ہے تو اس کی چھوٹی زبان میں توتلی باتیں کرتا ہے، اپنے لفظوں کو توڑ کر اس سے باتیں کرتا ہے ۔ اگرچہ باپ اتنا عالی دماغ ہے کہ اس کا دماغ عرش سے باتیں کر رہا ہے لیکن بچے کے لیے چھوٹا ہو جائے گا ۔ اسی طور پر حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ صحیح عالم وہ ہے یرد الناس بصغار العلوم قبل کبارھا او کما قال وہ اچھا معلم ہے جو لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق بڑے علوم سے پہلے چھوٹے علوم کی تعلیم دیتا ہے تاکہ بنیاد قائم ہو جائے ۔ بنیاد قائم کی جائے گی تو دیوار اٹھائی جائے گی تب چھت ڈالی جائے گی ۔ آپ پہلے ہی کہیں کہ چھت ڈالو پھر بنیاد اٹھاؤ تو یہ ناممکن بات ہے ۔ سطح علمی کو دیکھنا پڑے گا، ذہنی سطح کو دیکھنا پڑے گا، دیکھنا پڑے گا کہ یہ لوگ کس رخ سے بات کو لینے والے ہیں ۔ دین کا علم جیسے اونچا ہے اسی طور پر تلوار کی دھار ہے اس معنی میں کہ اگر آپ نے کسی کو غلط علم بتا دیا تو آپ گنہگار ہیں ۔ پھر دوسرے یہ کہ اگر آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اور استعدادوں کو علم کے صحیح پہنچانے کے لیے استعمال نہیں کیا، آپ جانتے ہیں کہ اگر میں اس رخ کو اختیار کروں تو یہ شخص اس بات کو سمجھ جائے گا اور آپ اپنی سہل انگاری کی بناء پر یا سستی کی بناء پر اس طریقے کو اختیار نہیں کرتے اور یوں سمجھتے ہیں ڈیوٹی ہے ڈیوٹی کو ادا کر دو، ڈیوٹی ادا کرنا دین میں نہیں ہوتا، اس میں تو جگر خوں ہوتا ہے یہاں تو بقول مولانا الیاسؒ کے دین جس کو پھیلانے کے لیے خونِ دیدہ اور سوزِ جگر سبب بنا کرتا تھا آج ہم اس کو پھیلانے کے لیے صرف لفظوں پر کفایت کر رہے ہیں ۔ دین کے علم کا چراغ سوزِ جگر سے اور آنکھوں کے آنسوؤں سے جلا کرتا ہے، یہ دین کا

چراغ ایسے ہی نہیں جلا کرتا۔ انسان خود کڑھتا ہے جلتا ہے، دیکھو! سب سے بڑے معلم الناس سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیات کو قرآن نے کئی جگہ نقل کیا ہے

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَ لَّایَکُوْنُوْ مُؤْمِنِیْنَ O (الشعراء:۳)

ترجمہ: شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ النَّفْسَکَ عَلٰی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (الکھف:٦)

ترجمہ: (اور آپ جو ان پر اتنا غم کھاتے ہیں) سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمونِ (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔

دوسرے مقام پر آتا ہے

وَاصْبِرْ وَمَاصَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَاتَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ (النحل۔١٢٧)

ترجمہ: اور آپؐ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے، اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہو جیئے۔

معلم سے سب سے بڑا علم کا تقاضا یہ ہے کہ اس علم کو صحیح راہ کے ساتھ صحیح رُخ کے ساتھ لوگوں کو پیش کر دے کہ اس علم صحیح کو وہ سنبھالنے والے بن جائیں۔ اور دینی علوم کے حامل جو ہیں ان کا صرف اتنا کام نہیں کہ وہ علم کو پہنچا دیں بلکہ ان کا کام یہ بھی ہے کہ اپنی استعداد کے بقدر اس علم کو عمل کے رُخ پر ڈلوا دیں۔ صحابہؓ کو آپ

دیکھئے کہ صحیح مسلم میں بھی آتا ہے صحیح بخاری میں بھی ہے دوسری صحاح کی روایتوں میں بھی ہے وہ ایک اور رخ اختیار کرتے تھے دیکھئے اسلام کے اندر میں مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک صحابی آتے ہیں مالکؓ بن نویر مسلم کی روایت ہے وہ اپنے ساتھیوں کو کہتے ہیں کہ میں تمھیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ بتانا چاہتا ہوں، آؤ میں تمھیں بتاتا ہوں، نیت باندھتے ہیں اور نماز پڑھ کر بتا دیتے ہیں۔ عملی رخ سے پیش کر کے دکھا دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تمھیں وضو کا طریقہ بتاتا ہوں۔ تو کیا کیا...... ایک پانی کا لوٹا منگوا لیا اور وضو کر کے بتا دیا کہ ایسے وضو کرتے ہیں۔ عملی مشق بھی بتائی کیونکہ علمِ دین صرف نظریات کا نام نہیں ہے۔ میں تو یوں کہوں دوستو! مثال ہے سمجھ لیں کہ وہ علوم الٰہیہ جنھیں ہم صرف عقیدے کے رخ سے جانتے ہیں وہ بھی کیفیات قلبیہ کو پیدا کرنے والے ہیں اور وہ بھی دل کے اعمال کو پیدا کرنے والے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں کہو کہ خدا رازق ہے اب اس رازق ہونے کا جو علم ہے اس کا دل سے کیا تعلق؟ کہ دل میں ایک کیفیت پیدا ہو جائے توکل الٰہی کی۔ ربّ مانتے ہیں تو اس کی ربوبیت کا یقین پیدا ہو جائے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں

ع خود قیامت شو قیامت رابیں

قیامت کو جاننے کے لیے قیامت کے احوال کو اپنے اوپر طاری کر لو۔ دیکھئے ایک ہوتی ہے علمی کیفیت جو کہ صرف نظری رُخ کی ہوتی ہے اور ایک علمی کیفیت ہے جو کہ حالی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ علم کو اپنا حال بنا لو تو علم تمہیں اپنا ثمرہ دے جائے گا۔ اور اگر آپ نے علم کو صرف قال کے مقام پر رکھا تو یہ آپ کو اپنے ثمرات سے

کما حقہ متمتع نہیں کرے گا۔اور جب آپ کے اندر حالی علم آئے گا تو بہت سارے اقوال کے پھندوں سے نکل کر آپ کی عملی زندگی کو بنا دے گا۔میں رات اپنی مسجد میں بیان کر رہا تھا، میں نے کہا دیکھو! ایک تو بات ہوتی ہے سنانے کی میں آپ کو کہوں روؤ روؤ روتے رہو، کیا اس کہنے سے رونا طاری ہو جائے گا؟ ہر گز نہیں۔ان کو لے جاؤ جہاں دس پندرہ عورتیں رو رہی ہوں کسی کا بچہ مر گیا اور وہ چیخیں مار کے رو رہی ہیں اگر بہت سخت دل بھی ہو گا پھر بھی ضرور اثر لے گا کیونکہ وہ عملی نمونہ پیش کر رہی ہیں، بیس آدمی ہنس رہے ہوں تو آپ بھی ہنسنا شروع کر دیں گے۔عملی زندگی کا اثر دیکھئے کیفیات قلبہ کا اثر، کیفیات قلبیہ سب علم کا نتیجہ ہوتی ہیں بغیر علم کے قلب میں کوئی بھی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، علم آئے گا تو تمہارے دل میں کیفیت پیدا کرے گا دل کی کیفیت تمہارے خارج پر اثر انداز ہو گی اور جو تمہارے دل سے بات نکلے گی وہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہو گی۔پچھلی دفعہ بھی میں نے غالباً عرض کیا تھا پھر بھی عرض کرتا ہوں کہ دیکھو! علم جب آئے تو اس کے حقوق ادا کرو، علم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ خود خدا کو پہچانو۔تم کتاب کو کیا جانو اگر کتاب والے کو نہیں جانتے۔امام احمد بن حنبلؒ کا ایک واقعہ آتا ہے ایک بزرگ گزرے ہیں حاتم اصمؒ جب وہ ان کے پاس آتے تو وہ کھڑے ہو جاتے۔حالانکہ احمد بن حنبلؒ وہ آدمی ہیں جنھوں نے مامون جیسے عظیم الشان اور جلیل الشان بادشاہ کے آگے گردن نہیں جھکائی۔بادشاہوں کے آگے نہیں جھکے، کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے، بڑے اونچے آدمی تھے۔لیکن وہ فقیر آدمی آتا تو کھڑے ہو جاتے، بہت بڑی ہستی تھے، امام وقت تھے۔کسی نے کہا کہ آپ اس کے لیے کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ جواب دیا کہ میں کتاب کو جانتا ہوں

اور یہ کتاب والے کو جانتا ہے۔کتاب والے کو کیسے جانا جاتا ہے؟علم کی حقیقت باطنیہ یا یوں کہئے کہ علم کا قلباً اور عملاً استعمال آپ کو معرفتِ حق سے روشناس کر دے گا۔علم کا تقاضا یہ ہے کہ جو عالم دین ہو وہ عارفِ الٰہی ہو۔ جب آپ کے اندر معرفت حق آئے گی ،خدا کو پہچان کر جب آپ خدا کی بات جس یقین سے کریں گے بے یقین وہ بات نہیں کرسکتا۔ میں یوں کہوں کہ معلم سے علم کا تقاضا ہے کہ جس علم کی دعوت دے رہا ہے اس پر خود اس کا اپنا یقین ہو۔اس کی حقانیت پر خود اس کا اپنا یقین نہیں تو وہ دوسرے کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس پر عمل کر لو، بات کہے گا تو کھوکھلی ہوگی۔اگر اس کا اپنا یقین پختہ ہوگا تو باطن میں قوت آئے گی۔دوستو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ علمِ الٰہی آتا ہے زندگیوں کو بدلنے کے لیے،آپ کی اور ہماری زندگی کو بدلنے کے لیے بھی اور جتنا معاشرہ ہے اس سب کی زندگی کو بدلنے کے لیے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ لوگوں کے ذہن کی سطح کے مطابق دین کی بات کیجئے لیکن دیکھو! ذہنوں کے مطابق کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ اُن کے لیے دین کو بدل دیجئے ۔شرابِ کہنہ ہو لیکن پیالے نئے ہوں ، یہ نہیں کہ پیالے تو پرانے ہوں اور شراب نئی آجائے ۔ میں نے ابھی ایک بات عرض کی تھی دیکھو! اگر ہم دین کو بدلتے ہیں ، دین کو غلط بیان کرتے ہیں،مسئلے کا بدلنا دین کا بدلنا ہے تو گویا ہم نبوت کے مقام پر فائز ہونے کا دعوی کرتے ہیں،وحی کا نزول فضول ہو جاتا ہے، بے فائدہ ہو جاتا ہے۔دین جو ہے وہ وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔خدا کی طرف سے دین آیا ہے، اب تو وحی آ ہی نہیں سکتی۔ خدا اگر خود کہے تو دین کو بدل سکتا ہے غیرِ خدا دین کو نہیں بدل سکتا۔جب غیر خدا دین کو نہیں بدل سکتا تو ہم دین کے کسی مسئلے کو کیسے بدل سکتے ہیں۔اگر عالم بھی جاہل کے پیچھے چلنا

شروع کر دے، اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بینائی اور نابینائی کی دی ہے، بینا بھی نابینا کے پیچھے چلنا شروع کر دے تو دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ تو نہیں کہ ہم نابینا کے پیچھے چلیں، آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب اپنے علم سے نوازا ہے تو اپنی شان نہ بڑھائیے علم کی عزت باقی رکھئے اور علم کی عزت جس علم کے آپ داعی ہیں جس علم کے آپ حامل ہیں اس کے حقوق کو ادا کر کے اس کی شان کو بڑھائیے۔ سورج مغرب سے نکل آئے میرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں غلطی نہیں ہوسکتی، جو کہا خدا سے لے کر حق کہا جیسے کہ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دہن سے غصہ کی حالت میں اور خوشی کی حالت میں حق کے سوا دوسرا کلمہ نہیں نکل سکتا۔

تو حاصل میری باتوں کا یہ ہوا کہ دیکھو! اسلام کے اندر نظریۂ علم یا علم کی اہمیت اسقدر ہے کہ ہم یوں کہیں کہ اگر علم کا سوتا خشک ہو جائے تو پورے دین پر زوال آجائے پورے دین کا باغ مرجھا جائے۔ علم ہوگا تو عمل ہوگا، عمل ہوگا تو زندگی بنے گی، زندگی بنے گی تو جنت بھی ملے گی اور دوزخ سے بھی بچاؤ ہوگا۔ اگر علم نہیں ہو گا تو نہ دنیا کی زندگی بنے گی اور نہ آخرت کی زندگی بنے گی۔ اس لیے ہم یوں کہیں کہ علمِ الٰہی کو تم اس رُخ سے لیکر چلو کہ تم اس کے جیسے عالم ہو اس کے عامل بھی بنو، حامل بھی بنو اور اس کے قاسم بھی بنو اس کے پہنچانے والے بھی بنو۔ اور اس کے پہنچانے میں حکمتِ نبوت کو اپنی آنکھوں سے دور نہ کرو، جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت کے ساتھ دین کی بات کو پہنچایا تم بھی پہنچاؤ اور اپنی زندگی کے رُخوں کو اپنے علم کے مطابق بناؤ۔

یہاں ایک بات عرض کر دوں آج عمومی طور پر بات کی جاتی ہے سائنس

وغیرہ کے علوم کے متعلق جہاں تک کہ ہمارے بزرگوں کا تعلق ہے، بزرگوں سے میری مُراد قرنِ اوّل سے لے کر اس وقت تک کے اہلِ حق ہیں، ان کا تعلق ہے وہ دُنیاوی علوم کے مخالف نہیں اور نہ سائنس کے علم کی مخالفت صحیح رُخ سے کی گئی ہے۔ یہ تو یورپ میں سائنس کے علوم کی مخالفت ہوئی اور چرچ کے الزام کو لاکر ہماری مسجد پر ڈال دیا گیا۔ الزام ان کا تھا، وہاں کے چرچ والوں نے سائنسی علوم کی مخالفت کی ہم نے یورپ کی کتابیں پڑھیں اور مذہب اسلام پر الزام لگا دیا کہ یہ سائنس کا مخالف ہے۔ دیکھو! سائنسی علوم کی ہم مخالفت نہیں کرتے، لیکن ہم یوں کہتے ہیں کہ مسلمان سائنسدان میں اور غیر مسلم سائنسدان میں اتنا فرق ہے کہ کافر سائنسدان جب دیکھتا ہے کسی علم کو یا کوئی ایجاد کرتا ہے یا کسی چیز کی حقیقت جانتا ہے، اب ایک غیر مسلم سائنٹسٹ جو ہوگا جب وہ ایک ذرّے کو چیرے گا تو وہ ذرّے کے آگے جھک جائے گا۔ پہلے لات ومنات کے آگے جھکتے تھے اب ذرّے کی طاقت کے آگے جھکتے ہیں، Atomic Power کے آگے جھک جائیں گے۔ Atomic Power چاہے وہ خیر کے رُخ سے استعمال کی جا رہی ہو یا شر کے رخ سے وہ ذرّے کو ذرّے میں دیکھیں گے۔ اور مؤمن سائنسدان ذرّے کی قوت کو ذرّے میں نہیں دیکھے گا، جب ذرّے کا دِل چیرا جائے گا اور اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ایک چلتا ہوا نظام دیکھے گا تو وہ یوں کہے گا

صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ (النمل:۸۸)

ترجمہ: یہ صنعت گری ہے اس باکمال کی جس نے ہر چیز کو کمال صنعت گری کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مؤمن سائنٹسٹ کی ہر سائنسی ایجاد، ہر چیز کا بنانا اس کی معرفت کو بڑھائے گا نہ کہ اس کی معرفت کو کم کرے گا۔ اس رخ سے ہم سائنس کی مخالفت نہیں کرتے، ہم اس سائنس کی مخالفت کرتے ہیں جو کہ خدا سے ہمیں دور کر دے۔ میں ایک مثال دے کر بات کو ختم کرتا ہوں، دیکھو! آپ آئینہ دیکھ رہے ہیں اور آئینہ اگر خوبصورت ہے اور آپ اسی کے حُسن میں مبتلاء ہو گئے، اپنے چہرے کو بھی بھول گئے تو دیکھنے والا کیا کہے گا۔ آئینہ دیکھ کر آئینے میں ہی اگر مشغول ہو جائیں تو یہ کتنی بیوقوفی ہو گی۔ سائنس جن چیزوں کو بتاتی ہے ان چیزوں کو دیکھ کر انہی میں لگ جائیں اور جو آئینے والا ہے اسے نہ دیکھا تو یہ بیوقوفی ہو گی۔ ہم کہتے ہیں سائنس کی تمام چیزوں کو اپناؤ اور لو لیکن حافظ کی طرح لو، جیسے حافظ نے کہا تھا ؎

ما در پیالہ عکس رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شراب دوام ما

میں پیالے میں، یعنی کائنات کے ہر ذرّے میں خدا کے عکس کو ڈھونڈتا ہوں، اس کی کاریگری کو دیکھتا ہوں، اس کی صفات کے ظہور کو دیکھتا ہوں، اے پگلے تجھے کیا پتہ کہ میں کس شراب میں مست ہوں، میں جو کائنات کو دیکھتا ہوں تو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا ہوں کہ یہ کائنات ہے، میں تو دیکھتا ہوں خالق کی صنعت گری کے رخ سے، اور کائنات کا ہر ذرّہ اللہ کی صنعت کا اور اس کی کبریائی کا نمونہ ہے اور وہ میری معرفت کو بڑھاتا ہے۔ ہم دنیاوی علوم کو اسلام کا حلقہ بگوش کریں گے۔ اسلام کا حلقہ بگوش کیسے کریں گے؟...... علوم دنیوی یعنی معاش کے علوم حاصل کیجئے لیکن ؎

ملیں گے تجھے راہ میں بتکدے بھی مگر اپنے اللہ کو یاد رکھنا

علوم معاش گمراہی کا ذریعہ نہ بننے پائیں، خدا ہر آن سامنے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن سامنے ہوں، حق سامنے ہو اور دوسری جو چیزیں ہیں یہ راہ کے مناظر ہیں ان راہ کے مناظر کو لے کر چلو لیکن خدا کو مَت بھولو، اس کے علم کو مت بھولو۔ علمِ تشریعی اونچا ہے علم تکوینی سے۔ علمِ تشریعی کے حاملوں سے علمِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی بساط بچھائیں۔ اس علم کا جو مقام ہے اسے وہ مقام دیں اور علمِ معاش کا جو مقام ہے اسے علم معاش کا مقام دیجئے اور علمِ معاد یعنی الٰہی علوم کا جو مقام ہے اسے اس کا مقام دیجئے۔ اور دنیا والے جتنے بھی ہیں سب محتاج ہیں علمِ الٰہی کے۔ چاہے ائرفورس والے ہیں، چاہے بَری فوج والے ہیں، چاہے تاجر ہوں چاہے حاکم ہو چاہے محکوم ہو دنیا کا کوئی طبقہ بھی جیسے میں نے مثال دی ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ایسے ہی علومِ الٰہیہ کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان سادہ دِلوں کو اور ان انجانوں کو پتہ نہیں کہ ہمیں کتنی ضرورت ہے اس ہوا کی۔ آکسیجن کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ آکسیجن بہت زیادہ ضروری ہے انھیں اس ہوا کی کتنی ضرورت ہے اس لیے آپ کا کام ہے پیار سے، محبت سے جیسے اَمّاں اپنے بچے کو سینے سے لگا کر دودھ پلاتی ہے، بچہ اس پر گندگی بھی کرتا ہے، پیشاب بھی کرتا ہے، کبھی غصے میں اَمّاں کے گال بھی نوچ لیتا ہے، سب کچھ سہتی ہے۔ معلم کی مثال اَمّاں کی ہے اور جو عالم نہیں وہ سب کے سب بچے ہیں، جو انجان ہے وہ بچہ ہے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا

ع نیست بالغ جز رہیدا ازھوا

ترجمہ: جو خواہش نفس کے چکر سے نہیں نکلا وہ بالغ نہیں۔

یہ تو ابھی بچے ہیں ان بچوں کے ساتھ بچوں جیسا معاملہ کرو، یہ اگر گندگی کر

دیں تو بھی انھیں سینے سے لگاؤ اور انھیں اپنے سینے کا دودھ پلاؤ۔ دیکھو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی مثال دودھ کی دی ہے۔ تو یہ علم کا دودھ جو تمہارے سینے کا دودھ ہے انھیں ایسے پلاؤ جیسے بچے کو اَمّاں دودھ پلایا کرتی ہے، جیسے ماں پیار سے پلاتی ہے، وہ گندگی کرتا ہے، پیشاب کرتا ہے تو پرواہ نہیں کرتی، گال نوچتا ہے تو پرواہ نہیں کرتی۔ اگر اللہ نہ کرے کہ ایسی نوعیت ہو لیکن اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کر بھی دے جو کہ آپ کو ناگوار ہو تو جیسے ماں گوارا کرتی ہے بچے کی گندگی تک کو اسی طور سے متعلمین کی ہر گندگی کو گوارا کیجئے اور ان کو صحیح اور پاک وصاف وہ دودھ دیجئے جو کہ ماں کے سینے سے نتھرا ہوا دودھ نکلتا ہے اور اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی، اسی طور پر خالص دین کا دودھ انھیں پلایئے انشاء اللہ تمہارے لیے بھی سرمایۂ آخرت ہوگا اور ان کی زندگی کے بننے کا بھی سبب ہوگا۔ سیدنا حضرت علیؓ کو نبیؐ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

فَوَاللّٰہِ لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ تَکُوْنَ لَکَ حُمُرُ النِّعَمَ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم)

ترجمہ: (اے علیؓ) خدا کی قسم اگر تیرے ذریعے سے ایک شخص بھی ھدایت پر آجائے تو وہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

یقین کیجئے کہ اگر ایک شخص بھی آپ کی وجہ سے صحیح راہ پر آ گیا تو سرخ اونٹوں سے زیادہ بہتر ہے، تمام دنیا کی دولت سے زیادہ بہتر ہے۔ اللہ ہمیں بھی عمل کی توفیق دے اور جو حق بات کہی گئی اس پر آپ کو بھی عمل کی توفیق دنصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اصلاحِ نفس

وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا (الاعراف:۱۴۶)

ترجمہ: ''اوراگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بناویں۔''

کافرلوگ جو گمراہ ہیں، جب بھلائی کی راہ کو دیکھتے ہیں تو بھلائی کی راہ پر نہیں آتے اور جب گمراہی کی راہ کو دیکھتے ہیں تو اس پر فوراً چل پڑتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے انسان کے اندر نفس ہے اور نفس کی فطرت یہ ہے۔

اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوۡٓءِ (یوسف:۵۳)

ترجمہ: ''نفس تو (ہر ایک کا) بُری ہی بات بتلاتا ہے۔''

نفس کی مثال سرکش گھوڑے کی طرح ہے جب تک اس کو سدھایا نہ جائے سوار کو پھینکنے کا اندیشہ ہے۔ اور اگر سدھالیا جائے تو اس سے بہتر جنت تک پہنچانے والی دوسری چیز نہیں۔ نفس کے گھوڑے پر سوار ہو کر انسان جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اگر یہ نفس مرکب (سواری) کی جگہ خود راکب (سوار) بن جائے اور سوار کے اُوپر سوار ہو جائے اور ہو بھی شوخ پھر سوار بھی سر پر ہو تو ایسی دولتی لگائے گا کہ سیدھا دوزخ میں پہنچائے گا۔ نفس کے ساتھ شیطان ہے۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ گھر کے بھیدی (نفس) کو اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ شیطان ہم سے زبردستی کوئی کام نہیں کرا سکتا اور نہ ہم کو کسی کام کے کرنے کیلئے مجبور کر سکتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نفس کو اپنے ساتھ ملالے۔ شیطان انسان کو پھسلانے کے لئے نفس کے دروازے سے آئے

گا۔ اگر نفس نہ مانے تو شیطان کی کوئی طاقت نہیں کہ ہم سے گناہ کرالے۔ قرآن میں آتا ہے:

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ○ (النساء:۷۶)

ترجمہ: ''کہ شیطان کا مکروفریب بہت کمزور ہے۔''

شیطان انسان کے نفس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ نفس میں لذّات کی طلب ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ (ال عمران:۱۴)

ترجمہ: ''خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمال کی چیزیں ہیں دُنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

یوں کہو کہ دُنیا و مافیھا میں انسان کے لئے لذّات کا سامان رکھا گیا ہے جس کو دیکھ کر نفس کی رال ٹپکتی ہے۔ اور نفس جب لذّاتِ دُنیا کو دیکھتا ہے تو شیطان نفس کو اپنے ساتھ ملاتا ہے۔ شیطان ہمیشہ نفس کے سامنے اس کی چاہت والی چیز کو لاتا ہے اور نفس تو پہلے سے تیار بیٹھا رہتا ہے، جس طرح کسی کو کہا جائے کہ محبوب سے پیار کرو، تو وہ تو پہلے سے تیار بیٹھا ہوتا ہے، شیطان کی انگیخت سے فوراً تیار ہو جاتا ہے۔

شیطان پہلے چھوٹے گُناہ کا وسوسہ ڈالے گا اور رفتہ رفتہ بڑے بڑے گناہوں پر ڈالے گا۔ جس رُخ کا آدمی ہوگا شیطان اس کے نفس میں اس رُخ کی بات ڈالے گا۔ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے اور صوفی کا شیطان بھی صوفی ہوتا ہے۔ بعض کو نیکی کی راہ سے مارے گا، کبھی نا اُمیدی کی راہ سے مارے گا۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور غفوری شان کو سامنے لا کر گُناہ کرائے گا۔ شیطان ہر شخص کو اس کی چاہتوں اور مرغُوبات کی راہ سے بہکاتا ہے۔ وہ نفس کی راہ سے مارنا چاہتا ہے۔ نفس کی راہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بھی نفس کو مارنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ نفس کو چند قیود و حدُود کا پابند کیا ہے۔ قرآن نے احکامِ الٰہیہ کو حدُود اللہ کہا ہے اور حدُود کے اندر پھلانگنے کی اجازت دی ہے۔ حدُود سے باہر پھلانگنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ جبکہ نفس و شیطان چاہتوں کی لذّتوں کو سامنے لا کر تم کو اندھا کر دیتا ہے تاکہ تم حدُود کو نہ دیکھ سکو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں نفس کی رعایت ہے، نفس کُشی نہیں بلکہ نفس کُشی ہے۔ نفس کو اس بات سے منع نہیں کیا کہ کھاؤ پیو نہیں اور اپنی جائز ضروریات کو پورا نہ کرو بلکہ ان ساری ضروریات اور حاجات کو حدُود الٰہیہ کے اندر پورا کرو تاکہ نفس ہلاکت کے رُخ پر نہ آئے۔

شیطان ہمارا دُشمن ہے، ہمارے لیے کبھی خیر نہیں چاہتا۔ علامہ مسعودیؒ نے لکھا ہے کہ ایک رات سیدنا امیر معاویہؓ اپنے مکان کے اندر سوئے ہوئے تھے۔ پچھلی رات میں کسی نے پاؤں کو ہلایا۔ اُنہوں نے جھٹ ہاتھ کو پکڑ لیا اور پوچھا کہ کون ہو؟ اس نے کہا کہ وقت بہت کم رہ گیا تھا اور آپ کی تہجد قضا ہو رہی تھی۔ کہا کہ بتاؤ تو تم ہو کون؟ اس نے کہا کہ میں اِبلیس ہوں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے کہا کہ

اِبلیس اور تہجد کے لئے اُٹھائے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ تمہارا کام تو گمراہ کرنا ہے۔ کہا کہ آپ امیرالمؤمنین ہیں آپ کی تہجد قضا نہ ہو جائے۔ آپؓ نے کہا کہ ٹھیک بات کہو میں اِدھر اُدھر کی بات نہیں مانتا۔ جب اس کو تنگ کیا تو اِبلیس نے کہا کہ کل رات آپ کی تہجد قضا ہوگئی تھی آپ اس پر اِتنا روئے تھے کہ تہجد کے پڑھنے سے زیادہ ثواب مل گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس رات بھی قضا ہوگئی تو پھر آپ گریہ وزاری کریں گے اور پھر آپ کو تہجد کے پڑھنے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ تو دُشمن کبھی صحیح راہ پر نہیں ڈالے گا اگر نیکی کی راہ پر ڈالے گا تو اس میں بھی دھوکہ ہوگا۔

ع ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اللہ کے احکام انسان کے نفس کی انتہائی چاہتوں کی حد ہیں۔ کہ اگر انسان نفس کو ترقی دینے کیلئے کچھ کرنا چاہے تو اللہ کی حدُود کے اندر کودتا رہے۔ نفس کے تقاضے آپ کو بُرائی پر ڈالنا چاہتے ہیں اور ساتھ شیطان مل گیا، تو بُرائی ہوگئی؟ وساوس شیطان کے تیر ہیں جن سے وہ انسان کو شکار کرتا ہے۔ اور اگر تم نے شیطان کے وسوسوں کی طرف التفات نہیں کیا اور یہ خیال کیا کہ کُتا ہے بھونکنے دو تو پھر کوئی ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔ اور اگر وسوسوں کی طرف التفات کیا اور ان کو آگے بڑھاتے رہے تو پھر پریشانی ہوگی اور گُناہ میں بھی مُبتلا ہونے کا خدشہ ہے۔ کسی بزرگ نے شیطان سے پوچھا کہ تم بڑے ظالم ہو قتل تک کروا دیتے ہو۔ شیطان نے کہا کہ میں تو صرف ایک انگلی لگاتا ہوں باقی سب کچھ انسان خود کرتا ہے۔ اور کہا کہ چل میرے ساتھ کہ تم کو دکھاؤں۔ ایک حلوائی کی دُکان پر گئے، وہاں شِیرے میں اُنگلی ڈبو کر دیوار پر شیرہ لگا دیا۔ اس شیرہ پر ایک مکھی آ بیٹھی۔ مکھی پر ایک چھپکلی نے

حملہ کر دیا اور چھپکلی پر بلی نے حملہ کیا۔ پاس خریدار کھڑا تھا، اس کے پاس ایک کُتا تھا اس نے بلی پر حملہ کیا جس سے حلوائی کی مٹھائی کے تمام تھال گر گئے۔ حلوائی اور خریدار کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور نوبت قتل و قتال تک پہنچ گئی۔ شیطان کا وسوسہ بھی شیطان کی آنت ہے۔ شیطان بواسطہ نفس انسان کو مارتا ہے۔ شریعت نفس کو مارنے کی اجازت نہیں دیتی بلکہ نفس کو حدود الٰہیہ کے اندر قابو رکھنے کا حکم دیتی ہے۔ اگر کسی نے کوئی شوخ گھوڑا پال رکھا ہو تو یوں نہیں ہوتا کہ اس گھوڑے کو اس کی شوخی کی وجہ سے ہلاک کر دے بلکہ اس کے چارے اور پانی کا انتظام کرے گا۔ ہاں اس کو سدھائے گا اور اگر شوخی کرے گا تو اس کو چابک لگائے گا۔ اسی طرح نفس کے شوخ گھوڑے کے سدھانے کے قوانین کا نام شریعت ہے۔ نفس کے گھوڑے کو حدُود کے اندر جائز طور پر خوب کھلاؤ اور پلاؤ لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ مستی کرنے لگے اور بے قابو ہو جائے اور آپ کو پٹک کر پھینک دے، اور اتنا کم بھی نہ ہو کہ اتنا کمزور ہو جائے کہ خود بھی نہ اُٹھ سکے۔ حدُودِ الٰہی قرآن اور حدیث کے اندر موجود ہیں۔ نفس کب بنے گا؟ ...... جب اس کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے ماننے کا پابند کیا جائیگا۔ شروع میں نفس کی چاہت لذّت کی طرف ہوتی ہے اور لذّت کو چھوڑنے پر انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔ نفس کی مثال دودھ پیتے بچہ کی طرح ہے اگر ماں بچے کا دودھ نہ چُھڑائے تو وہ پیتا رہے گا۔ امام بوصیریؒ نے قصیدۂ بُردہ میں لکھا ہے کہ نفس کی مثال دودھ پیتے بچہ کی طرح ہے اور دودھ چُھڑانے کیلئے ماں کو کڑواہٹ لگانی پڑتی ہے اور بچہ پھر کڑواہٹ کی وجہ سے دودھ چھوڑ دیتا ہے۔ نفس کی چاہت کو چھوڑنے کیلئے کچھ کڑواہٹ برداشت کرنی پڑے گی اور نفس کو بتکلف احکامِ الٰہی پر ڈالنا پڑے

گا، جبراً مسلم بنانا پڑے گا۔ جیسے بچہ کو انجکشن لگائیں اور وہ روتا اور چیختا ہے اسی طرح نفس کو احکامِ الٰہی کا انجکشن لگانا پڑے گا۔ احکام کیلئے نفس کو چیرنا پڑے گا کہ نفس کے اندر احکام کا نشتر جاسکے۔ شروع شروع میں دِقت ہوگی لیکن جب اس تکلیف کو برداشت کرلوگے تو نفس میں قوت آئے گی۔

مولانا رومؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ قزوین میں ایک آدمی گیدڑ مارکہ شیر رہتا تھا۔ وہ ایک گودنے والے کے پاس گیا کہ میری پیٹھ پر شیر کی تصویر بنادو۔ اس گیدڑ مارکہ شیر نے قمیص اُٹھائی، جب گودنے والے نے سوئی چبھوئی تو پوچھا کہ کیا بناتے ہو؟ ...... اس نے کہا کہ شیر کا کان بنارہا ہوں۔ اس نے کہا کہ بغیر کان کے بھی شیر ہوتا ہے۔ جب دوبارہ سوئی چبھوئی تو پوچھا کہ اب کیا بناتے ہو؟ تو کہا کہ دُم ۔......تو کہنے لگا کہ بغیر دُم کے بھی تو شیر ہوتا ہے۔ پھر جب اس نے سوئی چبھوئی تو پوچھا کہ اب کیا بناتے ہو؟ اس نے کہا کہ پیٹ ......تو کہا کہ بغیر پیٹ کے شیر بناؤ۔ گودنے والے نے کہا کہ ایسا شیر جس کا پیٹ نہ ہو، وہ تو خدا نے بھی نہیں بنایا۔ تو نفس بھی تب راہ راست پر آئے گا جب وہ چبھن کو برداشت کرے، اور پھر احکام کی حلاوت نصیب ہوگی پھر مزہ آئے گا۔

نفس نے انگڑائی لی اور ہوش میں آیا تو نفس امارہ سے نفس لوّامہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سدھ جائے گا اور پھر احکامِ الٰہی کے ماننے میں آسانی ہوگی۔ اب جب شیطان آئے گا تو اس کو دولتی مارے گا۔ پھر نفس اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرار پکڑے گا اور رفتہ رفتہ یہ نفس مطئمنہ ہوجائے گا۔ نفس انسان کے اندر اس حرکتِ طبعی کا نام ہے جس کے نتیجہ کے طور پر انسان کسی عمل کا اِرادہ کرتا ہے۔

ہر پریشانی کا علاج

دل کیوں پریشان ہوتا ہے؟

غالب نے کہا ہے کہ ؎

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

دل کی پریشانی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ دل کا چین جس ذات سے وابستہ ہے وہ ذات دل کے اندر نہیں ہوتی، اس کی یاد نہیں ہوتی، اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات دل میں رَچ بس جائے اور اللہ کی ذات پر توکل ہو جائے تو پریشانی نہیں ہوتی۔ انسان کو دُنیا میں اس وجہ سے پریشانی ہوتی ہے کہ جن چیزوں کو وہ پسند کرتا ہے وہ چیزیں ملتی نہیں، یا ان کے ملنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ یا وہ چیزیں چھن جاتی ہیں تو انسان کا دل بے قرار ہو جاتا ہے کہ ہائے ایسا کیوں ہو گیا۔ اگر دیکھا جائے تو چیزوں کے چلے جانے یا نہ ملنے پر جو پریشانی ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ہم ان چیزوں میں اپنی کامیابی اور اپنا قرار و چین سمجھتے ہیں۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ چیزوں میں چین و قرار نہیں تو پریشانی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس کا دُنیا میں بھی اکثر تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (سورۃ البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: ”بہت دفعہ ایک چیز کو تم پسند کرتے ہو حالانکہ اس میں تمہارے لئے شر ہوتا ہے۔“

عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (سورۃ البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: ''بہت دفعہ ایک چیز کو تم ناپسند کرتے ہو لیکن اس میں تمہارے لئے خیر ہوتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ آپ کے مستقبل کو خوب جانتے ہیں کہ کن کن چیزوں سے تم کو فائدہ ملے گا اور کن کن چیزوں سے نقصان پہنچے گا۔ تم اپنی لاعلمی کو اللہ تعالیٰ کے علم پر قربان کردو اور یوں سمجھو کہ ہمارا اللہ حالات کا بگاڑنے اور بنانے والا ہے، وہ ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے، وہ ہمارے فائدے اور بھلے کو ہمارے نفسوں اور جانوں سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس نے اگر کسی چیز کو ہم سے چھین لیا یا روک لیا یا نہیں دیا تو چونکہ وہ مہربان ہے ہمارے مستقبل کو خوب جانتا ہے، تو اس نے ہمارے فائدے کے لئے وہ چیز ہم سے روک دی۔ (Younger Pit) برطانیہ کے بڑے وزیروں میں سے ایک تھا، اس کا باپ بھی وزیراعظم تھا۔ (آئی سی ایس) کے امتحان میں فیل ہوگیا۔ اگر وہ فیل نہ ہوتا تو (Younger Pit) نہ بنتا۔ اگر محمد علی جوہر (آئی سی ایس) کے امتحان میں فیل نہ ہوتے تو وہ ہندوستان کی ناموس اور ناک نہ بنتے۔ قائداعظم محمد علی جناح اگر جج بن جاتے تو قائداعظم نہ بنتے۔ بعض اوقات ایک چیز چھن جاتی ہے اور اس کے بدلے دوسری بہتر چیز عطاء کی جاتی ہے۔

اگر میں (مولانا صاحبؒ خود) اپنے رُخ سے چلتا۔ تو اس وقت زیادہ سے زیادہ (Chief Engineer) ہوتا۔ والد صاحب کا خیال مجھ سے انجینئرنگ کرانے کا تھا اور معلوم نہیں کہ اب تک کتنی حرام کی کوٹھیاں بنا چکا ہوتا۔ اُس سے پہلے والد صاحب کی وفات ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اس میں

اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ چیزوں کا آنا جانا، حالات کا اپنی طبیعت کے مطابق نہ ہونا وغیرہ ناکامی کا سبب نہیں۔ بقول اقبال ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لئے

سپرنگ کو جتنا دباؤ گے وہ اُتنا ہی اُبھرے گا۔ بعض اوقات انسان کو اُبھارنے کے لئے دباتے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ صبر وثبات اور رضائے الٰہی کو اپنا مقصد بنائے اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں خیر وشر کو جانے کہ وہ جو بھی معاملہ میرے ساتھ کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں اور اس میں میری بھلائی اور فائدہ ہے۔ حدیث پاک میں سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اور دُعاء کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارمانوں کا نام ہے۔ دُعا فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَسْئَلُکَ نَفْسًا بِکَ مُطْمَئِنَّۃً تُؤْمِنُ بِلِقَآئِکَ وَ تَرْضٰی بِقَضَآئِکَ وَتَقْنَعُ بِعَطَآئِکَ O (مناجاتِ مقبول)

ترجمہ: ''اے اللہ! میں تجھ سے اطمینان والا نفس چاہتا ہوں جو تیری مُلاقات کا یقین رکھتا ہو اور تیری قضا پر راضی ہو اور تیری عطاء پر قانع ہو''

اس دُعاء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طمانیت نفس وقلب کا پورے کا پورا طریقہ بتا دیا۔ پہلی بات جو اللہ تعالیٰ سے مانگی ہے کہ اے اللہ! تُجھ سے ایسا نفس چاہتا ہوں جو تیری ذات سے طمانیت کو حاصل کرے۔ اس سے ایک بات معلوم ہوئی کہ منبع طمانیت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جب طمانیت اللہ کی ذات سے آتی ہے تو اُن ذرائع کو اختیار کرنا پڑے گا جن ذرائع پر اللہ تعالیٰ طمانیت مرحمت فرماتے ہیں۔ ان

ذرائع میں پہلی بات جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اور تعلق بھی آنی جانی نہ ہو بلکہ ایسا مستقل تعلق ہو جو ہمارے اور اللہ کے تعلق کو پیوست کر دے۔ اللہ سے دوستی اور رابطہ وملاپ ریل کے مسافر جیسا نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات جیسے ہمارے وجود کا سبب ہے اسی طور پر اللہ تعالیٰ اس دُنیا میں ہماری بقاء کا سبب ہیں اور مرنے کے بعد ہماری انتہا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یقین کامل ہو کہ آج نہیں تو کل اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے۔ تو جب اللہ سے ملنا ہے، اگر اس ملنے کا یقین کم ہو گیا اور اس نے ہمارے ساتھ جو برتاؤ کیا اس سے قلب میں گرانی آئے تو کل اللہ کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ کسی کو اپنے محبوب کے ملنے کا یقین ہو اور محبوب گالیاں بھی خط میں لکھے تو اس کی گالیاں بھی میٹھی ہونگی۔ بقول غالب!

''گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا''

کسی دوست سے اگر ظاہراً تکلیف پہنچے اور وہ سچا دوست ہو تو انسان اس سے خفا نہیں ہوتا۔ تو جب خدا سے ملنا ہے اور اس کے رُوبرُو ہونا ہے تو خدا کو کل کیا منہ دکھائیں گے کہ اے اللہ! تو نے کل ایسا بوجھ ڈالا تھا، منہ سے اگر نہ بھی کہا دل میں گرانی آئی، گلے شکوے کرنے لگے کہ اے اللہ! تو نے ایسا کیا اور ویسا کیا۔ بلکہ دل کی حالت یہ ہو کہ بس جو بھی کیا اچھا کیا۔ بقول کسی کے:

زندہ کنی عطائے تو، وربکشی رضائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی فدائے تو

ترجمہ: اگر زندہ کریں تو آپ کی عطاء، مارڈالیں تو آپ کی رضا

دل ہوا آپ کا مبتلا (عاشق)، جو کریں آپ پہ فدا (قربان)

بعض اوقات اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ حالات بے واسطہ نہیں کرتے بلکہ کسی واسطہ کے ذریعہ سے کرتے ہیں تاکہ ایمان سلب نہ ہو جائے۔ اب شکایت اور گلہ کس سے؟ جب یہ یقین ہو کہ اللہ سب کچھ کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جیسے ہماری ذاتوں کے خالق ہیں اسی طرح وہ ہم پر جو حالات لاتے ہیں ان کے بھی خالق ہیں۔

یار دمے که بر سرت تیغ زند دم مزن

سر نثارِ یار کن هیچ نه خون بها طلب

ترجمہ: ''جس وقت یار سر پر تلوار مارے تو دم نہ مارو، سر کو قربان کرو اور خون بہا بھی نہ مانگو''

سر بہ وقت جان سپردن اس کے زیر پائے ہے

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

''خوشی کا مقام ہے کہ موت کے وقت میرا سر ان کے پاؤں کے نیچے ہے یعنی جیسے کسی جانور وغیرہ کو ذبح کرتے ہیں تو اُس کے سر پر پاؤں رکھتے ہیں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰۰ اُنٹوں کی قربانی دی تھی، ۶۳ اُونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک بھی ۶۳ سال تھی۔ ہر اُونٹ خود آگے بڑھتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری گردن پر پہلے چُھری پھیر دیں۔

همه آهوان صحرا سر خود نهاده برکف

به اُمید آن که روزے به شکار خواهی آمد

''یعنی جتنی جنگل کی ہرنیاں ہیں انہوں نے اپنی گردنیں اپنے ہاتھوں میں رکھی ہیں کہ

جب تُو شکار کے لئے آئے گا تو ہمارا شکار کرے گا۔"

اور کسی نے کہا ہے کہ:

نه شود نصیب دشمن که شود ہلاك تیغت

سر دوستان سلامت که تو خنجر آزمائی

"یعنی دُشمنوں کو تیری تیغ سے ہلاکت نصیب نہ ہو، دوستوں کا سر تیرے خنجر آزمائی کے لئے سلامت رہے۔"

حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ جو حضرت معین الدین اجمیریؒ کے شیخ تھے۔ان کا شعر ہے۔

بہر قتلم چوں کشد تیغ نہم سر به سجود

او به نازے عجبے ، من به نیازے عجبے

"جب وہ میرے قتل کے لئے تلوار کھینچتا ہے تو میں سر کو سجدہ میں رکھ دیتا ہوں، وہ تو عجیب ناز کر رہا ہے اور ہم عجیب نیاز کر رہے ہیں۔"

عرض یہ کر رہا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حالات کے بننے اور بگڑنے کا یقین ہو جائے اور ساتھ یہ بھی یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ مہربان بھی ہے، حنّان اور منّان بھی ہے۔ ایک مہربان اور مشفق ڈاکٹر سے زیادہ خیر خواہ اور خیر کا پہنچانے والا ہے۔تو جب ڈاکٹر کی سوئی کے چبھونے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہو کہ اس سے شفاء ہوگی، صرف وقتی تکلیف ہے۔اسی طرح اگر حالات کسی وقت ناسازگار ہو جائیں تو ہمیشہ کے لئے نہیں ہونگے، اُس کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیئے۔ آج کی ناسازگاری کل کی سازگاری کے لئے ہے۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ط ○ (الم نشرح: ۵،۶)

ترجمہ: ''سو بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔ بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔''

ایک تنگی کے ساتھ دو فراخیوں کا وعدہ ہے۔ اللہ سے اطمینان کے حاصل کرنے کے لئے پہلی بات لقائے ربّ (اللہ تعالیٰ کی ملاقات) کا یقین ہے۔ وہاں گِلے کریں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہم تو تمہارے درجات کی بلندی کے لئے ایسا کرتے تھے۔ ہمارے ہو کر تم ایسا ویسا کرتے اور گڑ بڑ کرتے تھے۔ ہم تو اگر ساری دُنیا دیدیتے تو ہماری بادشاہی میں کوئی کمی نہ آتی مگر تمہارے فائدے کیلئے نہیں دی۔ جیسے غبارہ زیادہ پھونک سے پھٹ جاتا ہے ایسے ہی ہمارے دل کا غبارہ کہیں زیادہ مال کے مل جانے سے پھٹ نہ جاتا۔ یعنی تکبر، نخوت، غرور اور بغاوت پیدا ہو جاتی۔

من غمِ تو میخورم تو غم مخور
من بہ تو مشفق ترم از صد پدر

ترجمہ: ''میں تیرا غم خوار ہوں تو غم نہ کر، سو باپوں سے بڑھ کر میں تجھ پر مہربان ہوں۔''

تو پہلی بات اطمینان کے حصول کے لئے ایمانِ لقائے رحمٰن ہے۔ اور یہ ایمان کا خاصہ ہے کہ انسان قضائے رحمٰن پر راضی رہے۔ ایک جج ہے کہ وہ انصاف کرنے والا ہے، وہ رشوت بھی نہیں لیتا اور تمھارا دوست بھی ہے تو تم کو یقین ہوگا کہ وہ جو فیصلہ کرے گا اس میں ہماری خیر ہوگی۔ گو بظاہر نقصان معلوم ہوتا ہو لیکن عقلی طور پر آپ اس کے فیصلہ پر راضی ہونگے۔ تو جو لوگ خدا کے تعلق پر یقین رکھتے ہیں تو وہ خدا کے فیصلوں اور معاملوں پر خوش ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ جیلیؒ نے فرمایا ہے کہ میں

آپ کو وہ چیز نہ بتاؤں جس سے دُنیا میں بھی جنت کا مزہ آ جائے۔ فرمایا کہ! اللہ کے فیصلوں پر دل سے راضی ہو جاؤ اور اپنی تجویز اور رائے کو مٹا دو۔ جو ربّ فیصلہ کرتا ہے اس کو اپنا فیصلہ بنالو۔ رضا بالقضا جس کا حال بن گیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ بہلول دانا ریت کے ذرّوں کے ساتھ کھیل رہا تھا ہارون الرشید بادشاہ کا گزر ہوا۔ اُس نے پوچھا کہ پگلے کیا کر رہے ہو؟ اور تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو جس کے اِشاروں پر دُنیا ناچتی ہے۔ ہارون نے کہا کہ ہوش کرو کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کہا۔

چوں رضائے من رضائے حق شود۔

''جب میری اپنی کوئی چاہت نہیں۔ جب میں نے اپنی چاہت کو ربّ کی چاہت میں فناء کر دیا؟ تو جو ربّ چاہتا ہے وہی میں چاہتا ہوں۔''

بقول مجذوبؒ ۔

کیا سے کیا تو نے مجھے اے شوق فراواں کر دیا
پہلے جان پھر جانِ جان پھر جانِ جاناں کر دیا

مثال کے طور پر میں شہر سے سائیکل پر آ رہا ہوں۔ شہر سے ایک بس بھی یونیورسٹی کی طرف آ رہی ہے میں نے بس کو پکڑ لیا۔ تو میری سائیکل بھی (Bus Speed) پر آ رہی ہو گی اور اگر میں بس سے مخالف سمت میں چلنے لگا تو دھڑام سے گر جاؤں گا۔ یہ یقین کر و کہ چلے گی صرف ایک خدا کی، تو اللہ کی چلتی کے ساتھ اپنی چلانی شروع کر لو تو دل میں چین اور سکون پیدا ہو گا۔ یہ نہیں کہ دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر، بادشاہی اسی کی ہے جب اللہ تعالیٰ سے بگاڑ کر چلیں گے تو کیا ہو گا؟ لوگ

تو کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو زمانے اور حالات کے مطابق ڈھال لو۔ جب اس کے فیصلہ پر راضی ہونگے تو سب کلفتیں ختم ہو جائینگی۔ جب وہ سمجھیں گے کہ اپنا ہے تو پھر سب تکلیفوں اور کلفتوں کو دور کر دیں گے۔

وَ تَقْنَعُ بِعَطَآئِکَ

ترجمہ: ''اس کی عطاء پر قانع ہو جاؤ۔''

جب اللہ کی عطاء پر مطمئن ہو جاؤ گے اور اس کو خیر سمجھو گے کہ عین خیر اسی میں ہے کہ جو اللہ میرے ساتھ کرتا ہے وہ خیر ہی خیر ہے۔ دو حالتوں میں سے ایک حالت دُنیا میں آیا کرتی ہے یا ''غمِ عشق یا غمِ روزگار''۔ عشق سے وہ عشق مُراد نہیں جو شیخ چلی نے اَمّاں سے پوچھا تھا کہ اماں لوگ عشق عشق کہتے ہیں۔ یہ عشق کیا بلا ہے؟ ماں نے کہا کہ کسی کو آنکھ مار کسی کو کنکر مار۔ بس اس نے پتھر لیا ہمسایہ کی لڑکی پلنگ پر لیٹی تھی اُوپر سے پتھر مارا اور وہ ختم ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا کیا؟ تو کہا کہ عشق کیا۔ عشق سے مُراد عشقِ الٰہی ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ:

عشق بامردہ نہ باشد پائیدار

عشق را باحئی باقیوم دار

''مردہ کا عشق پائیدار نہیں ہوتا۔ عشق حیّ و قیوم (اللہ) کے ساتھ کرو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل لگاؤ تو وہی غم میٹھا ہو جائے گا۔''

ایک اور شاعر کہتا ہے:

اقبال محبت کی راہیں، اور ان کی منازل، اُف توبہ

یہ سب کچھ سہہ کر جی بھی گئے اس دل کا کلیجہ کیا کہئے

آن حرف نشاط آور می گویم ومی رقصم

از عشق دل آساید با این ہمہ بے تابی

ترجمہ: ”وہ خوشی کا جملہ بولیں جسے میں کہوں اور ناچنے لگوں۔ عشق سے اس ساری بے چینی کے باوجود دِل کو آسائش ملتی ہے۔“

حضرت تھانویؒ نے اس کی مثال دہلی کے مرچوں والے کبابوں سے دی ہے کہ آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں اور مزے لے لے کر کھا بھی رہے ہیں۔

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی

آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے یہ دل لگی نہیں

جیسے آپریشن میں کلوروفارم دیتے ہیں تو درد کا پتہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی عشقِ الٰہی کا کلوروفارم سونگھو تو غم اور حزن کا پتہ نہیں چلے گا۔ مُجھ جیسے کمزور آدمی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو عمل بتائے ہیں کہ نماز کے بعد ہاتھ اُٹھاؤ اور دُعا مانگو۔

بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ط اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنِّی الْھَمَّ وَالْحُزْنَ۔ (حصن حصین)

ترجمہ: ”اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جس کے سوا اور کوئی لائقِ عبادت نہیں، وہ بڑا مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ! تُو ہر غم اور ہر پریشانی کو مجھ سے دُور فرما دے“

اور دوسری چیز .... لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ہے۔

ترجمہ: ”(کسی بھی کام کی) طاقت وقوت اللہ بزرگ وبرتر (کی مدد) کے (بغیر)

میسّر نہیں ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ ۹۹ بیماریوں کا علاج ہے جس میں ادنیٰ غم و حزن و ہَم ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

